ظہورِ اسلام

اسلام کا ایک علمی اور تاریخی مطالعہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آغازِ کلام

ستمبر 1963 کی 21 تاریخ تھی۔ راقم الحروف ندوہ (لکھنؤ) کی مسجد میں تھا اور ظہر کی سنتیں پڑھ کر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن میں یہ خیال گھوم رہا تھا کہ اسلام کے تعارف کے لیے آج ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو وقت کی زبان اور اسلوب میں لکھی گئی ہو اور جدید انسان کو مطالعہ کے لیے دی جا سکے۔ ''کاش اللہ تعالیٰ مجھے اس کتاب کے لکھنے کی توفیق دے'' یہ تمنا بے ساختہ دعا کی شکل میں میری زبان سے نکلی اور اس کے بعد یکایک یہ انگریزی لفظ میری زبان پر تھا:

GOD ARISES

یہ گویا کتاب کا نام تھا جو اچانک میرے ذہن میں وارد ہوا۔ اس سے پہلے کبھی یہ فقرہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ کتاب کے نام کی حیثیت سے اس کی معنویت بھی اس وقت پوری طرح مجھ پر واضح نہ تھی۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد حسب معمول نریندر دیو لائبریری گیا جو ندوہ کے قریب دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ وہاں ویبسٹر کی لغت میں لفظ Arises کے استعمالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ بائبل کی ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ پورا فقرہ یہ ہے:

Let God arise, let His enemies be scattered, Let them also that hate Him flee before Him. As smoke is driven away,so drive them away; As wax melteth before the fire, so let the Wicked perish at the presence of God.

Psalms 68:1.2

خدا اٹھے، اس کے دشمن تتر بتر ہوں۔ وہ جو اس کا کینہ رکھتے ہیں، اس کے حضور سے

بھاگیں۔جس طرح دھواں پراگندہ ہوتا ہے،اسی طرح توانھیں پراگندہ کر۔جس طرح موم آگ پر پگھلتا ہے،شریر خدا کے حضور فنا ہوں۔

زبور کی یہ دعا حقیقۃً پیغمبر اسلام کی آمد کی پیشین گوئی ہے۔یہ اسی منصوبۂ الٰہی کا ذکر ہے جو قرآن میں سورہ صف (8۔9) اور سورہ فتح (28) میں وارد ہوا ہے۔آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جس عظیم الشان سطح پر اپنے دین کا اظہار کرنے والا تھا، اسرائیلی پیغمبر (داؤدؑ) کی زبان سے بہ شکل دعا اس کو کہلایا گیا جو نبی آخر الزماں سے ڈیڑھ ہزار برس قبل پیدا ہوئے تھے۔

اس طرح گویا اذان اور اقامت کے درمیان مسجد کے اس تجربہ میں مجھ کو کتاب کا نام اور اس کا موضوع دونوں بتا دیا گیا۔

عمر کی چھٹی دہائی میں پہنچنے کے بعد میری بہترین تمنا یہ تھی کہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک کتاب تیار کرسکوں جو اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں God Arises کے نام سے شائع ہو۔مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام 'اپنی تکمیلی شکل میں' شاید کسی اور سے لیا جانے والا ہے، کیوں کہ اس کی باقاعدہ تیاری کے لیے جو مواقع درکار ہیں، وہ موجودہ حالات میں مجھے حاصل نہیں۔زیر نظر مجموعہ میں چند مطالعہ اس امید میں پیش کیا جارہا ہے کہ کسی آنے والے کے لیے شاید وہ نقش اول کا کام دے سکے۔

باب اوّل

تین انقلابات

فلکی طبعیات کے مطابق ایک عظیم دھماکہ (Big Bang) نے عالمی طبعی کو اس کی مقررہ شاہراہ پر ڈالا تھا۔ پیغمبر اسلام کی آمد اس دنیا کا دوسرا عظیم دھماکہ ہے جس نے عالم انسانی کو اس کی مقررہ شاہراہ پر ڈال دیا۔ اس سلسلہ کا تیسرا دھماکا وہ ہے جس کو علمی انفجار (Knowledge Explosion) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسرارِ فطرت کے انکشاف نے ان غیبی حقائق کو علمی طور پر قابلِ فہم بنا دیا جس کو پیغمبروں نے الہامی طور پر کھولا تھا۔ کائنات کے یہ تین اہم ترین واقعات ہیں جن کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

فتق کائنات (انبیاء۔30)

اظہار دین (فتح۔28)

آیاتِ آفاق وانفس کا ظہور (فصلت۔53)

قرآن کے مطابق کائنات ابتداءً حالتِ رتق میں تھی، اللہ نے اس کا فتق کیا۔ یہ گویا پہلا عظیم دھماکہ تھا، جو فلکی طبعیات کے اندازہ کے مطابق ۱۵ بلین سال پہلے پیش آیا۔ اس نے کائنات کے اندرونی طور پر جڑے ہوئے مادہ کو بیرونی سمت میں حرکت دے دی۔ مادہ پھیلنا شروع ہوا اور بالآخر وہ پوری کائنات اور نظام شمسی وجود میں آئے جن سے آج ہم واقف ہیں۔ اس کے بعد جب پہلے انسان (آدمؑ) پیدا کئے گئے اور بائبل کے بیان کے مطابق عراق میں دجلہ وفرات کے درمیان (پیدائش 14:2) آباد ہوئے تو وہ دنیا آخری طور پر بن کر تیار ہو چکی تھی جس میں وہ سب کچھ مکمل طور پر موجود ہے جو انسان کو اپنی ضرورتوں کے لئے درکار ہو سکتا ہے۔ (ابراہیم۔34) علم الانسان کے ماہرین کے اندازہ کے مطابق انسان کے ظہور سے اب تک تقریباً ایک سو ارب (ایک کھرب) انسان زمین پر پیدا ہو چکے ہیں۔

مادی ضرورتوں کے لیے انسان کو ایک مکمل کائنات حاصل ہوگئی۔ اب اس کو ضرورت ایک ایسے ہدایت نامہ کی تھی جس کی روشنی میں وہ اپنے لیے حیات طیبہ (نحل۔97) کی تعمیر کر سکے۔ پہلی چیز اگر نعمت ظاہری تھی تو دوسری چیز نعمت باطنی (لقمان۔20) اللہ نے یہاں قلم (علق۔4) کا ذریعہ اختیار کیا۔ اس نے انسان کی اس دوسری ضرورت کی تکمیل کے لیے اس کے پاس وہ ابدی ہدایات بھیج دیں جن کی روشنی میں وہ اپنی سرگرمیوں کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو پالے اور وہ بنیادی اصول اس کو مل جائیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی کو ترتیب دے سکے۔ چنانچہ آدم جب زمین پر آئے تو وہ خدا کی یہ رہنمائی بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آدم نے ان تعلیمات کو کچی مٹی کی تختیوں پر لکھا اور پھر ان کو پکا کر اپنے خاندان میں محفوظ کر دیا۔ مگر ان کی اگلی نسل ان کی حفاظت نہ کر سکی۔ اللہ نے ودسرے نبی کے ذریعہ دوبارہ اپنی تعلیمات کو اتارا۔ مگر انسان نے پھر ان کو ضائع کر دیا۔ آدم کے بعد ادریس، نوح، ابراہیم، اسرائیل، موسیٰ (علیہم السلام) اور ان کی اولاد میں کثیر تعداد میں پیغمبر آئے اور خدا کی طرف سے تختیاں اور کتاب (فاطر۔25) انسان کے حوالے کرتے رہے۔ مگر بار بار یہی ہوا کہ اگلی نسلیں ان کی حفاظت میں ناکام رہیں۔ کبھی ان کے علماء نے کتاب اللہ میں اپنی باتیں اس طرح ملا دیں کہ دونوں کو الگ کرنا ناممکن ہوگیا۔ (تورات) کبھی اصل متن غائب ہوگیا اور صرف اس کا ترجمہ باقی رہ گیا۔ (انجیل)۔ کبھی کسی ارضی یا سماوی آفت میں کتاب ضائع ہوگئی (صحیفہ ابراہیم) اس طرح انسان اس اعتماد میں پورا نہ اترا کہ وہ بطور خود کتاب الٰہی کا محافظ (مائدہ۔44) بن سکے۔ بالآخر اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق فیصلہ کیا کہ کتاب اتارنے کے ساتھ وہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لے لے۔ (حجر۔9) تاکہ انسان کے اوپر جس طرح نعمت مادی کا اتمام ہوا ہے، نعمت ہدایت کا بھی اس کے اوپر یقینی اتمام ہوجائے۔ (نحل۔81)

ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کی بعثت خدا کا دوسرا دھماکہ تھا۔ فاران (استثنا 2:33) کے علاقہ بکہ (زبور 6:84) میں بنی اسرائیل کے بھائی (استثنا 18:18) بنی اسماعیل میں آتشیں شریعت (استثنا 2:33) والا رسول بھیجا گیا۔ اللہ نے اس کے لیے مقدر

کر دیا کہ اس کو نہ زوال ہوگا اور نہ وہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کر لے۔ (یسعیاہ 42:4)۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: خدا اس رسول کے ذریعہ اپنے دین کو غالب کرے گا اور اپنے نور کا اہتمام کرکے رہے گا، خواہ یہ کافروں اور مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو (براءۃ، فتح۔ صف)۔ اتمام نور سے مراد قرآن کو اتارنے کے بعد اس کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دینا ہے۔ اور ''غلبہ'' سے مراد اس کی پشت پر ایسی طاقت جمع کر دینا ہے جو اس میں تحریف و تبدیلی کی ہر کوشش کو ناممکن بنا دے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''آج منکرین تمھارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے، اس لیے تم ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے دین کو کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔ (مائدہ۔) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے جو دین آئے وہ ناقص دین تھے اور اسلام مکمل دین ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کے پاس کبھی کوئی ناقص دین نہیں بھیجا۔ اسلام کے کامل ہونے کا تعلق اس کی حفاظت سے ہے نہ کہ فہرست احکام سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب دین کو اپنی صحیح شکل میں اتارنے کے ساتھ مزید یہ تکمیلی اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کی پشت پر قوت بھی جمع کر دی گئی ہے تاکہ کوئی منکر یا غیر منکر اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہی بات دوسری جگہ ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اور تیرے رب کا کلام پورا ہو گیا صداقت اور انصاف میں، اب کوئی اس کلام کو بدلنے والا نہیں (انعام۔ 115)

قدیم زمانہ میں قرآن میں مذکور تقریباً دو درجن اور بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ 24 ہزار پیغمبروں کے آنے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ دین خداوندی کی پشت پر ایسی اجتماعی قوت جمع ہوتی جو انسانی زندگی میں مطلوبہ انقلاب برپا کرتی۔ اللہ نے آخری رسول کے ذریعہ یہ کیا کہ اپنے دین کو غالب کرکے اس کو قیامت تک کے لیے ایک تاریخی واقعہ بنا دیا جب کہ اس سے پہلے وہ افسانوی روایات کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ بائبل کے الفاظ میں ''خداوند کا روز عظیم'' (صفنیاہ 14:1) تاریخ کا یہی لمحہ تھا جب کہ انسانی تاریخ کو اس کے مطلوبہ رخ کی طرف بجبر موڑ دیا گیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے کتاب الٰہی کو مدون کرکے اس

کوایک عظیم امت کے حوالے کیا۔ جواس کو لے کرانتہائی حفاظت کے ساتھ نسل درنسل چلتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کو دور پریس میں پہنچا دیا جس کے بعد اس کے ضیاع یا تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

متن قرآن کی حفاظت کی اہمیت کیا ہے، اس کو ان اسلامی فرقوں کے مطالعہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو بعد کے دور میں اسلام کے اندر پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر شیعہ اور صوفیاء کو لیجئے۔ شیعیت ابتداءً اگر چہ سیاسی محرک کے تحت پیدا ہوئی اور تصوف روحانی محرک کے تحت، تاہم دونوں اپنے آپ کو اسلام کے صحیح ترین نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق کسی کی نجات ان کے طریقے کو اختیار کئے بغیر ممکن نہیں۔ مگر ایک شخص جب ان دونوں کے عقائد وخیالات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ ان کے مزعومات اور طریقوں کا قرآن کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ شیعیت اور تصوف دونوں اگر چہ قرآن ہی کا حوالہ دیتے ہیں، مگر ایک غیر جانب دار مبصر کے لیے دونوں متوازی مذاہب ہیں جو قرآن کے بالمقابل قرآن کے نام پر کھڑے کر لئے گئے ہیں۔ اگر قرآن کا متن اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ ہوتا تو اسلام انسانی آمیزشوں کا شکار ہو کر اتنی مختلف شکل اختیار کر لیتا کہ کسی بندۂ خدا کے لیے اپنے رب کی مرضی کو جاننا ہی ناممکن ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ متن قرآن کی حفاظت اتنی ہی اہم ہے جتنا قوانین فطرت کا استحکام۔ قوانین فطرت میں اگر استحکام نہ ہوتا تو سائنس وجود میں نہ آتی، اسی طرح متن قرآن اگر محفوظ نہ ہوتا تو خدا پرستی ساری دنیا کے لیے ایک لامعلوم چیز بن جاتی۔

انسان کو زمین کا خلیفہ (با اقتدار) بنا کر پیدا کیا گیا ہے (بقرہ۔30) اقتدار و اختیار کا مالک ہونے کی وجہ سے ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ وہ بگڑ جائے اور خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے لگے۔ اس سے بچنے کے لیے انسان کو خصوصی طور پر اسماء کا علم (بقرہ۔31) دیا گیا۔ اسماء سے مراد اللہ کے نام، بالفاظ دیگر اس کی وہ جھلکیاں ہیں جو اس کی پیدا کی ہوئی کائنات میں ہر طرف نقش ہیں۔ اللہ کا یہ تعارف ہر چیز سے اس طرح ابلا پڑ رہا ہے گویا کہ تمام چیزیں خدا کی تسبیح پڑھ رہی ہوں (حشر۔آخر)۔ ''آدم کو سارے نام سکھا دیئے۔'' (بقرہ۔31)

کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ صلاحیت دے دی کہ وہ ہر چیز میں خدا کا نام پڑھ لے، ہر چیز میں اپنے خالق کا جلوہ دیکھ لے۔ انسان کو سننے، دیکھنے اور سوچنے کی جو اعلیٰ صلاحیتیں دی گئی ہیں، ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو وہ چڑیوں کے چہچہے میں خدا کا ذکر سنے گا، پھول کی رنگینیوں میں خدا کا جلوہ دیکھے گا۔ کائنات اس کے لیے خدا کے اتھاہ کرشموں کا آئینہ بن جائے گی۔ اگر آدمی اپنے کو اندھا بہرہ (اعراف۔179) نہ بنا لے تو اسماء الٰہی کا یہ علم اس کو ہر قسم کے بگاڑ سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ جو خادم ہر آن اپنے آقا کی عظمتوں اور قدرتوں کا مشاہدہ کررہا ہو، وہ کیسے جرأت کرسکتا ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔

کائنات میں اللہ کے یہ تمام ''نام'' اول دن سے لکھے ہوئے ہیں اور اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے انسان ہمیشہ اس قابل رہا ہے کہ وہ ان ناموں کو ''پڑھ'' سکے۔ مگر جیسا کہ آرنلڈ ٹائن بی (1975۔1889) نے لکھا ہے، انسان اپنی مظاہر پرستی کی وجہ سے اپنے طویل ماضی میں ان حقائق کو بے نقاب نہ کرسکا۔ پیغمبروں کی زبان سے مسلسل خدا پرستی کی دعوت کے باوجود مظاہر قدرت انسان کو کچھ اس طرح متاثر کرتے رہے کہ خدا کے بجائے وہ انھیں مظاہر کو دیوتا بنا کر ان کو پوجتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے لیے کائنات پرستش کا موضوع بن گئی، حالانکہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ اس کے لیے تحقیق اور تسخیر (جاثیہ۔13) کا موضوع بنتی۔

علم اسماء کے لاشعوری علم کو شعوری بنانے کے لیے تیسرا دھماکہ درکار تھا اور اس کو اسلامی انقلاب نے فراہم کردیا۔ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کے عالمی سطح پر مظاہر پرستی کو ختم کرکے خدا پرستی کی عمومی فضا پیدا کی۔ یہ فکری حرکت اتنی طاقت ور تھی کہ جن مشرک قوموں نے اسلام کو اختیار نہیں کیا انھیں بھی اپنی زندگی اس میں نظر آئی کہ غیر اللہ کی پرستش چھوڑ کر خدا کی پرستش اختیار کرنے کی آواز بلند کریں۔ عیسائیوں میں مارٹن لوتھر (1546۔1483) اور ہندوؤں میں رامانند (چودھویں صدی) اس کی مثال ہیں۔ اس طرح معلوم انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ کائنات، پرستش کے بجائے تحقیق وتجسس کا موضوع بن گئی۔ یونانی قیاسات اور مصری توہمات کی بنیاد پر بنا ہوا فکری نظام ٹوٹ گیا۔ انسان نے

خالی الذہن ہوکر عالم فطرت کے اسرار دریافت کرنے شروع کئے یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب کہ انسانی علم، الہامی علم کا مصداق بن گیا۔ حالاں کہ اس سے پہلے وہ اس کا حریف بنا ہوا تھا۔

علوم فطرت کی یہ کھوج اولاً گیارھویں صدی عیسوی میں اسپین اور سسلی میں ابھری اور بیسویں صدی میں پہنچ کر مغرب نے اس کو ایک مکمل علم بنا دیا۔ پیغمبر اسلام کے ذریعہ ظہور میں آنے والا واقعہ (اسلامی انقلاب) آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کی زندگی ہی میں مطلوب تھا اس لیے قرآن میں اس کے لیے حال کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے (**لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّه**) مگر اگلا واقعہ (علوم فطرت کا انکشاف) آپؐ کے انقلاب کے زیر اثر بعد کو ظہور میں آنے والا تھا، اس لیے اس کو استقبال کے صیغہ میں بیان کیا گیا:

سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ

(فصلت۔ 53)

قرآن دائمی حجت

قرآن نسلِ انسانی کے اوپر ایک دائمی حجت ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے انسان کے لیے اعتقادیات کی جو بنیاد پیش کی ہے، اس کے سوا کوئی اور بنیاد ابھی تک انسان دریافت نہ کر سکا۔

قرآن کے مخاطبین قرآن کو افتراء (ہود: 13) اور تقوّل (طور: 33) کہتے تھے۔ یعنی رسالت کے مدعی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) توحید کی بنیاد پر جو دعوت پیش کر رہے ہیں، وہ ایک خلافِ واقعہ چیز ہے۔ انھوں نے یہ باتیں اپنے جی سے گھڑ لی ہیں اور ان کو خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ حقیقی صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ مخالفین نے شرک کی بنیاد پر جو نظام عقیدہ بنا رکھا ہے، اس کے لیے ان کے پاس کوئی نقلی یا عقلی دلیل (احقاف 4) موجود نہیں۔ اس کی سادہ سی جانچ یہ ہے کہ اگر تم اپنے کو برحق سمجھتے ہو تو اپنے عقیدہ کی بنیاد پر ایک کتاب ہدایت (قصص 49) مرتب کر کے لاؤ۔ قرآن نے اس سلسلہ

میں مزید اعلان کیا کہ تم کبھی ایسا نہ کرسکو گے۔(بقرہ 24)

یہ دعویٰ پوری تاریخ میں مسلسل طور پر برحق ثابت ہوا ہے۔ انسان آج تک کوئی دوسری بنیاد دریافت نہ کرسکا جس پر وہ اپنے نظام عقائد کو قائم کرسکے۔حتیٰ کہ موجودہ دور میں علم انسانی میں جو اضافہ ہوا ہے، اس نے اس سلسلے میں منکرین کی تمام امیدوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا ہے۔جدید علم نے جو نیا دریافت کی ہے، وہ حیرت انگیز طور پر ثابت کررہی ہے کہ انسان کے لیے نظام اعتقاد کی واحد بنیا توحید ہے۔ اس کے سوا کوئی اور بنیاد اس زمین وآسمان کے اندر ممکن نہیں۔1978 میں لندن سے شائع ہونے والی قاموس جہالت (The Encyclopaedia of Ignorance) اس واقعہ کا تازہ ترین علمی اعتراف ہے۔

قدیم شرک نے تو سرے سے یہ جرأت ہی نہ کی کہ اپنی بنیاد پر کوئی نظام عقائد کتابی شکل میں مرتب کرکے پیش کرے۔تاہم موجودہ زمانہ میں مادی طبعیات کی بنیاد پر نظام عقائد وضع کرنے کی کوشش بڑے پیمانہ پر کی گئی ہے۔حیاتیاتی اعتبار سے ڈارونزم اور سماجی اعتبار سے مارکسزم اس کی مثالیں ہیں۔مگر یہ تمام کوششیں اپنے حق میں علمی بنیاد حاصل کرنے سے محروم رہیں ۔موجودہ زمانہ میں ہونے والی طبیعی تحقیقات حیرت انگیز طور پر انسان کو مابعدالطبیعی نتائج کی طرف لے جارہی ہیں۔ ہر علمی شعبہ میں یہ صورت حال پیش آرہی ہے کہ محققین اپنی تلاش وجستجو میں جب آگے بڑھتے ہیں تو بالآخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعی توجیہہ کی حد ختم ہوگئی اور مافوق الطبیعی قوت کی کارفرمائی شروع ہوگئی۔ بالفاظ دیگر، اب خالص علمی طور پر یہ ثابت ہوتا جارہا ہے کہ اقرار الٰہ، واحد بنیاد ہے جس پر اعتقادیات کا نظام بنایا جاسکے۔شرک یا الحاد، علمی اعتبار سے، اپنی کوئی بنیاد نہیں رکھتے۔

کائنات کے ابتدائی مادہ کے پھٹنے سے دنیا کا وجود میں آنا موجودہ صدی کے وسط تک مادی اسباب کے تحت ہونے والا سادہ طبیعی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔اب معلوم ہوا کہ وہ ایک انتہائی منظم واقعہ تھا جو اخراج طاقت (Energy release) کے ذریعہ وجود میں آیا۔عالم

کے ترکیبی اجزاء اس سے پہلے بے ترتیب مادی ڈھیر سمجھ لیے گئے تھے۔اب محققین پا رہے ہیں کہ کائنات ایک بے حد یکساں (Uniform) واقعہ ہے۔الکٹران کے مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے تقریباً 1480 کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔یہی تناسب ہمیشہ قائم رہتا ہے۔گویا کسی خارجی طاقت نے تحکمی طور پر (Arbitrarily) کائنات کو ریاضیاتی یکسانیت کا پابند بنا رکھا ہے۔زمین پر ارتقائی حالات کے نتیجہ میں زندگی کا وجود میں آنا بے دلیل مفروضہ ثابت ہو رہا ہے۔حیاتیات دانوں کا رجحان اب یہ ہوتا جا رہا ہے کہ زندگی ایک بالائی (Extra- Terrestrial) شے ہے جو ''اوپر سے'' زمین پر بھیجی گئی ہے۔عالمِ فطرت کو کنٹرول کرنے والے قوانین ''کئی'' سے گھٹ کر ''ایک'' ثابت ہوتے جا رہے ہیں۔اس وحدت کو سائنسی طور پر کوئی زڈ ذرہ (Z-Particle) کا نام دے رہا ہے اور کوئی جادوئی ذرہ (Charmed Particle) کا۔وغیرہ

جدید سائنس کے ذریعہ فطرت کے جن اسرار و حقائق کا انکشاف ہوا ہے، ان کی اہمیت کو مذہبی حلقوں میں ابھی بہت کم سمجھا گیا ہے۔حالانکہ یہ آلاء اللہ (اعراف۔ 69) کا علم ہے۔یہ علوم الٰہیہ کی تاویل (یونس۔39) ہے قرآن اگر آیات الٰہی کی تفصیل ہے تو سائنس کے دریافت کردہ حقائق تدبیر امر (رعد۔2) کی تفسیر۔اس ''تیسرے دھاکہ'' کے بعد حقیقت آخری طور پر برہنہ ہو چکی ہے۔معرفت الٰہی کے تمام دروازے کھولے جا چکے ہیں۔اس کے بعد بھی جو لوگ سچائی کو پانے میں ناکام رہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ عاجلہ پسندی (قیامہ۔20) اور ظلم وعلو (نمل۔14) نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے۔ایسے لوگوں کو اب صرف چوتھے دھاکہ کا انتظار کرنا چاہئے جب کہ صور (نبا۔18) پھونکا جائے گا اور موجودہ دنیا کی بساط لپیٹ (انبیاء۔104) دی جائے گی تا کہ سچوں کو ان کی سچائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔

آدم سے مسیح تک

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے، سب اس لیے آئے کہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کردیں، یہ حقیقت کہ موجودہ دنیا کی زندگی، انسان کی ابدی زندگی کا صرف ایک امتحانی وقفہ ہے۔ کم وبیش سوسال یہاں زندگی گزار کر ہم اپنی مستقل دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں جہاں خدا کے وفادار بندوں کے لیے جنت ہے اور اس کے نافرمان بندوں کے لیے جہنم۔

آدمؑ پہلے انسان بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ اس کے بعد حضرت مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ ابوامامہ کی روایت میں آیا ہے کہ ابوذر غفاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء کی تعداد کے بارے میں سوال کیا آپؐ نے فرمایا، ایک لاکھ 24 ہزار۔ ان میں تین سو پندرہ رسول ہوئے۔ (رواہ احمد وابن راہویہ فی مسندیہما وابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی المستدرک) خدا کے ان نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا اور خدا سے ڈر کر زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ مگر انسانوں میں بہت کم ایسے لوگ نکلے جو اپنی آزادی عمل کو خدا کے حوالے کرنے لیے تیار ہوں۔ حضرت یحییٰ کو کوئی ساتھی نہیں ملا اور وہ قتل کردیئے گئے۔ حضرت لوط نے اپنی قوم کو چھوڑا تو ان کے ساتھ ان کی صرف دو لڑکیاں تھیں۔ حضرت نوح کے ساتھ ان کی کشتی کا قافلہ، توریت کے بیان کے مطابق، صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھا، حضرت ابراہیم اپنے وطن عراق سے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ تھیں اور ان کے بھتیجے لوط۔ بعد کو اس قافلہ میں ان کے دو بیٹے اسماعیل اور اسحاق شامل ہوئے۔ حضرت مسیح کو ساری کوشش کے بعد بارہ آدمی ملے، وہ بھی آخر وقت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (متی 56:26)

بیشتر انبیاء کا حال یہی رہا ہے۔ کوئی تنہا رہ گیا۔ کسی کو چند ساتھ دینے والے ملے۔ ان چند میں بھی زیادہ تر ان کے اپنے اہل خاندان تھے جن سے رشتے کا تعلق نبی کا ساتھ دینے کے لیے ایک اضافی محرک بن گیا۔ قرآن کی یہ آیت اس پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے:

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰

(یٰسین۔30)

افسوس ہے بندوں کے حال پر جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا تو انھوں نے اس کی ہنسی اڑائی۔

انسانی نسل میں خدا کے نزدیک سب سے اہم ہستیاں وہ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ساری تاریخ میں یہی لوگ سب سے زیادہ غیر اہم رہے ہیں۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے واقعات تاریخ نے مکمل طور پر ضبط کئے۔ مگر آدم سے مسیح تک کوئی نبی ایسا نہیں جس کو باقاعدہ طور پر مدوّن تاریخ میں جگہ ملی ہو۔

ارسطو (322۔384ق) حضرت موسیٰ کے ہزار برس بعد پیدا ہوا۔ مگر وہ موسیٰ کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر انبیاء کو ان کی قوم نے رد کر دیا۔ ان کے گھروں کو اجاڑا گیا، ان کو معاشرہ میں بے قیمت کر کے رکھ دیا گیا، ان کو ایسا بنا دیا گیا گویا وہ اتنے غیر اہم لوگ ہیں جن کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

نبیوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے: اپنی مخاطب قوموں کی روش پر تنقید۔ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز محبوب ہے وہ ہے اپنی تعریف۔ اور جو چیز سب سے زیادہ مبغوض ہے، وہ ہے اپنے خلاف تنقید۔ انبیاء چونکہ صحیح اور غلط کو بتانے کے لیے آتے ہیں، وہ اپنے ہم قوموں سے مصالحت نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس لیے قوم ان کی مخالف بلکہ دشمن ہو جاتی ہے۔ انبیاء اگر لوگوں کی دل پسند تقریریں کرتے تو کبھی ان کو اس صورت حال سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔

اس عمومی انجام میں صرف چند نبیوں کا استثناء ہے۔ مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام۔ مگر ان حضرات کو جو عروج واقتدار ملا، وہ ان کے نظریات کی عوامی مقبولیت کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کے اسباب بالکل دوسرے تھے۔

حضرت داؤد اسرائیلی بادشاہ ساؤل کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی تھے۔ ان کے زمانہ میں اسرائیلیوں اور فلسطینیوں میں جنگ ہوئی۔ فلسطین فوج میں جالوت نام کا ایک دیوہیکل پہلوان تھا جس سے مقابلہ کرتے ہوئے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ بادشاہ نے اعلان

کیا کہ جو شخص اس کو قتل کرے گا میں اپنی لڑکی کی شادی اس سے کردوں گا۔ حضرت داؤد نے مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ اس طرح وہ اسرائیلی بادشاہ کے داماد بن گئے۔ اس کے بعد جب ایک جنگ میں بادشاہ اور اس کا ولی عہد دونوں ہلاک ہو گئے تو تخت حضرت داؤد کے حصہ میں آ گیا۔ حضرت سلیمان آپ کے بیٹے تھے اور ان کو حکومت اپنے باپ سے وارثت میں ملی۔ حضرت یوسف کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا۔ اس سے مصر کا مشرک بادشاہ متاثر ہو گیا، اور اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحت حکومتی انتظامات آپ کے سپرد کر دیئے۔ تاہم بادشاہ اور عام مصری باشندے بدستور اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہے۔

اس صورت حال کا نقصان صرف یہی نہیں ہوا کہ ہر دور کی بیشتر آبادی خدا کی نعمت ہدایت سے محروم رہی۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے جو کتاب اور پیغامات لے کر آتا تھا، اس کے بعد اس کو محفوظ رکھنے کا سامان نہ ہو سکا۔ کیونکہ پیغمبر کے بعد اس کے متبعین ہی اس کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر وہ یا تو حاصل نہیں ہوئے یا اتنے کم تھے کہ سماج کے علی الرغم کلام الٰہی کی حفاظت نہ کر سکے۔

خدا جس کا علم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، جو آنے والے مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح گزرے ہوئے ماضی کو، اسے انسانیت کا یہ انجام معلوم تھا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی یہ مقدر کر دیا تھا کہ پیغمبرانہ دور کے آخری مرحلہ میں وہ اپنا ایک خاص نمائندہ بھیجے گا۔ اس پیغمبر کو دعوت دین کے ساتھ اظہار دین کی نسبت بھی حاصل ہوگی۔ اس کو یہ نصرتِ خاص دی جائے گی کہ وہ ہر حال میں اپنے مدعوئین پر غلبہ حاصل کرے اور ان کو حق کے آگے جھکنے پر مجبور کرے (لن يقبضه حتى يقيم به الملة العوجاء) خدا کی فوج اس کا ساتھ دے کر اس کے مخالفوں کو زیر کرے گی۔ تاکہ خدا کا دین ہمیشہ کے لیے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اور خدا کی کتاب کی حفاظت کا مستقل انتظام ہو سکے۔ بائبل کے الفاظ میں ''جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہوا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان سے معمور ہو (حبقوق 2:14)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ کو، بائبل کی شہادت کے مطابق، ہزاروں برس پہلے

سے مختلف انبیاء کے ذریعہ ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ نبی عرب کے صحرائی جغرافیہ سے اٹھے گا۔ وہ بنی اسرائیل کے بقیہ گھرانے یعنی ان کے بھائیوں (بنی اسمائیل) کی اولاد سے ہوگا۔ وہ حضرت مسیح کے بعد آئے گا۔ اس کے ساتھی خدا کے خریدے ہوئے کہلائیں گے۔ جو قومیں ان سے ٹکرائیں گی پاش پاش ہوجائیں گے۔ ازلی پہاڑ (ایران وروم) جھک جائیں گے۔ اس کی سلطنت خشکی سے لے کر بحری ممالک تک پھیلی ہوئی ہوگی۔ وغیرہ۔

موجودہ بائبل اگرچہ ترجمہ اورالحاقات کے نتیجہ میں اصل بائبل سے بہت کچھ مختلف ہو چکی ہے۔ تاہم آج بھی کثیر تعداد میں اس کے اندر ایسے بیانات موجود ہیں جو ایک غیر جانب دار آدمی کے لیے آنے والے آخری نبی کے سوا کسی اور ذات پر صادق نہیں آتے۔ خاص طور ہر حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کا تو مشن ہی یہ تھا کہ وہ دنیا کو خصوصًا یہود کو آنے والے نبی سے آخری طور پر آگاہ کر دیں۔ آپ نے جس ''نئے عہد نامہ'' کی بشارت دی وہ حقیقۃً اسلام تھا جو یہود کی معزولی کے بعد بنی اسماعیل کے ذریعہ باندھا گیا۔ انجیل نئے عہد نامہ کی بشارت ہے نہ کہ خود نیا عہد نامہ۔

حضرت مسیح علیہ السلام، نبی آخرالزماں سے چھ سوسال قبل تشریف لائے۔ قرآن کی سورہ نمبر 61 میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت مسیح نے فلسطین کے یہودیوں سے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک آنے والے نبی سے پہلے اس کا مبشر بنا کر بھیجا ہے جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔ (الصّف۔ 6)

احمد اور محمد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں جن کے معنی ''تعریف کیا ہوا۔'' انجیل برناباس میں صاف صاف لفظ ''محمد'' آیا ہے۔ تاہم چونکہ مسیحی حضرات انجیل برناباس کو جعلی انجیل کہتے ہیں، اس لیے ہم اس کا حوالہ مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز ہمیں اس میں شبہ ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی پیشین گوئی میں لفظ احمد یا محمد کہا ہوگا۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ آپ نے احمد یا محمد کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال فرمایا۔

محمد بن اسحاق (م 152ھ) کی ایک روایت جو ابن ہشام نے نقل کی ہے، اس کے

مطابق یہ لفظ غالباً مُنْحَمَنَّا تھا۔ابن اسحاق سیرت کے موضوع پر سب سے زیادہ اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ان کی روایت ہے کہ مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ یحنّس (یوحنا) کی انجیل میں آنے والے رسول کی جو پیشین گوئی ہے،اس میں اس کا نام منحمنا بتایا گیا ہے (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلداول،صفحہ 50) اغلباً یہ روایت انھیں اپنے زمانہ کے فلسطینی عیسائیوں کی معرفت پہنچی جواس وقت اسلام کے زیراقتدار آچکا تھا۔منحمنّا سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''تعریف کیا ہوا'' ماضی کے اثر سے اُس وقت تک فلسطین کے باشندوں کی زبان سریانی تھی۔اغلب ہے کہ حضرت مسیح کی مادری زبان میں بولا ہوا اصل لفظ (منحمنا) ان کی روایات میں چلا آرہا تھا جو بعد کے یونانی ترجموں میں فارقلیط بن گیا۔

یہاں ہم بائبل (قدیم اور جدید عہدناموں) سے کچھ اقتباسات بغیر کسی کمی یا اضافہ کے نقل کرتے ہیں۔

بائبل میں آخری رسول کی پیشین گوئیاں

اورخداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔سو تو باعثِ برکت ہوا۔جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔سو ابرام خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لوط اس کے ساتھ گیا۔اور ابرام پچھتر برس کا تھا جب وہ حاران سے روانہ ہوا۔اور ابرام نے اپنی بیوی ساری اور اپنے بھتیجے لوط کو اور سب مال کو جو انھوں نے جمع کیا تھا اور ان آدمیوں کو جو ان کو حاران میں مل گئے تھے، ساتھ لیا اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے اور ملک کنعان میں آئے اور ابرام اس ملک میں گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اسے دکھائی دیا تھا، ایک قربان گاہ بنائی۔(پیدائش 12:1۔7)

جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو۔اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔تب ابرام سرنگوں ہو گیا اور خدا نے اس سے ہم کلام ہو کر فرمایا کہ دیکھ۔میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں ہوگا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا۔کیوں کہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرا دیا ہے۔اور میں تجھے بہت برومند کروں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں سے برپا ہوں گے۔اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا، باندھوں گا، تا کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان

کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسادوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہوجائے ۔اور میں ان کا خدا ہوں گا۔(پیدائش 17:1۔8)

اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارااور کہا کہ خداوند فرماتا ہے، چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرااکلوتا ہے۔دریغ نہ رکھا،اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندروں کے کناروں کی ریت کی مانند کردوں گااور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی ۔اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔(پیدائش 22:15۔18)

اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یہ کہہ کر بلوایا کہ تم سب جمع ہوجاؤ تا کہ میں تم کو بتاؤں کہ آخری دنوں میں تم پر کیا کیا گزرے گا۔اے یعقوب کے بیٹو جمع ہوکر سنواور اپنے باپ اسرائیل کی طرف کان لگاؤ(پیدائش 49:1۔2) یہوداہ سے سلطنت نہیں چھوٹے گی اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عصا موقوف ہوگا، جب تک کہ وہ نہ آیا جو بھیجا جانے والا ہے۔ اور قومیں اس کی مطیع ہوں گی ۔وہ اپنا جوان گدھا انگور کے درخت سے باندھا کرے گا۔(10۔11)

(موسیٰ نے کہا اے اسرائیلیو) خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہوتا کہ میں مر نہ جاؤں ۔اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں،سو ٹھیک کہتے ہیں۔میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا،نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثنا 18: 15۔18)

اور مردِ خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا۔ خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ اور دس ہزار قدوسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا 23:1۔2)

خدا ہم پر رحم کرے اور ہم کو برکت بخشے۔ اور اپنے چہرہ کو ہم پر جلوہ گر فرمائے۔ تا کہ تیری راہ زمین پر ظاہر ہو جائے۔ اور تیری نجات سب قوموں پر۔ اے خدا لوگ تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ امتیں خوش ہوں اور خوشی سے للکاریں۔ کیوں کہ تو راستی سے لوگوں کی عدالت کرے گا۔ اور زمین کی امتوں پر حکومت کرے گا۔ اے خدا! لوگ تیری تعریف کریں۔ سب لوگ تیری تعریف کریں۔ زمین نے اپنی پیداوار دے دی۔ خدا یعنی ہمارا خدا ہم کو برکت دے گا۔ خدا ہم کو برکت دے گا۔ اور زمین کی انتہا تک سب لوگ اس کا ڈر مانیں گے۔

خدا اٹھے۔ اس کے دشمن پراگندہ ہوں۔ اس سے عداوت رکھنے والے اس کے سامنے سے بھاگ جائیں۔ جیسے دھواں اڑ جاتا ہے، ویسے ہی تو ان کو اڑا دے۔ جیسے موم آگ کے سامنے پگھل جاتا ہے، ویسے ہی شریرِ خدا کے حضور فنا ہو جائیں۔ لیکن صادق خوشی منائیں۔ وہ خدا کے حضور شادماں ہوں۔ بلکہ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ خدا کے لیے گاؤ۔ اس کے نام کی مدح سرائی کرو۔ صحرا کے سوار کے لیے شاہراہ تیار کرو۔ (زبور 67۔68)

اے خدا، بادشاہ کو اپنے احکام اور شہزادہ کو اپنی صداقت عطا فرما۔ وہ صداقت سے تیرے لوگوں کی اور انصاف سے تیرے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ ان لوگوں کے لیے پہاڑوں سے سلامتی کے اور پہاڑیوں سے صداقت کے پھل پیدا ہوں گے۔ وہ ان لوگوں کے غریبوں کی عدالت کرے گا۔ وہ محتاجوں کی اولاد کو بچائے گا۔ اور ظالم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ جب تک سورج اور چاند قائم ہیں، لوگ نسل در نسل تجھ سے ڈرتے رہیں گے۔ وہ کٹی ہوئی گھاس پر مینھ کی مانند اور زمین کو سیراب کرنے والی بارش کی طرح نازل ہوگا۔ اس کے ایام میں صادق برومند ہوں گے۔ اور جب تک چاند قائم ہے، خوب امن رہے گا۔ اس

کی سلطنت سمندر سے سمندر تک اور دریائے فرات سے زمین کی انتہا تک ہوگی ۔ بیابان کے رہنے والے اس کے آگے جھکیں گے ۔اوراس کے دشمن خاک چاٹیں گے ۔ترسیس کے اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے ۔سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے لائیں گے ۔ بلکہ سب بادشاہ اس کے سامنے سرنگوں ہوں گے ۔کُل قومیں اس کی مطیع ہوں گی ۔ کیونکہ وہ محتاج کو جب وہ فریاد کرے اور غریب کو جس کا کوئی مددگار نہیں ، چھڑائے گا ۔اور غریب اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان بچائے گا ۔ وہ فدیہ دے کران کی جان کو ظلم اور جبر سے چھڑائے گا اوران کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہوگا ۔وہ جیتے رہیں گے اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا ۔لوگ برابر اس کے حق میں دعا کریں گے ۔وہ دن بھر اسے دعادیں گے ۔ زمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اناج کی افراط ہوگی ۔ان کا پھل لبنان کے درختوں کی طرح جھومے گا ۔ اور شہر والے زمین کی گھاس کی مانند ہرے بھرے ہوں گے ۔اس کا نام ہمیشہ قائم رہے گا ۔ جب تک سورج ہے ، اس کا نام رہے گا ۔اور لوگ اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گے ۔سب قومیں اسے خوش نصیب کہیں گی ۔(زبور ۔72)

مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں ۔ وہ سدا تیری تعریف کریں گے ۔ مبارک ہے وہ آدمی جس کی قوت تجھ سے ہے ۔جس کے دل میں صیّون کی شاہراہیں ہیں ۔وہ وادی بکا(Baca) سے گزر کر اسے چشموں کی جگہ بنالیتے ہیں بلکہ پہلی بارش اسے برکتوں سے معمور کر دیتی ہے ۔وہ طاقت پر طاقت پاتے ہیں ۔ان میں سے ہرایک صیّون میں خدا کے حضور حاضر ہوتا ہے ۔(زبور 84:4 ۔7)

اے یاہ! تجھ ساز بردست کون ہے ، میرا ہاتھ اس کے ساتھ رہے گا ۔میرا بازو اسے تقویت دے گا ۔دشمن اس پر جبر نہ کرنے پائے گا ۔ اور شرارت کا فرزند اسے نہ ستائے گا ۔میں اس کے مخالفوں کو اس کے سامنے مغلوب کروں گا ۔اوراس سے عداوت رکھنے والوں کو ماروں گا ۔ پر میری وفاداری اور شفقت اس کے ساتھ رہیں گی ۔اور میرے نام سے اس کا سینگ بلند ہوگا ۔میں اس کا ہاتھ سمندر تک بڑھاؤں گا ۔ اوراس کے داہنے ہاتھ کو دریاؤں تک ۔ وہ مجھے پکار کر کہے گا تو میرا باپ ، میرا خدا ، اور میری نجات کی چٹان ہے ۔

میں اسی کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا۔اور دنیا کا شہنشاہ۔میں اپنی شفقت کو اس کے لیے ابد تک قائم رکھوں گا۔اور میرا عہد اس کے ساتھ لاتبدیل رہے گا۔میں اس کی نسل کو ہمیشہ تک قائم رکھوں گا۔اور اس کے تخت کو جب تک آسمان ہے۔اگر اس کے فرزند میری شریعت کو ترک کر دیں اور میرے احکام پر نہ چلیں،اگر وہ میرے آئین کو توڑیں اور میرے فرمان کو نہ مانیں تو میں ان کو چھڑی سے خطا کی اور کوڑوں سے بدکاری کی سزا دوں گا۔لیکن میں اپنی شفقت اس پر ہٹا نہ لوں گا۔اور اپنی وفاداری کو باطل ہونے نہ دوں گا۔میں اپنے عہد کو نہ توڑوں گا۔اور اپنے منھ کی بات کو نہ بدلوں گا۔اس کی نسل ہمیشہ قائم رہے گی۔اور اس کا تخت آفتاب کی مانند میرے حضور قائم رہے گا۔وہ ہمیشہ چاند کی طرح اور آسمان کے سچے گواہ کی مانند قائم رہے گا۔(زبور 89:8، 21۔37)

اے سب اہل زمین !اس کے حضور کانپتے رہو۔قوموں میں اعلان کرو کہ خداوند سلطنت کرتا ہے۔جہاں قائم ہے اور اسے جنبش نہیں۔وہ راستی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔آسمان خوشی منائے اور زمین شاداں ہو۔سمندر اور اس کی معموری شور مچائیں۔میدان اور جو کچھ اس میں ہے،باغ باغ ہوں۔تب جنگل کے سب درخت خوشی سے گانے لگیں گے۔خداوند کے حضور،کیونکہ وہ آرہا ہے۔وہ زمین کی عدالت کرنے کو آرہا ہے۔وہ صداقت سے جہان کی اور اپنی سچائی سے قوموں کی عدالت کرے گا۔(زبور 96:139)

خداوند سلطنت کرتا ہے،زمین شادماں ہو۔بے شمار جزیرے خوشی منائیں۔بادل اور تاریکی اس کے اردگرد ہیں۔صداقت اور عدل اس کے تخت کی بنیاد ہیں۔آگ اس کے آگے چلتی ہے۔اور چاروں طرف اس کے مخالفوں کو بھسم کر دیتی ہے۔اس کی بجلیوں نے جہاں کو روشن کر دیا۔زمین نے دیکھا اور کانپ گئی۔خداوند کے حضور پہاڑ موم کی طرح پگھل گئے۔یعنی ساری زمین کے خداوند کے حضور۔آسمان اس کی صداقت ظاہر کرتا ہے۔سب قوموں نے اس کا جلال دیکھا ہے کھدی ہوئی مورتوں کے سب پوجنے والے جو بتوں پر فخر کرتے ہیں،شرمندہ ہوں------ وہ ان کو شریروں کے ہاتھ سے چھڑاتا ہے۔صادقوں کے لیے نور بویا گیا ہے۔(زبور 97)

صداقت کے پھاٹکوں کو میرے لیے کھول دو۔ میں ان سے داخل ہو کر خداوند کا شکر کروں گا۔ خداوند کا پھاٹک ہی ہے۔ صادق اس سے داخل ہوں گے۔ میں تیرا شکر کروں گا۔ کیونکہ تو نے مجھے جواب دیا۔ اور خود میری نجات بنا ہے۔ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجب ہے، یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا، ہم اس میں شادماں ہوں گے اور خوشی منائیں گے۔ (زبور 118:19۔24)

دیکھو میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں۔ میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈالی۔ وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلّائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنی جائے گی۔ وہ مسلے ہو سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ راستی سے عدالت کرے گا۔ وہ ماندہ نہ ہو گا اور نہ ہمت ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کر لے۔ جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے (یسعیاہ 42:1۔4)

گزر جاؤ۔ پھاٹکوں میں سے گزر جاؤ۔ لوگوں کے لیے راہ درست کرو اور شاہراہ اونچی اور بلند کرو۔ پتھر چن کر صاف کر دو۔ لوگوں کے لیے جھنڈا کھڑا کرو۔ دیکھ خداوند نے انتہائے زمین تک اعلان کر دیا ہے۔ دختر صیّون سے کہو، دیکھ تیرا نجات دینے والا آتا ہے۔ دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے سامنے ہے اور وہ مقدس لوگ اور خداوند کے خریدے ہوئے کہلائیں گے، اور تو مطلوبہ یعنی غیر متروک شہر کہلائے گی۔ (یسعیاہ 62:10۔12)

تیرے لوگوں اور تیرے مقدس شہر کے لیے ستر ہفتے مقرر کئے گئے کہ خطا کاری اور گناہ کا خاتمہ ہو جائے۔ بدکرداری کا کفارہ دیا جائے۔ ابدی راست بازی قائم ہو۔ رویا و نبوت پر مہر ہو اور پاک ترین مقام ممسوح کیا جائے۔ (دائی ایل 9:24) صیّون میں نرسنگا پھونکو۔ میرے کوہ مقدس پر سانس باندھ کر زور سے پھونکو۔ ملک کے تمام باشندے تھرتھرائیں، کیوں کہ خداوند کا زور چلا آتا ہے، بلکہ آ پہنچا ہے۔ اندھیرے اور تاریکی کا روز۔ ابر سیاہ اور ظلمات کا روز ہے۔ ایک بڑی اور زبردست امت جس کی مانند نہ کبھی ہوئی

اور نہ سالہائے دراز تک اس کے بعد ہوگی ، پہاڑوں پر صبح صادق کی طرح پھیل جائے گی ۔ گویا ان کے آگے آگے بھسم کرتی جاتی ہے ۔اوران کے پیچھے پیچھے شعلہ جلاتا جاتا ہے ۔ان کے آگے زمین باغ عدن کی مانند ہے اوران کے پیچھے ویران بیابان ہے ۔ ہاں ان سے کچھ نہیں بچتا۔ان کی نمود گھوڑوں کی سی ہے اورسواروں کی مانند دوڑتے ہیں ۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رتھوں کے کھڑکھڑانے اور بھوسے کو بھسم کرنے والے شعلۂ آتش کے شور کی مانند بلند ہوتے ہیں ۔ وہ جنگ کے لیے صف بستہ زبردست قوم کی مانند ہیں ۔ ان کے روبرو لوگ تھرتھراتے ہیں ۔ سب چہروں کا رنگ فق ہوجاتا ہے ۔وہ پہلوانوں کی طرح دوڑتے اور جنگی مردوں کی طرح دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں ۔سب اپنی اپنی راہ چلتے ہیں اور صف نہیں توڑتے ۔وہ ایک دوسرے کو نہیں دھکیلتے ۔ ہر ایک اپنی راہ پر چلا جاتا ہے ۔وہ جنگی ہتھیاروں سے گزر جاتے ہیں اور بے ترتیب نہیں ہوتے ۔وہ شہر میں کود پڑتے اور دیواروں اور گھروں پر چڑھ کر کھڑکیوں سے گھس جاتے ہیں ۔ان کے سامنے زمین و آسمان کانپتے اور تھرتھراتے ہیں ۔سورج اور چاند تاریک اور ستارے بےنور ہو جاتے ہیں اور خداوند اپنے لشکر کے سامنے للکارتا ہے ۔ کیونکہ اس کا لشکر بے شمار ہے اور اس کے حکم کو انجام دینے والا زبردست ہے ۔ کیونکہ خداوند کا روز عظیم نہایت خوفناک ہے ۔کون اس کو برداشت کرسکتا ہے ۔(یوایل 2:1۔11)

رب الافواج اسرائیل کا خدا فرماتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم، یقیناً موآب، سدوم کی مانند ہوگا اور بنی عمون عمورہ کی مانند۔وہ پرخار ونمک زار اور ابدالآباد برباد رہیں گے ۔ میرے لوگوں کا بقیہ ان کو غارت کرے گا۔اور میری قوم کے باقی لوگ ان کے وارث ہوں گے ۔ یہ سب کچھ ان کے تکبر کے سبب سے ان پر آئے گا ۔ کیوں کہ انہوں نے رب الافواج کے لوگوں کی ملامت کی اوران پر زیادتی کی ۔ خداوند ان کے لیے ہیبت ناک ہوگا اور زمین کے تمام معبودوں کو لاغر کردے گا اور بحری ممالک کے سب باشندے اپنی اپنی جگہ میں اس کی پرستش کریں گے ۔(صفنیاہ 2:9۔11)

جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہے، اسی طرح زمین خداوند کے جلال کے عرفان

سے معمور ہوگی (14:2) خدا تیمان سے آیا۔ اور قدوس کوہ فاران سے۔ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا۔ اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوگئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں۔ اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔ وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی۔ اور آتشی تیر اس کے قدموں سے نکلتے تھے۔ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں۔ (حبقوق 3:3۔6)

دیکھو، میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔ اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آ موجود ہوگا۔ ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزومند ہو، آئے گا، رب الافواج فرماتا ہے۔ پر اس کے آنے کے دن کی کس میں تاب ہے۔ اور جب اس کا ظہور ہوگا تو کون کھڑا رہ سکے گا۔ کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کی مانند ہے۔ اور وہ چاندی کو تانے اور پاک صاف کرنے والے کی مانند بیٹھے گا۔ اور بنی لادی کو سونے اور چاندی کی مانند پاک صاف کرے گا تا کہ وہ راست بازی سے خداوند کے حضور ہدیے گزرانیں۔ (ملاکی 3:1۔3)

رب احکام فرماتا ہے، اس روز وہ میرے لوگ بلکہ میری خاص ملکیت ہوں گے۔ اور میں ان پر ایسا رحیم ہوں گا جیسا باپ اپنے خدمت گزار بیٹے پر ہوتا ہے۔ تب تم رجوع لاؤ گے اور صادق اور شریر میں، اور خدا کی عبادت کرنے والے اور نہ کرنے میں امتیاز کرو گے۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آتا ہے جو بھٹی کی مانند سوزاں ہوگا۔ تب سب مغرور اور بدکردار بھوسے کی مانند ہوں گے۔ اور وہ دن ان کو ایسا جلائے گا کہ شاخ و بن کچھ نہ چھوڑے گا۔ (ملاکی 17:3۔18، 1:4)

نیا عہد نامہ

یسوع مسیح نے ان سے کہا، کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ ''جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔ اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔'' اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو، جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ (متی 21:42۔44)

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے۔ کیا تو ایلیاہ ہے۔ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا، میں جیسا یسعیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھا کرو۔ یہ فریسیوں کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے اس سے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر تو بپتسمہ کیوں دیتا ہے۔ یوحنا نے جواب میں ان سے کہا کہ میں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں۔ تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے بعد کا آنے والا جس کی جوتی کا تسمہ میں کھولنے کے لائق نہیں۔ (یوحنا 1:19۔26)

(یسوع نے کہا) اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔ (یوحنا 14:16) میں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا (25۔26) اس

کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔(14:30) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا(16:7۔8) مجھے تم سے اور بھی بہت سے باتیں کہنا ہیں۔مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا۔وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔(12۔14)

خداوند فرماتا ہے دیکھ، وہ دن آتے ہیں کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے سے ایک نیا عہد باندھوں گا۔ یہ اس عہد کی مانند نہ ہوگا جو میں نے ان کے باپ دادا سے اس دن باندھا تھا جب ملک مصر سے نکال لانے کے لیے ان کا ہاتھ پکڑا تھا۔اس واسطے کہ وہ میرے عہد پر قائم نہیں رہے اور خداوند فرماتا ہے کہ میں نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی ۔پھر خداوند فرماتا ہے کہ جو عہد اسرائیل کے گھرانے سے ان دنوں کے بعد باندھوں گا وہ یہ ہے کہ میں اپنے قانون ان کے ذہن میں ڈالوں گا اور ان کے دلوں پر لکھوں گا۔اور میں ان کا خدا ہوں گا اور وہ میری امت ہوں گے۔(عبرانیوں کے نام8:8۔10)

پھر میں نے ایک اور فرشتہ کو آسمان کے بیچ میں اڑتے ہوئے دیکھا۔جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور قبیلہ اور اہل زبان اور امت کے سامنے کے لیے ابدی خوش خبری تھی ۔اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تمجید کرو۔ کیونکہ اس کی عدالت کا وقت آ پہنچا ہے اور اس کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کئے ۔پھر اس کے بعد ایک اور دوسرا فرشتہ یہ کہتا ہوا آیا کہ گر پڑا۔وہ بڑا شہر بابل گر پڑا جس نے اپنی حرام کاری کی غضب ناک مے تمام قوموں کو پلائی ہے۔(یوحنا کا مکاشفہ 14:6۔8) پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید بادل ہے اور بادل پر آدم زاد کی مانند کوئی بیٹھا ہے جس کے سر پر سونے کا تاج اور ہاتھ میں تیز درانتی ہے۔پھر ایک اور فرشتہ

نے مقدس سے نکل کر اس بادل پر بیٹھے ہوئے سے بڑی آواز کے ساتھ پکار کر کہا کہ اپنی درانتی چلا کر کاٹ کیوں کہ کاٹنے کا وقت آ گیا۔ اس لیے کہ زمین کی فصل بہت پک گئی۔ پس جو بادل پر بیٹھا تھا، اس نے اپنی درانتی زمین پر ڈالی اور زمین کی فصل کٹ گئی (14۔16)

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے جو سچا اور برحق کہلاتا ہے۔ اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں۔ اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ کون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام کلامِ خدا کہلاتا ہے۔ اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور صاف مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔ اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا۔ اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے: بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند۔ (مکاشفہ 19:11۔16)

پھر میں نے ایک فرشتہ کو آسمان سے اترتے دیکھا، اس نے اژدہا یعنی پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے، پکڑ کر ہزار برس کے لیے باندھا اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا اور اس پر مہر کر دی تا کہ وہ ہزار برس کے پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔ اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے نکلے گا۔ اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان پر سے آگ نازل ہو کر انھیں کھا جائیگی۔ (مکاشفہ 20:1۔9)

نبوتِ محمدی کا ظہور

ایک طرف افریقہ اور دوسری طرف ایشیا اور یورپ کے وسط میں عرب کا جزیرہ نما قدیم آباد دنیا کا جغرافی قلب معلوم ہوتا ہے۔مگر قدیم زمانہ کے سیاسی حوصلہ آزماؤں میں کوئی نہیں ملتا جس نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کوشش کی ہو۔تمام فوجی مہمیں عرب کے سرحدی علاقوں۔عراق،شام،فلسطین،لبنان اور یمن پر آکر ٹھہر گئیں۔اس سے آگے نجد وحجاز کے علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی ضرورت انھوں نے نہیں سمجھی۔ کیوں کہ تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہونے کے باوجود یہاں ان کے لیے خشک پہاڑ اور اڑتی ہوئی ریت کے سوا اور کچھ موجود نہ تھا۔

اسی ''بے آبؐ وگیاہ'' وادی کی مرکزی بستی مکہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے۔آپؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب آپؐ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے انتقال کر گئے۔والدہ کا انتقال بھی اس وقت ہو گیا جب کہ آپؐ عمر ابھی صرف چھ سال تھی۔اب آپ کے سرپرست آپؐ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم تھے تاہم دو سال بعد وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے آخر عمر میں آپؐ کی سرپرستی آپؐ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔مگر ہجرت کے تین سال پہلے آپؐ کی زندگی کے مشکل ترین مرحلہ میں، ان کے لیے بھی موت کا پیغام آگیا۔

اگرچہ فطرت سے آپؐ نے بڑی شان دار شخصیت پائی تھی۔بچپن میں آپؐ کو دیکھنے والے کہہ اٹھتے: ان لھذا الغلام لشانا (اس لڑکے کا مستقبل عظیم ہے) جب بڑے ہوئے تو آپؐ کے شخصی رعب ووقار کا حال یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے الفاظ میں : من راہ بدیھۃ ھابہ ومن خالطہ احبہ (جو آپؐ کو پہلی بار دیکھتا مرعوب ہو جاتا، جو ساتھ بیٹھتا وہ آپؐ سے محبت کرنے لگتا) مگر چالیس سال کی عمر میں جب آپؐ نے دعوت نبوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو آپ کا دعویٰ اتنا حقیر معلوم ہوا کہ انھوں نے کہا : ھذا ابن ابی کبشۃ یکلم من السماء ۔ اس کا مطلب تھا: دیکھو یہ فلاں دیہاتی کا لڑکا۔وہ سمجھتا ہے کہ آسمان سے اس

کو وحی آتی ہے۔

آپ کی دعوتی جدو جہد کی کل مدت صرف 23 سال ہے ۔مگر اس انتہائی مختصر مدت میں عرب کے قبائل میں آپؐ نے ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی ۔اس انقلاب نے سو سال سے بھی کم عرصہ میں دنیا کی دو بڑی شہنشاہیتوں ،ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کوزیر کرلیا اور ایک طرف عراق وایران سے لے کر بخارا تک، دوسری طرف شام وفلسطین سے لے کر مصر اور پورے شمالی افریقہ تک کو فتح کرلیا۔ پھر یہ سیلاب مغربی سمت بڑھا اور 711ء میں جبرالٹر سے گزر کر اسپین اور پرتگال میں داخل ہو گیا۔ مغربی یورپ میں قافلہ اسلام کی پیش قدمی 732ء میں شاہ فرانس چارلس کارٹل نے تور کے مقام پر روک دی۔تاہم دو صدیوں تک یورپ کی صلیبی جنگوں اور اس کے بعد تاتاریوں کے بے پناہ حملوں کے باوجود پندرھویں صدی تک اس کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا، جب کہ انھوں نے اپنے اندرونی اختلاف کی وجہ سے اسپین کو کھو دیا۔

اس کے بعد اسلام کی اندرونی طاقت نے ترکوں اور مغلوں کو کھڑا کیا۔ترکوں نے 1453 میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ تک پہنچ گئے۔ وائنا کے سامنے 1683 تک ایک ترک فوج موجود تھی۔سولھویں صدی میں مغلوں نے برصغیر ہند اور افغانستان کے علاقہ میں اسلام کا اقتدار قائم کیا۔ تیرہ صدیوں کے بعد اس توسیع کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں مسلمان موجود ہیں ۔ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک تقریباً چار درجن ممالک کا ایک مسلم علاقہ بن چکا ہے۔موتمر عالم اسلامی کے شائع کردہ عالمی مسلم گزیٹیر (1975) کے مطابق آج دنیا بھر میں اہل اسلام کی تعداد 90 کروڑ ہے۔

یہ سب جو ہوا، اس 23 سالہ عمل کا نتیجہ تھا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں عرب میں انجام دیا گیا تھا۔ 23 سال کی مدت میں ایک ایسا انقلاب آنا جو نہ صرف تاریخ انسانی میں دائمی طور پر ثبت ہو جائے بلکہ خود اپنی ایک مستقل تاریخ پیدا کرے، کسی انسان کے بس کی چیز نہیں۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا اور اسی نے اس کو انجام دیا۔ بدر کی فتح کے بعد جب مسلمان واپس ہوئے تو روحاء کے مقام پر کچھ لوگ ملے جنھوں نے ان کو فتح کی مبارک

باددی۔ سلمہ بن سلامہ نے جواب دیا: تم لوگ کس چیز کی مبارک باددے رہے ہو۔ خدا کی قسم یہ تو گویا بندھے ہوئے اونٹ تھے جن کو ہم نے ذبح کردیا۔(**کالابل المعلقة فنحرناها**، تہذیب سیرۃ ابن ہشام۔ 153)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام سے پیشگی اس کے اسباب فراہم کردیئے تھے۔ عرب کے خشک جغرافیہ میں ایک ایسی قوم جمع کردی گئی جس میں صحرائی زندگی کے نتیجہ میں کردار کی صلابت غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی ۔ وہ اقرار اور انکار کے درمیان کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے، ان کے اندر وہ تمام فطری خصائص پوری طرح محفوظ تھے جو کسی تحریک کا مجاہد بننے کے لیے ضروری ہیں۔ پھر عرب کے جزیرہ نما کے گرد اس وقت کی دنیا کی دوسب سے بڑی سلطنتیں قائم کردی گئی تھیں، بالکل فطری تھا کہ وہ اپنے پڑوس میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو برداشت نہ کریں اور اس کے خلاف جارحیت کا آغاز کردیں۔ اس طرح ان کی جارحیت اہل اسلام کے لیے جواز فراہم کردے کہ وہ دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک ملکوں کو فتح کرتے چلے جائیں ۔ کیونکہ عملاً اس وقت تقریباً تمام دنیا انھیں دونوں جارح قوموں کا علاقہ تھی ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی لڑائیاں دوسروں کے خلاف جارحیت نہیں تھیں ۔ بلکہ یہ دوسروں کی جارحیت کا جواب تھا جو ہمیشہ تمام دنیا میں جائز سمجھا گیا ہے۔

اس طرح جو واقعات ظہور میں آئے ۔ ان کی اہمیت صرف سیاسی نہ تھی ۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ اس انقلاب کے ذریعہ انسانی تاریخ کے بند دروازے کو کھول دینا مقصود تھا۔ اس کے ذریعہ وہ انقلاب آنا تھا جو دین حق کو ایک تاریخی حقیقت بنادے، جو اس سے پہلے تاریخی واقعہ کی حیثیت حاصل کرنے سے محروم تھا۔ وہ پریس کا دور لے آئے جس کے بعد قرآن کی دائمی حفاظت کا انتظام ہوجائے۔ آزادی اور جمہوریت کا زمانہ آئے جو داعیان حق کے لیے حق کی اشاعت کی راہ سے تمام مصنوعی رکاوٹوں کو ہٹادے۔ اس سے طبیعیاتی علوم کی وہ دریافتیں ظاہر ہوں جو دین کی صداقت کو عقلیاتی سطح پر مدلل ومبرہن کردیں۔

اس انقلاب کا اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھا دیا۔ سچے لوگوں کو آپؐ کے ذریعہ غالب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی برتری حاصل کریں گے، اور برے لوگوں کو آپؐ کے ذریعہ مغلوب کر دیا گیا جو آخرت میں دائمی پستی اور مغلوبیت کا شکار رہیں گے۔

تاریخ کا یہ اندوہناک منظر ہے کہ خدا کے سچے پرستار یہاں ہمیشہ دبے اور پسے ہوئے نظر آتے ہیں، اور دولت اور اقتدار کو پوجنے والوں کو یہاں تفوق حاصل رہتا ہے۔ تمام انبیاء اور صلحاء کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ یہ صورت حال حقیقی صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ بالآخر جو ہونے والا ہے، وہ تو یہ کہ خدا اپنے پرستاروں کو دائمی عزت اور برتری عطا فرمائے گا اور جو لوگ اپنے نفس کی اور دنیا کی پوجا میں لگے رہے، ان کو ہمیشہ کے لیے ذلت اور رسوائی میں دھکیل دے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں لوگوں کو موقع ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس لیے یہاں خدا کسی کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ تاہم پیغمبر اسلام کے ذریعہ، کم از کم ایک بار، اس زمین پر وہ منظر ابتدائی شکل میں دکھا گیا ہے جو کامل اور دائمی صورت میں آخرت میں سامنے آنے والا ہے۔ آپؐ کے ساتھی جن کا حال یہ تھا کہ ان کے گھروں کو اجاڑ دیا گیا، جن کے لیے زمین کو تنگ بنا دیا گیا، جن کی معاشیات تباہ کر دی گئیں، جن کو اس قدر خوف و ہراس میں مبتلا کیا گیا کہ ان کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ لوگ انھیں اچک لیں گے -----ان کو عزت اور اقتدار کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ دوسری طرف قریش اور یہود، رومی اور ایرانی، یمنی اور غسانی جو دولت اور اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، ان کو ذلیل کر کے پستی کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔

ہر نبی جو خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ زمین پر خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی معرفت خدا اپنے ان فیصلوں سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے جس کو وہ آخرت میں براہ راست خود سنانے والا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کے ذریعہ یہ عدالت الٰہی ایسی خصوصی شکل میں ظاہر ہوئی کہ وہ خود تاریخ انسانی کا جزو بن گئی۔ جس طرح بہت سے دوسرے انسانی تجربات تاریخی حقیقت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، اسی طرح یہ واقعہ بھی ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت سے انسانی

معلومات میں ثبت ہو چکا ہے کہ خدا اپنے متقی بندوں کو سرفراز کرتا ہے اور جو لوگ سرکشی اختیار کریں، ان کو ذلت و بربادی کے دائمی عذاب میں دھکیل دیتا ہے۔ جنت اور جہنم اگرچہ دوسری دنیا میں قائم ہونے والی حقیقتیں ہیں، مگر انسان کی نصیحت کے لیے اللہ نے اس کا ایک ابتدائی منظر اسی دنیا میں لوگوں کو دکھا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت محمدی کا ظہور، خدا کی خدائی کا ظہور تھا، اسی لیے انجیل میں اس کو ''خدا کی بادشاہت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کی بلاشبہ سیاسی اور عمرانی اہمیت بھی ہے اور دوسری بہت سی اہمیتیں بھی۔ مگر اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا کے جلال کا مشاہدہ کراتا ہے۔ وہ خدا کی عدالت کا منظر دکھا رہا ہے، اس نے حقیقتوں کو آخرت سے پہلے انسان کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جن کو انسان آخرت میں اپنی کلی شکل میں دیکھے گا۔

باب دوم

انسانی کردار کا مثالی نمونہ

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم 22/اپریل 571ء کو عرب میں پیدا ہوئے اور 8/جون 632ء کو آپؐ کی وفات ہوئی۔ آپؐ نہایت تندرست اور طاقت ور تھے۔ بچپن سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا، کہہ اٹھتا: ان لهذا الغلام لشأنا۔ بڑے ہوئے تو آپؐ کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ آپؐ کو دیکھنے والے آپؐ سے مرعوب ہوجاتے۔ اسی کے ساتھ اتنے نرم اور زیریں زباں تھے کہ تھوڑی دیر بھی جو شخص آپؐ کے قریب رہتا، آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔ برداشت، سچائی، معاملہ فہمی، حسن سلوک آپؐ کے اندر کامل درجہ میں پایا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپؐ اس انسانی بلندی کی اعلیٰ ترین مثال تھے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (Balanced Personality) کہا جاتا ہے۔ داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپؐ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بااخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلم وبردبار، صادق وامین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش ودشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپؐ کی قوم نے آپؐ کا نام ''الامین'' رکھا تھا۔ (خصائص کبریٰ، جلد ا صفحہ ۹۱)

25 سال کی عمر میں جب آپؐ نے شادی کی تو اس موقع پر آپؐ کے چچا ابو طالب نے نکاح پڑھتے ہوئے کہا تھا:

ان ابن اخی محمد ابن عبد الله لا یوزن به رجل الارجح به شرفا و نبلا و فضلا و عقلا، وھو والله بعد ھذا له نبأ عظیم وخطر جلیل

''میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے، وہ شرافت، نجابت، بزرگی اور عقل میں اس سے بڑھ جائے گا۔ خدا کی قسم اس کا مستقبل عظیم ہوگا، اور اس کا رتبہ

بلند ہوگا۔

ابوطالب نے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں کہے تھے جن معنوں میں بعد کو تاریخ نے اسے سچا ثابت کیا۔ انھوں نے یہ بات تمام تر دنیوی معنوں میں کہی تھی ۔ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص فطرت سے وہ پُرکشش شخصیت لے کر پیدا ہوا ہو، جو محمد بن عبد اللہ میں نظر آتی ہے، وہ بہر حال قوم کے اندر معزز مقام حاصل کرتا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی بڑی قیمت مل کر رہتی ہے۔ ایسے شخص کی اعلیٰ صلاحتیں اس کی ترقی اور کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔

پیغمبر اسلام کے لیے یہ امکانات ،بلاشبہ ،پوری طرح موجود تھے ۔آپؐ اپنی صلاحیتوں کی بڑی سے بڑی دنیوی قیمت وصول کر سکتے تھے۔آپؐ مکہ کے ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اگر چہ آپؐ کو اپنے باپ سے وراثت میں صرف ایک اونٹنی اور ایک خادمہ ملی تھی۔ مگر آپؐ کی شاندار پیدائشی خصوصیات نے مکہ کی سب سے امیر خاتون کو متاثر کیا۔ 25سال کی عمر میں ان سے نکاح ہو گیا۔ یہ ایک تاجر خاندان کی بیوہ تھیں۔ ان سے آپؐ کو نہ صرف مال اور جائداد ملی، بلکہ عرب میں اور عرب کے باہر تجارت کا زبردست میدان بھی ہاتھ آیا۔ اب آپؐ کے لیے ایک پُرسکون اور کامیاب زندگی بنانے کے سارے مواقع فراہم ہو چکے تھے۔ مگر آپؐ نے ان کو چھوڑ کر ایک اور ہی چیز کو انتخاب کیا۔ آپؐ نے جانتے بوجھتے اپنے کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جو صرف دنیا کی بربادی کی طرف لے جاتی تھی ۔خدیجہ سے نکاح سے پہلے آپ اپنی گزر اوقات کے لیے کچھ معاشی کام کر لیتے تھے۔ اب وہ چھوٹ گیا، اب آپؐ ہمہ تن اس تلاش میں لگ گئے جس کی جستجو آپؐ کو بچپن سے تھی۔ یہ کہ سچائی کیا ہے۔ آپؐ گھنٹوں بیٹھے ہوئے زمین و آسمان پر غور کرتے رہتے۔ مکہ کے شرفاء میں اپنے تعلقات بڑھانے اور وہاں کی مجلسوں میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے بجائے آپؐ نے یہ کیا کہ صحراؤں اور پہاڑوں کو اپنا ہم نشین بنالیا۔ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں ایک کھوہ ہے جس کا نام حرا ہے۔ آپ ستو اور پانی لے کر وہاں چلے جاتے ۔ پہاڑ کے سنسان ماحول میں زندگی کی حقیقت پر غور کرتے ۔زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے سے دعائیں مانگتے کہ میرے رب! تو اپنے آپؐ کو میرے اوپر ظاہر کر دے۔ سچائی کیا ہے، مجھ کو بتادے۔

جب پانی کی مشک خالی ہوجاتی اورستوختم ہوجاتے توگھر واپس آتے تاکہ دوبارہ اسی طرح کھانے پینے کا سامان لے کر قدرت کے اس ماحول میں لوٹ جائیں جہاں صحرااور درخت تھے۔ پہاڑ اور آسمان کی پرسکون فضائیں تھیں۔آپؐ کی بے چین طبیعت انسانی ہنگاموں میں اپنے سوال کا جواب نہ پاسکی تھی۔اب آپؐ نے قدرت کی خاموش دنیا کو اپنا ہم نشین بنایا تھا کہ شاید وہ اس کا کچھ جواب دے سکے۔

جوانی کی طاقتوں سے بھرپور ایک شخص کے لیے اس قسم کی زندگی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ خوشی کے راستہ کو چھوڑ کر غم کے راستہ کو اپنانا تھا۔بیوی بچوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزارنا، تجارت کو ترقی دینااور سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانا، یہ تمام امکانات آپؐ کے لیے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔مگر آپؐ کی بے تاب اور متلاشی طبیعت ان چیزوں پر راضی ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔تمام چیزیں اس وقت تک آپؐ کو ہیچ معلوم ہوتی تھیں جب تک آپؐ زندگی کا راز معلوم نہ کرلیں۔آپؐ جاننا چاہتے تھے کہ ان ظاہری چیزوں سے اوپر اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ کیا ہے۔نفع نقصان اور آرام وتکلیف کی اصطلاحوں میں سوچنے کے بجائے آپؐ اس سوال کو حل کرنے میں منہمک رہتے کہ حق کیا اور ناحق کیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** (والضحیٰ) ضالّ کے معنی ہیں راہ بھولا ہوا، سرگرداں۔ **(ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضلّ فی شعاب مكة وهو صغير ثم رجع)** یہ لفظ اس مسافر کے لیے بولا جاتا ہے جو راستہ سے بھٹک گیا ہو اور حیران و پریشان مختلف راستوں کو دیکھ رہا ہو، اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کدھر جائے۔اسی لیے اس درخت کو ضالّہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔اسی سے کہا جاتا ہے **ضل الماء فی اللبن** (پانی دودھ میں کھوگیا) آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ جاہلیت کے بیابان میں اکیلے درخت کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔صحراؤں اور پہاڑوں میں یہ غم لیے پھرتے تھے کہ سچائی کیا ہے جس کو میں اپناؤں۔دنیا کے مروجہ نقشوں میں اپنی جگہ بنانے کے بجائے حیران و متفکر ہوکر الگ تھلگ جا پڑے تھے۔سچائی سے کمتر کوئی چیز آپؐ کی روح کے

لیے تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ حتیٰ کہ آپؐ کی تلاش حق کی سرگردانی اس نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ زندگی آپؐ کے لیے ایک ایسا بوجھ بن گئی جو آپؐ کی کمر توڑے دے رہی تھی۔ (الم نشرح)

اس وقت اللہ کی رحمت آپؐ کی طرف متوجہ ہوئی۔ آپؐ کے لیے ہدایت اور روشنی کے دروازے کھول دیئے گئے۔ 12 رفروری 610 کو جب آپ حرا میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے، خدا کا فرشتہ انسان کی صورت میں آپؐ کے سامنے ظاہر ہوا اور خدا کی طرف سے آپؐ کو وہ کلمات سکھائے جو قرآن کی سورہ نمبر 96 کی ابتدا میں درج ہیں۔ آپؐ کی تلاش نے بالآخر اپنا جواب پالیا۔

پیغمبر اسلام کی بے چین روح کا ربط رب العالمین سے قائم ہو گیا۔ خدا نے آپؐ کو نہ صرف ہدایت دی بلکہ اپنے نمائندہ خاص کی حیثیت سے چن لیا۔ آپؐ کے اوپر خدا کا کلام اترنے لگا۔ آپؐ کی نبوت کی یہ مدت 23 سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں خدا کی کتاب (قرآن) مکمل طور پر آپؐ کے اوپر اتاری گئی۔

پیغمبر اسلام نے اپنی مشکل زندگی کے چالیسویں سال میں سچائی دریافت کرلی۔ مگر یہ سچائی آپؐ کے لیے کوئی آسان سودا نہ تھی۔ اس سچائی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی ایک عظیم تر خدا کی زد میں ہے۔ یہ اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی کبریائی کی دریافت تھی یہ خدا کے اثبات کے مقابلہ میں اپنی نفی کا پتہ لگانا تھا۔ یہ اس راز کو معلوم کرنا تھا کہ اس دنیا میں بندۂ مومن کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔

سچائی کی دریافت کے بعد، پیغمبر اسلام کے لیے، زندگی کے معنے کیا تھے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ آپؐ نے ایک بار فرمایا:

امرنی ربی بتسع	میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے
خشیة اللہ فی السر والعلانیة	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں
وکلمة العدل فی الغضب والرضا	غصہ میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ انصاف کی بات کہوں
والقصد فی الفقر والغنا	محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں

وان اصل من قطعنی	جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
واعطی من حرمنی	جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں
واعفو من ظلمنی	جو مجھ پر ظلم کرے، میں اس کو معاف کردوں
وان یکون صمتی فکرا	اور میری خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو
ونطقی ذکرا	میرا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو
ونظری عبرۃ (رواہ رزین)	میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو

یہ محض تقریر یا گفتگو کے الفاظ نہ تھے۔ یہ خود آپؐ کی زندگی تھی جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی تھی۔ یہ حیرت انگیز حد تک موثر کلمات اور اس قدر پہنچی ہوئی باتیں ایک خالی انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتیں۔ یہ الفاظ تو خود بولنے والے کا مقام بتا رہے ہیں۔ وہ کہنے والے کے اندرون کو انڈیل رہے ہیں۔ وہ بولنے والے کی روح کو الفاظ کے آئینہ میں بے نقاب کر رہے ہیں۔

آپؐ کی زندگی اگرچہ نبوت ملنے سے پہلے بھی اسی قسم کی تھی۔ مگر وہ تمام تر فطرت کے زور پر تھی۔ اب سچائی کی دریافت نے اس کو شعور کا درجہ دے دیا۔ جو کردار اب تک طبعی تقاضے کے تحت ظاہر ہوتا تھا، اب وہ ایک سوچے سمجھے ذہن کا ارادی جزء بن گیا۔ یہ کسی بندۂ خدا کا وہ مقام ہے جہاں دنیوی تقاضے انتہائی حد تک گھٹ کر صرف بقدر حاجت رہ جاتے ہیں۔ آدمی کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم اسی ظاہری دنیا میں ہوتا ہے مگر نفسیاتی اعتبار سے وہ ایک اور دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے فرمایا:

وعلی العاقل مالم یکن مغلوبا علی عقله ان تکون له ساعات ساعة یناجی فیها ربه وساعة یحاسب فیها نفسه وساعة یتفکر فیها فی صنع الله وساعة یخلو فیها لحاجته من المطعم والمشرب (رواه ابن حبان فی صحیحه والحاکم وقال صحیح الاسناد عن ابی ذر الغفاری)

''عقلمند شخص کے لیے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے، ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے، ایسی گھڑی جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کررہا ہو۔ اور ایسی گھڑی جب کہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔''

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے جس کے روز وشب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا سے اتنا قریب کردیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے۔ کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر خالق کے جلوے نظر آنے لگیں۔ اس طرح گویا خدا سے ملاقات، اپنے آپ سے ملاقات اور کائنات سے ملاقات میں اس کے لمحات گزر رہے ہوں۔ اور بدرجہ حاجت وہ کسی وقت کھانے پینے کے لیے بھی اپنے کو فارغ کرلیا کرے۔

یہ الفاظ دور کے کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں۔ اس میں خود پیغمبر اسلام کی اپنی شخصیت بول رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کے ظاہری جسم کے اندر جو مومنانہ روح تھی اس میں ہر وقت کس قسم کے طوفان اٹھتے رہتے تھے۔ آپ ؐ کی زندگی کس قسم کی ''ساعات'' کے درمیان گزر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ کر رہا ہو، وہ کبھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کرسکتا۔ یہ ایک ایسی روح سے نکلے ہوئے کلمات ہیں جس نے ان کیفیات کو خود کمال درجہ میں پایا تھا جس کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں پر کھول رہا تھا۔

پیغمبر اسلام کو، وحی خداوندی ملنے سے پہلے، موجودہ دنیا اپنی کمیوں اور محدودیتوں کے ساتھ بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب آپ ؐ پر خدا نے اس حقیقت کو کھولا کہ اس دنیا کے سوا ایک اور دنیا ہے جو کامل اور ابدی ہے اور وہی انسان کی اصلی قیام گاہ ہے، تو زندگی اور کائنات دونوں آپ ؐ کے لیے بامعنی ہوگئے۔ اب آپ ؐ نے زندگی کی وہ سطح پالی جہاں آپ ؐ جی سکتے تھے، جس میں آپ ؐ اپنا دل لگا سکتے تھے۔ اب آپ ؐ کو ایک ایسی حقیقی دنیا مل گئی جس

سے اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کر سکیں، جس کے پیش نظر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔

یہی مطلب ہے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو آج کل کی اصطلاح میں آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) کہا جا سکتا ہے۔ ایسا آدمی، اپنے تصور حیات کے لازمی نتیجہ کے طور پر، آخرت کو اپنا اصل مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل نہیں، وہ صرف راستہ ہے۔ وہ آخرت کے مستقبل کی تیاری کا ایک ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس طرح ایک دنیا پرست آدمی کی تمام سرگرمیاں دنیوی مصالح کے گرد گھومتی ہیں، اسی طرح ایک بندہ خدا کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں اس کا رویہ اس فکر کے تحت بنتا ہے کہ آخرت میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ خوشی ہو یا غم، کامیابی ہو یا ناکامی، زبردستی کی حالت ہو یا زور آوری کی، تعریف کی جا رہی ہو یا تنقید، غصہ کا موقع ہو یا محبت کا، ہر حال میں آخرت کا خیال اس کا رہنما بنا رہتا ہے۔ حتّٰی کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ آخرت کا فکر اس کے لاشعور کا جزو بن جاتا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر اس کا ذہن انھیں امور میں چلتا ہے جو آخرت سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ جن باتوں میں آخرت کا کوئی پہلو نہ ہو ان سے اس کی دلچسپیاں اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات اس کو کہنا پڑتا ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو)

اس حقیقت کی حیثیت محض ایک علمی دریافت کی نہیں۔ اس کو پانے کے بعد آدمی کی جینے کی سطح بدل جاتی ہے۔ آدمی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال خود پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ آپؐ کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب تک جینے کی سطح نہ بدلے، عمل کی سطح نہیں بدل سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جب یہ حقیقت پائی تو وہ ان کی پوری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ جس جنت کی خبر آپؐ دوسروں کو دے رہے تھے، اس کے آپؐ خود سب سے زیادہ

حریص بن گئے اور جس جہنم سے دوسروں کو ڈرا رہے تھے، اس سے آپؐ خود سب سے زیادہ ڈرنے لگے۔ آپؐ کا یہ اندرونی طوفان بار بار دعا اور استغفار کی صورت میں آپؐ کی زبان سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ آپؐ کی جینے کی سطح عام انسانوں سے کس طرح مختلف تھی اس کا اندازہ چند واقعات سے ہوگا۔

عن امِّ سَلِمَۃَ ان النّبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی بیتہا فَدَعیٰ وصیفۃً لہٗ اولہا فأَبطأَتْ فَاستبانَ الغضبُ فی وجھہٖ فقامتْ امُّ سَلِمَۃَ اِلی الحجابِ فَوَجَدَتِ الوصیفۃَ تَلْعَبُ ومَعَہٗ سِوَاکٌ فَقَالَ لَولَاخَشْیَۃُ القَوَدِ یوم القیامۃِ لَاوجَعْتُكِ بِھذا السواك (الادب المفرد، قصاص العبد۔ صفحہ ۲۹)

''ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تھے آپؐ نے خادمہ کو بلایا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ آپؐ کے چہرہ پر غصہ ظاہر ہو گیا۔ اُم سلمہ نے پردہ کے پاس جا کر دیکھا تو خادمہ کو کھیلتے ہوئے پایا۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپؐ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر قیامت کے دن مجھے بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔''

بدر کی جنگ (رمضان 2 سنہ ھ) کے بعد جو لوگ قیدی بن کر آئے، وہ آپؐ کے بدترین دشمن تھے۔ مگر آپؐ نے ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو آتش بیان خطیب تھا اور تمام مجمعوں میں آپؐ کے خلاف بیہودہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر فاروقؓ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تا کہ آئندہ کے لیے اس کا تقریر کا جوش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

''خدا میرا چہرہ قیامت میں بگاڑ دے گا اگر چہ میں خدا کا رسول ہوں۔''

پیغمبر اسلام عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ خوشی کی بات سے آپؐ کو خوشی ہوتی تھی اور غم کی بات سے آپؐ غمگین ہوتے تھے۔ مگر آپؐ کی عبدیت آپؐ کو خدا کے مقرر کئے ہوئے دائرہ سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کی آخر عمر میں ماریہ قبطیہؓ سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا خوبصورت اور

تندرست تھا۔اس کا نام آپؐ نے اپنے بزرگ ترین جدامجد کے نام پر ابراہیم رکھا۔ابورافع نے جب ابراہیم کی پیدائش کی خبر دی تو آپؐ اتنا خوش ہوئے کہ ابورافع کو ایک غلام انعام میں دے دیا۔آپؐ ابراہیم کو گود میں لے کر کھلاتے اور پیار کرتے ۔عرب قاعدہ کے مطابق ابراہیم کو ایک دایہ ام بردہ بنت المنذربن زیدانصاری کے حوالے کیا گیا تا کہ وہ دودھ پلائیں۔ یہ دایہ ایک لوہار کی بیوی تھیں ۔ان کے چھوٹے سے گھر میں اکثر بھٹی کا دھواں ہوتا رہتا۔آپؐ لڑکے کو دیکھنے کے لیے لوہار کے گھر جاتے اور وہاں دھواں آپؐ کی آنکھ اور ناک میں گھستا رہتا اور آپؐ انتہائی نازک طبع ہونے کے باوجود اس کو برداشت کرتے ۔ ابراہیم ابھی دیڑھ سال کے ہوئے تھے کہ ہجرت کے دسویں سال (جنوری 632) میں ان کا انتقال ہو گیا۔آپؐ بیٹے کی موت کو دیکھ کر رونے لگے۔

ان واقعات میں پیغمبر اسلام ایک عام انسان کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات، ان کی حسرتیں ویسی ہی ہیں جیسی ایک عام باپ کی ہوتی ہیں۔مگر اس کے باوجود خدا کا دامن آپؐ کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔آپ غم زدہ ہیں مگر زبان سے نکل رہا ہے:

واللہ یاابراھیم انّابفراقك لمحزونون، تبکی العین ویحزن القلب ولانقول مایسخط الرب

’’خدا کی قسم اے ابراہیم تمھاری موت سے غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے، دل دکھی ہے، مگر ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جو رب کو ناپسند ہو۔‘‘

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا۔اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔قدیم زمانہ میں اعتقاد تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت سے ہوا کرتے ہیں۔اس کے اثر سے مدینہ کے مسلمان کہنے لگے کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔آپؐ کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔کیوں کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کے خلاف تھی۔آپؐ نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی، آپؐ نے فرمایا:

ان الشمس والقمر لایخسفان لموت احدمن الناس ولکنھا آیتان من آیات اللہ فاذارأیتموھافصلوا

سورج چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا۔ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے دونشانی ہیں۔ جب تو ایسا دیکھو تو نماز پڑھو۔

آپ کا ایک واقعہ تاریخ ان لفظوں میں بتاتی ہے:

روی انه کان فی سفر وامر اصحابه باصلاح شاة ،فقال رجل ، یارسول الله علیّ ذبحها ،وقال آخر علیّ سلخها ۔وقال آخر علیّ طبخها ۔ فقال علیه السلام وعلیّ جمع الحطب ،فقالوا یارسول الله نکفیك العمل ،قال علمت انکم تکفوننی ،ولکن اکره ان اتمیز علیکم ،ان الله سبحانه وتعالیٰ یکره من عبده ان یراه متمیزا بین اصحابه

ایک بار آپؐ سفر میں تھے۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے بکری تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایک شخص بولا: میں اس کو ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں اس کی کھال اتاروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں اس کو پکاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں لکڑی جمع کروں گا۔ لوگوں نے کہا، اے خدا کے رسول، ہم سب کام کرلیں گے۔ آپؐ نے فرمایا، میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کرلوگے۔ مگر میں امتیاز کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ کو یہ پسند نہیں کہ اس کا کوئی بندہ اپنے ساتھیوں کے درمیان امتیاز کے ساتھ رہے۔

آپؐ کی عبدیت کا یہ حال تھا کہ آپ نے فرمایا:

واللہ لاادری واللہ لاادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم (بخاری)

خدا کی قسم میں نہیں جانتا، خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں۔ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمھارے ساتھ۔

ابوذر غفاری بتاتے ہیں۔ ایک روز میں ایک مسلمان (صحابی) کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا رنگ کالا تھا۔ کسی ضرورت سے میں ان کو خطاب کیا تو میری زبان سے نکل گیا:

یاابن السوداء   اے کالے رنگ والے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو سخت ناپسند کیا اور فرمایا:

طفُّ الصاع ،طفُّ الصاع   پیمانہ پورا بھر، پیمانہ پورا بھر

یعنی سب کوایک پیمانہ سے دو۔ ایسانہ کروکہ کسی کواچھے الفاظ کے ساتھ خطاب کرواورکسی کوبرے الفاظ کے ساتھ انسان اورانسان کے درمیان امتیاز نہ کرو۔ پھرآپؐ نے فرمایا:

لیس لابن البیضاء علیٰ ابن السوداء فضل کسی گورے کوکسی کالے پرکوئی فضیلت نہیں۔

ابوذرغفاری کواس تنبیہہ کے بعدفی الفوراپنی غلطی کااحساس ہوا۔ وہ شدت خوف سے زمین پرلیٹ گئے اوراس شخص سے کہا: **قُم فَطأ علی خدّی** (کھڑاہو اورمیرے چہرےکواپنے پیروں سے مسل دے)

ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مال دارمسلمان کودیکھا کہ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک غریب مسلمان سے بچنے کی کوشش کررہاہے اوراپنے کپڑے سمیٹ رہاہے۔ آپ نےفرمایا:

اخشیت ان یعدوالیك فقرہ (غزالی ،احیاءعلوم الدین) کیاتم کوڈرہے کہ اس کی غریبی تم کولپٹ جائے گی۔

مدینہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہوچکی ہےاور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ داراعلیٰ ہیں۔اس زمانہ میں آپؐ کوایک بارایک یہودی سےقرض لینے کی ضرورت پیش آئی جس کانام زیدبن سعنہ تھا۔قرض کی ادائیگی کے لیے جومدت طے ہوئی تھی ،ابھی اس میں چنددن باقی تھےکہ یہودی تقاضا کرنے کے لیےآ گیا۔اس نے آپؐ کے کندھے کی چادر اتارلی اورکرتا پکڑکرسختی سے بولا:''میراقرض اداکرو۔'' پھرکہنے لگا۔عبدالمطلب کی اولاد بڑی نادہندہ ہے۔''

حضرت عمرفاروقؓ اس وقت آپؐ کےساتھ تھے،یہودی کی بدتمیزی پران کوسخت غصہ آگیا ،انھوں نے اس کوڈانٹا۔قریب تھاکہ اس کومارناشروع کردیں۔مگرپیغمبراسلام صرف مسکراتے رہے ۔یہودی سے صرف اتنا کہا: ابھی تووعدہ میں تین دن باقی ہیں **(لقدبقی من اجلہ ثلاث)** پھرعمرفاروقؓ سےفرمایا:

اناوھو کنا الیٰ غیر ھذا منك احوج یاعمر،تامرنی بحُسن القضاء وتامرہ بحسن التقاضی (رواہ البیہقی مفصلاً)

عمر! میں اور یہ یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ ضرورت مند تھے، مجھ سے تم بہتر ادائیگی کے لیے کہتے اور اس سے بہتر تقاضے کے لیے۔

پھر عمر فاروقؓ سے فرمایا جاؤ فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض ادا کردو۔ اور بیس صاع (تقریباً 40 کیلو) زیادہ دینا، کیونکہ تم نے اسے جھڑکا تھا۔

پیغمبر اسلام کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپؐ عرب سے لے کر فلسطین تک کے علاقہ کے حکمراں بن گئے۔ رسول اللہ ہونے کی وجہ سے آپؐ کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ آپؐ ایسے لوگوں کے درمیان تھے جو آپؐ کی عقیدت و تعظیم اتنی زیادہ کرتے تھے جو کبھی کسی انسان کی نہیں کی گئی۔ حدیبیہ کی بات چیت کے موقع پر عروہ بن مسعود قریش کے سفیر کی حیثیت سے آئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ آپؐ کا غسالہ زمین پر گرنے سے پہلے ہاتھ میں لے لیں اور اس کو تبرک کے طور پر جسم پر ملیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ انتہائی محبت کے باوجود ہم لوگ آنکھ بھر کر آپؐ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مغیرہؓ کہتے ہیں کسی صحابی کو آپؐ کی رہائش گاہ پر دستک دینے کی ضرورت ہوتی تو وہ ناخن سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ جابر بن سمرؓہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرخ چادر اوڑھ کر چاندنی رات میں سو رہے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا، کبھی آپؐ کو۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آپؐ چاند سے زیادہ خوش نما ہیں **(فاذا ھو احسن عندی من القمر)** حنین میں جب جنگ کے شروع میں مسلم فوج کو شکست ہوئی اور مخالف فوج نے آپؐ کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی تو آپؐ کے ساتھیوں نے آپؐ کو گھیرے میں لے لیا، وہ سارے تیر اپنے ہاتھ اور جسم پر اس طرح روکتے رہے جیسے وہ انسان نہیں، لکڑی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ساتھیوں کا یہ حال ہوا کہ ان کے جسم پر ساہی کے کانٹے کی طرح تیر لٹکنے لگے تھے۔

اس قسم کا مرتبہ اور عقیدت آدمی کے مزاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے

بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ مگر آپؐ لوگوں کے درمیان بالکل عام انسان کی طرح رہتے۔ کوئی تلخ تنقید یا اشتعال انگیز رویہ آپؐ کو آپ سے باہر کرنے والا ثابت نہ ہوتا۔ صحیحین میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی آیا۔ اس نے آپؐ کی چادر کو زور سے کھینچا جس کی وجہ سے آپؐ کی گردن میں نشان پڑ گیا۔ پھر بولا: ''محمد! میرے یہ دو اونٹ ہیں۔ ان کی لاد کا سامان مجھے دو۔ کیونکہ جو مال تیرے پاس ہے، وہ نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے۔'' آپؐ نے فرمایا مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا عبد ہوں۔ پھر دیہاتی سے پوچھا ''جو برتاؤ تم نے مجھ سے کیا، اس پر تم ڈرتے نہیں۔'' وہ بولا نہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیوں۔ اس نے کہا، مجھے معلوم ہے کہ تم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ آپؐ یہ سن کر ہنس پڑے اور حکم دیا کہ دیہاتی کو ایک اونٹ کا بوجھ جو، اور ایک کی کھجوریں دی جائیں۔

آپؐ پر خدا کی ہیبت اتنی طاری رہتی کہ آپؐ بالکل عجز اور بندگی کی تصویر بنے رہتے تھے۔ بہت کم بولتے، چلتے تو جھک کر چلتے۔ تنقید سے کبھی خفا نہ ہوتے۔ کپڑا پہنتے تو فرماتے کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں (انما انا عبد البس کما یلبس العبد) کھانا کھاتے تو ادب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور فرماتے کہ میں بندوں کی طرح کھانا کھاتا ہوں: (انا آکل کما یاکل العبد)

اس معاملہ میں آپؐ کے نزاکت احساس کا عالم یہ تھا کہ آپؐ کے ایک ساتھی نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا: ماشاء اللہ وماشئت (جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں) یہ سنتے ہی آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپؐ نے درشتی کے ساتھ فرمایا: اجعلتنی لِلّٰہِ نِدًّا (کیا تو نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) تم کو اس طرح کہنا چاہئے: ماشاء اللہ وحدہ (وہ ہوگا جو اللہ چاہے) اسی طرح ایک صحابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا: من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوی جو اللہ اور رسولؐ کی طاعت کرے وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے۔

آپؐ نے یہ سن کر فرمایا: بئس خطیب القوم انت (تو قوم کا برا خطیب ہے) آپؐ نے پسند نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول کو تثنیہ کی ایک ضمیر میں جمع کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے ۔ چار صاحبزادیاں بڑی عمر کو پہنچیں ۔ چاروں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں ۔حضرت فاطمہؓ آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزاری تھیں ۔آپؐ حضرت فاطمہ سے بے حد محبت کرتے تھے ۔ کسی سفر سے واپس لوٹتے تو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے ۔ان کے ہاتھ اور پیشانی کو چومتے ۔حضرت عائشہؓ سے جمیع بن عمیر صحابی نے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا۔انھوں نے جواب دیا ''فاطمہؓ ''

مگر پیغمبر اسلام کی پوری زندگی آخرت میں ڈھل گئی تھی ۔اس لیے اولاد سے محبت کا مفہوم بھی آپؐ کے یہاں دوسرا تھا۔ایک روایت جونسائی کے سوا دوسری تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے، یہ ہے کہ علی مرتضیٰؓ نے ایک بار ابن عبدالواحد سے فرمایا۔میں تجھ کو فاطمہ بنت رسولؐ کی ایک بات سناؤں جو سارے کنبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں ۔ابن عبدالواحد نے کہا، ہاں ۔

حضرت علیؓ نے کہا۔فاطمہؓ کا یہ حال تھا کہ چکی پیستیں تو ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے ۔ پانی کی مشک اٹھانے کی وجہ سے گردن میں نشان پڑ گیا تھا۔جھاڑو دیتیں تو کپڑے میلے ہو جاتے ۔انھیں دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے ۔میں نے فاطمہؓ سے کہا، تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور اپنے لیے ایک خادم مانگو۔فاطمہؓ گئیں ۔مگر وہاں ہجوم تھا مل نہ سکیں ۔اگلے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آئے اور پوچھا کہ کیا ضرورت تھی ۔فاطمہؓ چپ ہو گئیں ۔میں نے قصہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے ان کو کہلا بھیجا تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے کے بعد فرمایا:

اتقی اللہ یافاطمہ وادّی فریضۃ ربك واعمل عمل اھلكِ واذا اخذتِ مضجعك فسبحی ثلثا وثلاثین واحمدی ثلاثا وثلاثین و کبّری اربعا وثلاثین ،فذالك مائۃ،ھی خیرلك من خادم ۔

''اے فاطمہ خدا سے ڈرو۔اپنے رب کے فرائض ادا کرو، اپنے گھر والوں کے کام

کرو۔ جب بستر پر جاؤ تو 33 بار خدا کی تسبیح کرو، 33 بار خدا کی حمد کرو۔ 34 بار خدا کی تکبیر کرو۔ یہ پورا سو ہو گیا۔ یہ تمھارے لیے خادم سے بہتر ہے۔''

حضرت فاطمہؓ نے یہ سن کر کہا **رضیت عن اللہ وعن رسولہ** (میں خدا اور رسول سے اس پر خوش ہوں) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بس یہ جواب دیا اور فاطمہ کو خادم نہیں دیا۔ **(ولم یخدمھا)**

پیغمبر اسلام پر جو حقیقت کھولی گئی، وہ یہ تھی کہ یہ عالم بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک خدا ہے اور وہی اس کا خالق اور مالک ہے۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اسی کے سامنے بالآخر جواب دہ ہیں۔ مرنے کے بعد آدمی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ دوسری دنیا میں اپنی مستقل زندگی شروع کرنے کے لیے داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں نیک آدمیوں کے لیے جنت کا آرام ہے اور برے لوگوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

خدا نے جب آپؐ کو اس حقیقت کا علم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ سارے انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو۔ مکہ کے کنارے صفا نام کی ایک چٹان تھی جو اس زمانہ میں عوامی اجتماعات کے لیے قدرتی اسٹیج کا کام دیتی تھی۔ آپؐ نے صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے تقریر کی۔ آپؐ نے خدا کی عظمت بیان کرنے کے بعد کہا:

واللہ لتموتُنّ کما تنامون ولتُبعثُنّ کما تستیقظون۔ وَلَتُحاسَبُنَّ بما تعملُون وَلَتُجزَوُنَّ بِالاحسانِ احسانًا وبالسوءِ سوءً اوانھا الجنۃُ اَبَدًا او لنارٌ ابدًا (جمھرۃ خطب العرب)

''خدا کی قسم تمھیں مرنا ہے جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تم کو اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو اور ضرور تم سے حساب لیا جائے گا جو تم کرتے ہو اور پھر اچھے کام کا اچھا بدلہ ہے اور برے کا برا بدلہ اور اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے باغ ہے یا ہمیشہ کے لیے آگ۔''

زمانہ کے خلاف کسی طریقہ کو آدمی صرف ذاتی طور پر اختیار کرے، اس وقت بھی اگرچہ قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی ہیں، تاہم یہ مشکلیں جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتیں۔ یہ مشکلیں آدمی کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ مگر وہ آدمی کے جسم کو زخمی نہیں کرتیں۔ یہ زیادہ

سے زیادہ آدمی کے خاموش صبر کا امتحان ہوتی ہیں۔مگر اس وقت صورت حال بالکل بدل جاتی ہے جب آدمی زمانہ کے خلاف ایک آواز کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے ، جب وہ دوسروں سے کہنے لگے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔پیغمبر اسلام صرف ایک بندۂ مومن نہ تھے بلکہ پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کا مشن بھی آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔آپؐ کی اس دوسری حیثیت نے آپؐ کو پوری عرب قوم سے ٹکرا دیا۔ فاقہ سے لے کر جنگ تک سخت ترین حالات پیش آئے۔مگر 23 سال کی پوری زندگی میں آپؐ مکمل طور پر انصاف اور تقویٰ پر قائم رہے۔اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپؐ کے اندر انسانی جذبات نہیں تھے،اصل یہ ہے کہ خدا کے خوف نے آپؐ کو پابند بنا رکھا تھا۔

ہجرت کے تیسرے سال مکہ کے مخالفین نے مدینہ پر چڑھائی کی اور وہ معرکہ پیش آیا جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے اس جنگ میں ابتدائً مسلمانوں نے فتح پائی۔مگر اس کے بعد آپؐ کے بعض ساتھیوں کی غلطی سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے پیچھے سے حملہ کر کے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔آپؐ کے اکثر ساتھی میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ آپؐ مسلح دشمنوں کے نرغہ میں تنہا ہو گئے۔مخالف ہجوم بھوکے بھیڑیئے کی طرح آپؐ کی طرف بڑھ رہا تھا۔آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا الیّ عباد اللہ (خدا کے بندوں میری طرف آؤ)من رجلٌ یشری لنا نفسَہ (کون ہے جو ہمارے لیے اپنی جان قربان کرے) کون ہے جو ان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے،وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم)

وہ کیسا ہولناک سماں ہوگا۔ جب خدا کے رسولؐ کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکل رہے تھے۔اگرچہ آپؐ کے ساتھیوں میں سے ایک تعداد نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہی۔مگر اس وقت اتنا انتشار کا عالم تھا کہ آپ کے جاں نثار بھی آپؐ کو پوری طرح بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔عتبہ ابن ابی وقاص نے آپؐ کے اوپر ایک پتھر پھینکا۔یہ پتھر آپؐ کو اتنے زور سے لگا کہ ہونٹ کچل گئے اور نیچے کے دانت ٹوٹ گئے۔عبد اللہ ابن قمیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا۔اس نے آپؐ پر شدید حملہ کیا۔جس کے نتیجہ میں لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپؐ کے

رخسار میں گھس گئیں۔ یہ کڑیاں اتنی گہرائی تک گھسی تھیں کہ ابوعبیدہ بن الجراح نے جب ان کو نکالنے کے لیے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ابوعبیدہؓ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ایک اور شخص عبداللہ بن شہاب زہری نے آپؐ کو پتھر مارا جس سے آپؐ کی پیشانی زخمی ہوگئی۔ مسلسل خون بہنے سے آپؐ بے حد کمزور ہو گئے۔ حتّٰی کہ آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ میدان میں جب آپؐ دیر تک نظر نہیں آئے تو مشہور ہو گیا کہ آپؐ شہید ہو گئے۔ اس دوران میں آپؐ کے ایک صحابی کی نظر گڑھے کی طرف گئی وہ آپؐ کو دیکھ کر خوشی میں بول پڑے: ''رسول اللہ یہاں ہیں۔'' آپؐ نے انگلی کے اشارے سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو۔ دشمنوں کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہونے دو۔ **(فاشار الیه الرسول ان اصمت، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، محمد الخضری، صفحہ ۱۳۰)**

ایسے خوفناک حالات میں آپؐ کی زبان سے قریش کے بعض سرداروں (صفوان، سہیل، حارث) کے لیے بددعا کے الفاظ نکل گئے۔ آپؐ نے کہا: **کیف یفلح قوم شجو نبیھم** (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے) آپؐ کی زبان سے اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ اور جبریل خدا کی طرف سے یہ وحی لے کر آ گئے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ۔ (آل عمران۔ 128) تم کو معاملہ کا کوئی اختیار نہیں۔ خدا یا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا۔ کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔

خدا کی طرف سے اتنی تنبیہہ کافی تھی۔ فوراً آپؐ کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آپؐ زخمیوں سے نڈھال ہیں۔ مگر ظالموں کے حق میں ہدایت کی دعا فرما رہے ہیں۔ آپؐ کے ایک ساتھی عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ''اس وقت بھی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے ہیں۔ آپؐ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں:

رب اغفر لی قومی فانھم لا یعلمون (مسلم، غزوہ احد، جلد ۲، صفحہ 108)

خدا یا میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ نہیں جانتے۔ اوپر جو واقعات نقل کئے گئے، وہ اس قسم کے ان بے شمار واقعات میں سے صرف چند ہیں جو حدیث اور سیرت کی

کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کس طرح انسانی کردار کا معیاری نمونہ تھی۔ یہ واقعات عمل کی زبان میں یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کو ہر حال میں خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہئے خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا تقاضا ہے کہ بندے کے دل میں ہر وقت خدا کا اور اس کی آخرت کا طوفان برپا رہے ساری کائنات اس کے لیے یاد الٰہی کا دسترخوان بن جائے۔ وہ ہر واقعہ کو خدا کی نظر سے دیکھے اور ہر چیز میں خدا کا نشان پالے۔ دنیا میں کوئی معاملہ کرتے وقت وہ کبھی یہ نہ بھولے کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں جانے والا ہے۔ جہنم کا خوف اس کو انسانوں سے تواضع اختیار کرنے پر مجبور کرے اور جنت کا شوق دنیا کو اس کی نظر میں بے حقیقت بنادے۔ خدا کی بڑائی کا خیال اس کے ذہن پر اس قدر چھا جائے کہ اپنی بڑائی کا کوئی بھی مظاہرہ اس کو مضحکہ خیز دکھائی دینے لگے۔ کوئی تنقید اس کو مشتعل نہ کرے اور کوئی تعریف اس کے ذہن کو بگاڑنے والی ثابت نہ ہو ـــــ یہ ہے انسانی کردار کا وہ نمونہ جو خدا کے رسولؐ نے اپنے عمل سے ہمیں بتایا ہے۔

نوٹ : 8 رمئی 1977 کو چندی گڑھ میں ایک سیرت کانفرنس ہوئی جس میں مقامی غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر یہ مقالہ بہ شکل تقریر پیش کیا گیا۔

پیغمبرانہ طریقِ کار

اسلام کا آغاز 610ء میں ہوا جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (632_570) پر پہلی وحی اتری۔ اس وقت آپؐ ساری دنیا میں تنہا مومن و مسلم تھے۔ 622ء میں آپؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ اس وقت یہ اسلامی مملکت ایک چھوٹے سے شہر کے صرف چند حصوں پر مشتمل تھی۔ کیونکہ مدینہ کا بیشتر حصہ یہودیوں یا اب تک اسلام نہ لائے ہوئے عربوں کے قبضہ میں تھا۔ مگر اس کے گیارہ سال بعد جب پیغمبر اسلام کی وفات ہوئی تو اسلامی مملکت تقریباً دس لاکھ مربع میل (پورے عرب اور جنوبی فلسطین) پر پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد سو برس سے بھی کم عرصہ میں اسلام ایک طرف شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین اور دوسری طرف ایران کے راستے سے چین کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ مشرقی یورپ میں اسلام کی پیش قدمی کی آخری حد بوڈاپسٹ (ہنگری) تھی جہاں آج بھی دریائے دانوب کے کنارے ''گل بابا'' کا ترکی طرز کا مزار نشانی کا کام دے رہا ہے۔ فرانس کے بعض گرجاؤں کے مناروں میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جن پر عربی عبارتیں کندہ ہیں۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی کی یادگار ہے جب کہ فرانس کا جنوبی علاقہ خلیفہ دمشق کا یورپین صوبہ تھا۔ پیغمبر عربی کی امت نے شتربانی کے مقام سے آغاز کر کے ہجرت کے صرف دو سو برس بعد یہ حیثیت حاصل کر لی تھی کہ وہ دنیا کے امام بن گئے۔ ایران کے اصطخر، مصر کے زمیس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا فکری و تمدنی مرکز بغداد تھا۔

یہ شان دار کامیابی ایک انتہائی سادہ پروگرام کے ذریعہ حاصل ہوئی جو قرآن کے لفظوں میں حسب ذیل تھا۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿٥﴾ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ﴿٦﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿٧﴾ (سورۃ المدثر، آیت: 1 تا 7)

اے کپڑا اوڑھنے والے اُٹھ، لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ اور اپنے اخلاق کو اچھا بنا۔ اور گندی باتوں کو چھوڑ دے اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ چاہے اور

اپنے رب کے لیے صبر کر۔

اس پروگرام کا خلاصہ کریں تو اس کے صرف تین نکات قرار پائیں گے۔ (۱)

1۔ ذاتی اصلاح، اس طرح کہ خدا کی عبادت کی جائے، اپنے اخلاق کو درست کیا جائے اور ہر قسم کے برے کاموں کو چھوڑ دیا جائے۔
2۔ انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے اور مرنے کے بعد اسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔
3۔ اپنی اصلاح اور دوسروں کو آگاہی دینے کی اس جدوجہد میں جو مشکلات و مصائب پیش آئیں ان پر صبر کرتے ہوئے خدا کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے۔

اندرونی طاقت

اسلامی جدوجہد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک ذاتی جدوجہد ہے۔ ایک بندۂ مومن کو جو چیز متحرک کرتی ہے وہ تمام تر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے یہاں نجات حاصل کر سکے۔ اسلام جب کسی کے دل میں حقیقی طور پر جگہ کرتا ہے تو اس کے تمام جذبات اس ایک سوال پر مرکوز ہو جاتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے رب کی رحمت و مغفرت میں حصّہ دار بنے۔ وہ اپنے خیالات، عقائد اخلاق، اعمال اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کو ایسے رخ پر ڈالنے کے لیے فکر مند ہو جاتا ہے جو اس کو آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچا سکیں۔ وہ دوسروں کو اسلام کی طرف بلانے سے پہلے خود اول المسلمین بنتا ہے:

---

(۱) ابودردؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الا اُنبّئکم بخیر اعمالکم وازکاھا ملیکِکم وارفعھا فی درجاتکم وخیرٍ لکم من انفاق الذھب والفضة وخیرٍ لکم من ان تَلقَوا عدوکم فتضربوا اعناقھم ویضربوا اعناقکم، قالوا بلی، قال: ذکر اللہ تعالیٰ (رواہ الترمذی) اس طرح کی روایات کو لے کر کوئی شخص کہے کہ عبادت اور انفاق اور جہاد کی زیادہ ضرورت نہیں۔ کلمات ذکر کو صبح شام پر تسبیح پڑھ لیا کرو، خدا کے یہاں بلند درجہ پالو گے تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ حکیمانہ کلام ہے اور حکیمانہ کلام کو حکیمانہ مطالعہ سے سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ منطقی مطالعہ سے ___ اسلام کے تفکیری مطالعہ میں اس اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (انعام۔14)

”کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں۔“

اول المسلمین بننا، باعتبار محرک، ایک انتہائی انفرادی واقعہ ہے۔ مگر باعتبار نتائج وہ وسیع ترین اجتماعی واقعہ بن جاتا ہے۔ یہ گویا اپنے اندر آتش فشاں کی تعمیر کرنا ہے جو بظاہر نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے مگر جب پھٹتا ہے تو سارے ماحول بلکہ سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ قرآن کے نزول کی یہ ترتیب کی ابتدائی عرصہ تک وہ سورتیں اترتی رہیں جن میں اندرونی اصلاح پر زور دیا گیا تھا، بیرونی اصلاح سے متعلق احکام بعد کو اترے، اس کی توجیہہ کرتے ہوئے محمد مارماڈیوک پکتھال (1936۔1875) نے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کے اندر ایک گہری معنویت ہے اور وہ یہ کہ پیغمبر کا الہام اندرونی چیزوں سے شروع ہو کر بیرونی چیزوں کی طرف آتا ہے:

The inspiration of the prophet progressed from inmost thing to outward things.

اکثر لوگ عمل کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خارجی دنیا کے خلاف یورش شروع کر دی جائے۔ مگر زیادہ گہرا عمل یہ ہے کہ خود اپنے اندرون کو اتنا طاقت ور بنایا جائے کہ جب وہ پھٹے تو کوئی چیز اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اندرون کو طاقت ور بنانے سے مراد کوئی روحانی ورزش یا ”عملیات“ نہیں ہیں بلکہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں ایمان اور عمل صالح اور صبر کہا گیا ہے۔ اپنی روح اور اپنے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں خدائی حقیقتوں کو اتارنا، اپنے آپ کو حسیاتی طور پر زیادہ سے زیادہ عالم بالا سے جوڑنا، اپنے کو مکمل طور پر اس قالب میں ڈھال لینا کہ ”میرا کسی کے اوپر کوئی حق نہیں، میری اس دنیا میں صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں“ راہ خدا میں جو کچھ پیش آئے، اس کو خاموشی سے اپنے اوپر لیتے رہنا، بجائے اس کے کہ اس کو دوسروں کے اوپر لوٹانے کی کوشش کی جائے۔ بس یہی وہ چیزیں ہیں جن کا نام اپنے اندرون کو طاقت ور بنانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کا انتہائی مکمل نمونہ بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی شخصیت اتنی بے پناہ ہوگئی کہ جو آپؐ کی زد میں آیا مسخر ہو کر

رہ گیا ۔آپؐ کا یہ اندرونی طوفان جب پھٹا تو وہ اتنا بے پناہ ثابت ہوا کہ تقریباً ساری آباد دنیا نے اس کے اثرات محسوس کئے۔

ہندی کے ادیب سردار پورن سنگھ (1931۔1882ء) کے ایک مقالہ کا عنوان ہے ''بیرتا''اس میں انھوں نے پیغمبرؐ اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا بیر (بہادر) بتایا ہے جو ''عرب کے ریگستان میں بارود کی طرح آگ لگا گئے،''کُل پرتھوی بھے سے کانپ اٹھی'' جو لوگ ان کے سامنے آئے وے ان کے داس بن گئے۔'' وہ بیرتا کیا ہے جو کسی کو اتنا بل والا بنا دیتی ہے،انھیں کے الفاظ میں پڑھئے:

''اپنے آپ کو ہر گھڑی ہر پل مہان سے مہان بنانے کا نام بیرتا ہے،کایر پرش کہتے ہیں''آگے بڑھے چلو'' بیر کہتے ہیں''پیچھے ہٹ چلو'' کایر کہتے ہیں''اٹھاؤ تلوار'' بیر کہتے ہیں ''سر آگے کرو'' بیروں کی پالیسی بل کو ہر طرح اکٹھا کرنے اور بڑھانے کی ہوتی ہے۔ بیر تو اپنے اندر ہی اندر مارچ کرتے ہیں۔کیونکہ ہردے آکاش کے کیندر میں کھڑے ہو کر وے کل سنسار کو ہلا سکتے ہیں۔ بیر وہ بیر کیا جوٹن کے برتن کی طرح جھٹ گرم اور جھٹ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔صدیوں نیچے آگ جلتی رہے تو بھی شاید ہی بیر گرم ہو،اور ہزاروں ورش برف اس پر جمتی رہے تو بھی کیا مجال جو اس کی بانی تک ٹھنڈی ہو۔لوگ کہتے ہیں'' کام کرو کام کرو'' پر ہمیں تو یہ باتیں نررتھک معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے کام کرنے کا بل پیدا کرو۔اپنے اندر ہی اندر برکچھ کی طرح بڑھو۔دنیا کسی کوڑے سے ڈھیر پر نہیں کھڑی کہ جس مرغ نے بانگ دی وہی سدھ ہو گیا۔دنیا دھرم اور اٹل آدھیاتمک نیموں پر کھڑی ہے، جو اپنے آپ کو ان نیموں کے ساتھ ابھید کر کے کھڑا ہوا وہ وجئی ہو گیا۔'' (نبندھ چینیکا،مرتبہ مہندر چتر ویدی)

اس ''بیرتا'' یا اندرونی طاقت کا راز پراسرار عملیات یا روحانی ورزشیں نہیں ہیں جو کونوں یا گوشوں میں بیٹھ کر کی جاتی ہیں۔''عملیات'' کے ذریعہ جو طاقت حاصل ہوتی ہے وہ جمادات وحیوانات کی دنیا میں کچھ چمتکار دکھا سکتی ہے۔مگر زندگی کے مقابلوں میں وہ ایک دن بھی انسان کے کام نہیں آتی۔جب کہ حقیقی طاقت وہی ہے جو زندگی کے مقابلوں میں آدمی کو فاتح بنائے۔

اندرونی طاقت دراصل اس بات کا نام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو نفسانی عواطف سے آزاد کر کے اس بلند تر ذہنی سطح پر پہنچا دے جہاں اس کے فیصلوں میں دوسرے اعتبارات (Considerations) کی کارفرمائی ختم ہو جائے اور حدیث کے الفاظ وہ'' ارنا الاشیاء کماھی '' کا مقام حاصل کرلے۔ ضد، غصّہ، طمع، نفرت، جاہ طبی، خویش پروری، ذاتی مفاد اور اس قسم کے دوسرے میلانات کا ہالہ اس کے گرد اس کی رایوں اور اقدامات کو متاثر کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔ ایسا شخص بے پناہ قوت تسخیر کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ ہر جانچ میں پورا اترتا ہے اس کے اقدامات ہر مقابلے میں لوہے کا ہتھوڑا ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے فیصلوں میں مسئلہ کے تمام متوقع اور غیر متوقع پہلوؤں کی رعایت شامل ہوتی ہے۔ مخالفین اس کی صداقت اور صلاحیت کو اور زیادہ نکھارنے والی بن جاتی ہیں۔

یہاں ہم فتح مکہ کے فوراً بعد پیش آنے والی ایک صورت حال کا ذکر کریں گے جس نے بیک وقت کئی مسئلے پیدا کئے مگر پیغمبر اسلام کی بیرتا یا آپ کی اندرونی طاقت ہر ایک کو حل کرتی چلی گئی۔ اس اندرونی طاقت کا اظہار کہیں عفو کی صورت میں، ہوا، کہیں عالی حوصلگی اور اعتماد علی اللہ کی صورت میں۔ کہیں آپ اس لیے کامیاب رہے کہ آپ کو وہ نگاہ حاصل ہو گئی تھی جو ہمیشہ مستقبل کو دیکھتی تھی۔ کہیں آپ کے رویہ نے یہ ثابت کیا کہ جو اپنے کو بے غرض بنا لے وہ اتنا بے پناہ ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

ہجرت کے آٹھویں سال جب آپ نے مکہ پر قبضہ کیا تو قریش کے کچھ لوگ بھاگ کر ہوازن وثقیف کے قبائل میں پہنچے اور ان کو اکسا کر ایک نئی لڑائی کے لیے آمادہ کر دیا۔ وہ لوگ اپنی تمام قبائلی شاخوں کو اکھٹا کر کے 20 ہزار کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ حنین میں مقابلہ ہوا۔ جنگ کے آغاز ہی میں ہوازن کے تیراندازوں نے جو گھاٹی میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے، اسلامی لشکر پر اتنی شدید تیراندازی کی کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور 12 ہزار لشکر میں گیارہ ہزار سے بھی زیادہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تاہم تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ابتدائی شکست کے بعد بالآخر مسلمانوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی کا راز پیغمبر کا وہی اندرون تھا جو اس نازک موقع پر سکینت قلب (توبہ۔36) اور اعتماد علی اللہ کی

صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اس نے دفعتاً بازی لوٹا دی۔ آپؐ نے دشمنوں کے عین نرغہ میں کھڑے ہو کر یہ رجز پڑھا:

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

آپؐ نے پکار کر کہا: الیّ عبادَ اللہ (خدا کے بندو میری طرف آؤ) حضرت عباسؓ کی آواز بہت بلند تھی، آپؐ کے حکم سے انھوں نے چلا کر کہا۔ ''اے شجرہ الرضوان کے سایہ میں بیٹھ کر بیعت کرنے والو کہاں ہو۔'' جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کا سردار اپنی جگہ قائم ہے اور دشمنوں کی یلغار آپؐ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی تو انھیں یقین ہو گیا کہ خدا کی مدد آپؐ کے ساتھ ہے۔ وہ نئے عزم کے ساتھ میدان جنگ کی طرف لوٹ پڑے۔ حتّٰی کہ جس کے اونٹ نے مڑنے میں دیر کی، وہ اپنی سواری سے کود کر پیدل آپؐ کی طرف دوڑ پڑا۔ اب جنگ کا نقشہ دوسرا تھا۔ فریق مخالف کی صفوں میں بھگدڑ رچ گئی۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کثیر مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا، جس میں 24 ہزار اونٹ، 40 ہزار بکریاں، 4 ہزار اوقیہ چاندی اور 6 ہزار قیدی تھے۔

اس فتح کے باوجود مسئلہ نے دوبارہ نئی شدید تر شکل اختیار کر لی۔ قبیلہ ثقیف، جو قریش کے بعد عرب کا دوسرا سب سے زیادہ زور آور قبیلہ تھا اور عرب کے واحد محصور شہر کا مالک تھا، طائف میں قلعہ بند ہو گیا۔ تین ہفتہ کے محاصرہ میں انھوں نے مسلمانوں کو اس سے زیادہ جانی نقصان پہنچایا جو حنین کی جنگ میں انھیں پہنچا تھا۔ ان کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ اس دوران طائف کا ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لایا۔ یہ عروہ بن مسعود ثقفیؓ تھے جو اپنے قبیلہ میں ''کنواری لڑکیوں کی طرح محبوب'' تھے۔ مگر جب وہ اسلام قبول کر کے طائف گئے تو طائف والوں نے انھیں مار مار کر ہلاک کر دیا۔

یہاں آپؐ کی اندرونی طاقت ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی۔ جب محاصرہ شدید ہو گیا۔ تو حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپؐ طائف والوں کے لیے ہلاکت کی دعا فرمائیں۔ مگر آپؐ نے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔ آپؐ نے غصّہ اور انتقام کے جذبہ کے تحت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ تین ہفتہ کے بعد فوج کو حکم دیا کہ واپس

چلو۔اب آپؐ مقام جعرانہ پہنچے جہاں غزوہ حنین کا مال غنیمت جمع تھا۔ یہاں آپؐ کے لیے موقع تھا کہ ثقیف کی سرکشی کا بدلہ ان کے حلیف ہوازن سے لیں۔ مگراس کے برعکس آپؐ نے یہ کیا کہ قبیلہ ہوازن کے بعض لوگوں کی ایک درخواست پران کے تمام کے تمام چھ ہزار قیدی چھوڑ دیئے اورانھیں کپڑے اورزادِراہ کے ساتھ ان کے گھروں کورخصت کیا۔ فیاضی اوروسعت ظرف کا یہ معاملہ اپنے اثرات پیدا کئے بغیرنہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اورہوازن کے لوگ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

اس واقعہ کا اہل طائف پر گہرا اثر پڑا۔ ہوازن اورثقیف ایک ہی بڑے قبیلہ کی شاخیں تھیں۔ ثقیف کو جب ہوازن کے اسلام کی خبر پہنچی تو ان کے لیے یہ واقعہ محاصرہ سے بھی زیادہ سنگین ثابت ہوا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کا دایاں بازو ٹوٹ چکا ہے اوراب وہ مقابلہ آرائی میں کامیاب نہیں ہو سکتے:

ثم انهم ائتمروبينهم ،ورأوانه لاطاقة لهم بحرب من حولهم من العرب وقدبايعوااواسلموا ۔ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 107)

پھر قبیلہ ثقیف نے آپس میں مشورہ کیا۔انھوں نے دیکھا کہ اردگرد کے عربوں سے لڑنے کی ان میں طاقت نہیں۔ اوروہ بیعت ہو چکے اوراسلام قبول کر چکے۔

ہجرت کے نویں سال (630) اہل طائف کا وفد مدینہ حاضر ہوا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کی پیش کش کی۔ مگراسی کے ساتھ اپنے لیے عجیب عجیب شرطیں تجویز کیں ــــــ ان کی سرزمین کو فوجی گزرگاہ نہ بنایا جائے گا، وہ عشر نہ دیں گے۔ جہاد میں شرکت نہ کریں گے، نماز نہ پڑھیں گے، ان کے اوپران کے علاوہ کسی کو حاکم نہ بنایا جائے گا۔" آپؐ نے فرمایا تمھاری سب شرطیں منظور ہیں۔ مگراس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں رکوع نہ ہو (**لاخيرفی دين لاركوع فيه**) آپؐ کے اصحاب کو ان تحفظات کے ساتھ کسی کو مسلمان کرنا عجیب معلوم ہوا، مگرآپؐ کی نظریں دورتر مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ آپؐ نے یہ کہہ کرانھیں مطمئن کردیا:

بعدذلك سيتصدقون ويجاهدون اذااسلموا(اخرجه ابوداؤدعن وهب)

جب یہ لوگ اسلام میں داخل ہوجائیں گے تو اس کے بعد صدقہ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

امام احمد نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی قبول اسلام کے لیے کسی چیز کا سوال کیا گیا، آپؐ نے ضرور اسے وہ چیز دی۔ آپؐ کے پاس ایک آدمی آیا۔ آپؐ نے اس کے لیے اتنی کثیر بکریوں کے دینے کا حکم دیا جو دو پہاڑوں کے درمیان حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں، وہ آدمی اپنی قوم کی طرف واپس گیا اور کہا: اے میری قوم تم لوگ اسلام قبول کرلو، کیونکہ محمدؐ اتنا زیادہ دیتے ہیں کہ انھیں محتاجی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ راوی کہتے ہیں:

فان كان الرجل ليجيئ الیٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يريد الاالدنيا فما يمسى حتّٰى يكون دينه احب اليه واعز عليه من الدنيا وما فيها (البداية والنهاية)

آدمی آپؐ کے پاس آتا تھا اور اس کا مقصود صرف دنیا ہوتی تھی۔ مگر اس پر شام نہیں گزرتی تھی کہ دین اس کے لیے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس سے زیادہ محبوب ہوجاتا تھا۔

ہوازن وثقیف کا مسئلہ حل ہوا تھا کہ اسی درمیان ایک اور شدید تر مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوازن کی فتح کے بعد آپؐ کو کثیر اموال غنیمت حاصل ہوئے تھے، ان کو آپؐ نے نہایت فیاضی کے ساتھ مکّہ کے تازہ نومسلموں میں تقسیم کیا۔ یہ چیز انصار کے بہت سے لوگوں پر شاق گزری۔ انھوں نے سمجھا کہ مکہ پہنچ کر پیغمبر کے اوپر ''قرشیت'' غالب آگئی اور انھوں نے اپنے بھائی بندوں کو خوش کرنے کے لیے سارا مال انھیں دے دیا۔ یہ ایک انتہائی نازک مسئلہ تھا۔ مگر آپؐ نے جو کچھ کیا تھا، سطحی عواطف سے بلند ہو کر کیا تھا ـــــــ اس لیے آپؐ کے پاس اس کے جواب میں کہنے کے لیے نہایت مؤثر چیز موجود تھی۔

آپؐ نے انصار کے تمام لوگوں کو ایک احاطہ میں جمع کیا اور تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے انصار یہ کیا باتیں ہیں جو میرے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے، میرے ذریعہ سے اللہ نے تمھیں ہدایت دی۔ تم محتاج تھے،

میرے ذریعہ اللہ نے تم کو غنی بنایا۔تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعہ تم کو متحد کیا۔'' لوگوں نے کہا ''ہاں'' آپؐ نے دوبارہ فرمایا:

واللّٰہ لو شئتم لقلتم فصدقتم وصدقتم جئناطریداًفاٰویناك وعائلا فاٰسیناك وخائفافاٰمناك ومخذولافنصرناك ۔۔۔۔۔اوجدتم فی نفوسکم یامعشر الانصار فی لُعاعۃ من الدنیا تالفت بہاقوما اسلموا و وکلتکم الی ماقسم اللّٰہ لکم من الاسلام افلاترضون یا معشر الانصار ان یذھب الناس الی رحالھم باالشاء، والبعیر و تذھبون برسول اللّٰہ الیٰ رحالکم (رواہ احمد من حدیث ابن اسحاق)

''خدا کی قسم تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم کہو گے تو سچ کہو گے کہ آپؐ ہمارے پاس نکالے ہوئے آئے تھے، ہم نے آپؐ کو پناہ دی۔آپ محتاج آئے تھے، ہم نے آپؐ کی غم خواری کی۔آپؐ خوف زدہ آئے تھے، ہم نے آپؐ کو امن دیا۔آپؐ بے یار و مددگار آئے تھے، ہم نے آپؐ کی مدد کی ــــــ اے گروہِ انصار! کیا تم دنیا کی معمولی چیز کے لیے بددل ہو گئے جس سے میں نے نو مسلموں کی تالیف قلب کی ہے اور تم کو اس چیز کا وکیل بنایا ہے جس کو اللہ نے تمھیں عطا کیا ہے یعنی اسلام۔اے گراہ انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکری لے کر اپنی منزلوں کی طرف جائیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنی منزل کی طرف جاؤ۔''

یہ تقریر سن کر سارے لوگ رو پڑے۔انھوں نے چیخ کر کہا: ہم اللہ کے رسولؐ کے ساتھ راضی ہیں۔'' اس طرح آپؐ کی اندرونی طاقت ایک ایسی شاہ کلید بن گئی کہ جو بند دروازہ بھی اس کے سامنے آیا، اس کا قفل اس نے کھول دیا۔آپؐ کی شخصیت کے سیلاب کے آگے کوئی چیز ٹھہر نہ سکی۔

خارجی نشانہ: دعوت

پیغمبرؐ اسلام نے مکہ میں جو عملی جدوجہد شروع کی اس کی اہم بات یہ تھی کہ وہ خارجی دنیا کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں نہیں آئی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ خود اپنے

مثبت فکر کے تحت وضع کی گئی تھی۔ آپؐ کی بعثت ہوئی تو آپؐ کے گردوپیش وہ تمام حالات پوری شدت کے ساتھ موجود تھے جو عام طور پر سیاسی، معاشی اور سماجی تحریکوں کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ مگر آپؐ نے ان میں سے کسی کو بھی دعوت کا عنوان نہیں بنایا۔ بلکہ انتہائی یکسوئی کے ساتھ مندرجہ بالا پروگرام کی طرف پُرامن جدوجہد شروع کردی۔

پیغمبرؐ اسلام کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی، آپؐ کا وطن وقت کی ''سامراجی طاقتوں'' کی شکارگاہ بنا ہوا تھا۔ خاص طور پر عرب کا وہ حصّہ جو نسبتاً زیادہ زرخیز اور مال دار حیثیت رکھتا تھا، تمام تر اغیار کے ہاتھوں میں تھا۔ جزیرۂ عرب کے شمال میں شام کا علاقہ پورا کا پورا رومی سلطنت کے زیر اقتدار تھا۔ اس کے اوپر روم کے ماتحت امرائے عرب کی حکومت قائم تھی۔ اسی طرح جنوب میں یمن کا علاقہ ایران کے زیر اقتدار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہاں جو ایرانی گورنر مقیم تھا، اس کا نام باذان ہے۔ عربوں کے ہاتھ میں صرف حجاز کا، تہامہ، اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ چٹیل اور بے آب وگیاہ بیابان تھے، جن میں کہیں کہیں کچھ زرخیز ٹکڑے نظر آتے تھے۔ کسریٰ (شہنشاہ فارس) نے جب آپؐ کے مکتوب کو پھاڑ دیا اور کہا یکتب الیّ بھذا وھو عبدی (میرا غلام ہو کر مجھ کو اس طرح لکھتا ہے) تو اس کا محرک یہی سیاسی پس منظر تھا۔

پیغمبر اسلام کی پیدائش کے سال (570) مکہ پر ابرہہ کا حملہ بھی اسی استحصال کا ایک جزو تھا، جو عرب کے جنوبی حصّہ پر قابض تھا۔ اسلام سے قبل خانہ کعبہ عرب کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ اس میں تمام قوموں اور قبیلوں کے بت رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس مقام بن گیا تھا۔ تمام سال لوگ مکہ آتے رہتے تاکہ اپنے بتوں کی زیارت کریں اور نذریں چڑھائیں۔ اس سے مکہ کی تجارت قائم تھی۔ ابرہہ نے چاہا کہ اس تجارتی مرکزیت کو اپنی طرف منتقل کرلے۔ وہ جنوبی عرب (یمن) میں حبشی فوجوں کا سردار تھا اور حاکم حبشہ کے ماتحت تھا۔ اس نے حبشی حاکم کو قتل کردیا اور خود حاکم بن گیا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے مجبوراً اسے حاکم تسلیم کرلیا۔ ابرہہ مذہباً عیسائی تھا۔ اس نے صنعاء میں ایک بہت بڑا گرجا تعمیر کیا۔ اس گرجا کے چند کاریگروں کے نام بھی تاریخ میں

محفوظ ہیں۔اب اس نے گرجا کے بارے میں پروپگنڈہ شروع کیا تا کہ لوگ اس کی زیارت کے لیے آنے لگیں اور مکہ کی تجارتی اہمیت صنعاء کی طرف منتقل ہو جائے مگر جب ساری کوشش کے باوجود وہ زائرین کو اپنی تعمیر کردہ عبادت گاہ کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے ارادہ کیا کہ مکہ کے کعبہ کو ڈھا کر ختم کر دے تا کہ لوگ مکہ کے بجائے صنعاء آنے پر مجبور ہو جائیں۔چونکہ وہ ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا، وہ ''ہاتھی والے'' کے نام سے مشہور ہوا۔عرب کی تاریخ میں یہ اتنا اہم واقعہ تھا کہ وہ جس راستہ سے گزرا عربوں نے اس کا نام صراط الفیل رکھا۔جس چشمہ پر قیام کیا اس کو عین الفیل اور جہاں سے شہر میں داخل ہوا اس کو باب الفیل کہا گیا جس سال اس نے حملہ کیا تھا اس کا نام عام الفیل پڑ گیا۔

ان حالات میں قیادت کے معروف تصور کا تقاضا تھا کہ آپؐ پڑوسی حکومتوں کی استعماری سیاست کے خلاف ایک جوابی سیاسی تحریک اٹھائیں اور وطن کو بیرونی اثرات سے پاک کرنے کے لیے لوگوں کے قومی جذبات کو بیدار کریں۔مگر آپؐ نے اس قسم کی کوئی تحریک اٹھانے سے مکمل پرہیز کیا۔

اس طرح اس وقت کی عرب دنیا ''غیر ذی زرع'' ہونے کی وجہ سے معاشیات کی کسی ذاتی بنیاد سے یکسر محروم تھی۔ یہ اس ریگستانی علاقہ کے ایک ایک شخص کا مسئلہ تھا اور نہایت آسانی سے ایک ''انقلابی تحریک'' کا عنوان بن سکتا تھا۔مگر آپؐ نے اس قسم کے کسی بھی اقتصادی نعرہ سے مکمل طور پر پرہیز کیا۔ایک بار مکہ کے شرفاء کی ایک جماعت غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے سامنے جمع ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بات چیت کے لیے بلایا۔آپؐ نے جب اپنی دعوت پیش کی تو انھوں نے کہا:

يا محمد قد علمت ان ليس من الناس احد اضيق منا بلدًا، ولا اقل ماءً، ولا اشد عيشا منا. فسل لنا ربك الذى بعثك بما بعثك به فليسر عنا هٰذه الجبال التى قد ضيقت علينا وليبسط لنا بلادنا، وليفجر لنا فيها انهارا كانهار الشام والعراق (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ 67)

اے محمدؐ، آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمارا ملک سب سے زیادہ تنگ حال ہے۔دنیا میں

ہم سے زیادہ بے آب کوئی نہیں۔ ہمارے لیے زندگی نہایت مشکل ہے۔ پس اپنے رب سے کہئے کہ وہ ان خشک پہاڑوں کو ہم سے ہٹا دے جنھوں نے ہمیں تنگی میں ڈال رکھا ہے اور ہمارے لیے ہمارے ملک کو کشادہ کرے اور اس میں شام اور عراق جیسی ندیاں جاری کردے۔

مکہ کے سرداروں کی یہ تقریر اس پس منظر میں تھی کہ نجد و حجاز کے پہاڑوں نے اس علاقہ کو سمندری ہواؤں سے روک رکھا ہے جس کے نتیجہ میں یہاں شام و عراق کی طرح بارشیں نہیں ہوتیں اور سارا علاقہ خشک پڑا رہتا ہے۔ اس طرح یہ اقتصادی ابتلاء آپؐ کو زبردست موقع دے رہا تھا کہ آپؐ اقتصادی مشن لے کر اٹھیں اور آناً فاناً لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ مگر آپؐ نے اس قسم کے مسائل کی طرف کوئی براہ راست توجہ نہ دی بلکہ اپنے آپؐ کو تمام تر کلمۂ توحید کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ اگر چہ بعد کی تاریخ نے ثابت کیا کہ دعوتی مہم میں ہر قسم کے سیاسی اور اقتصادی امکانات بھی چھپے ہوئے ہیں۔ مگر وہ بالواسطہ نتیجہ کے طور پر آتے ہیں نہ کہ براہ راست جدوجہد کی طور پر۔

پیغمبر اسلام کی پوری زندگی ثابت کرتی ہے کہ آپؐ کے نزدیک اصل اہمیت دعوت کی تھی۔ نبوت ملی تو آپؐ نے دوسری تمام باتوں کو چھوڑ کر ساری توجہ دعوت پر مرکوز کر دی۔ آپؐ نے اپنے اہل خاندان سے کہا کہ مجھے خدا نے اپنی پیغام رسانی کے کام پر مقرر کیا ہے، تم لوگ میرا ساتھ دو۔ آپؐ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ یہ تقریباً چالیس مرد تھے جن میں سے تیس افراد جمع ہوئے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آپؐ نے تقریر کی مگر کوئی آپؐ کا ساتھ دینے کے لیے نہ اٹھا:

یابنی عبد المطلب !انی بعثت الیکم خاصة والی الناس عامة فمن یضمن عنی دَینی ومواعیدی ویکون معی فی الجنة ویکون خلیفتی فی اھلی.....فاعادرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المنطق فقال علیؓ : انا یارسول اللہ،فقال انت یاعلی،انت یاعلی (رواہ البزار)

اے بنو عبد المطلب! میں تم لوگوں کی طرف خاص طور پر اور تمام لوگوں کی طرف عام

طور پر بھیجا گیا ہوں، پس تم میں سے کون میرے قرضوں اور میرے وعدوں کی ذمہ داری میری طرف سے لیتا ہے اور میرے اہل میں میرا قائم مقام بنتا ہے اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اسی بات کو دہرایا تو حضرت علی (جو اس وقت نوجوان تھے) نے کہا ''میں یا رسول اللہ۔'' آپؐ نے فرمایا:: تم اے علی! تم اے علی!

ایک بار ابوجہل نے آپؐ کو پتھر کھینچ کر مارا جس سے خون بہنے لگا۔ یہ خبر آپؐ کے چچا عباس کو پہنچی، وہ اگرچہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے۔ مگر خاندانی عصبیت جوش میں آئی، ابوجہل کے یہاں جا کر اس کو مارا اور پھر آپؐ کے پاس آ کر بولے ''بھتیجے! میں نے تمھارا بدلہ لے لیا'' آپؐ نے فرمایا ''چچا! مجھے اس میں زیادہ خوشی ہوتی کہ آپؐ اسلام قبول کر لیتے''

قریش کے لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور کہا:

یااباطالب !ان ابن اخیك یاتینافی افنیتناوفی نادینا فیسمعنا مایوذینابه فان رأیت ان تکفه عنافافعل

اے ابوطالب! تمھارا بھتیجا ہمارے میدانوں میں اور ہماری مجلسوں میں آتا ہے اور ہم کو وہ باتیں سناتا ہے جس سے ہم کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تم سے ہو سکے تو اس کو ہمارے پاس آنے سے روک دو۔

ابوطالب نے اپنے لڑکے عقیل کے ذریعہ آپؐ کو بلایا اور ان سے قریش کی بات کہی:

فحلق ببصرہ الی السماء فقال :واللہ ما انا باقدر ان ادع ما بعثت به من ان یشعل احد کم من ھذہ الشمس شعلة من نار (البدایۃ والنہایۃ)

آپؐ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا کہ خدا کی قسم میں اس پر قادر نہیں کہ جو پیغام دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اس کو چھوڑ دوں، جیسے تم میں سے کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ سورج سے آگ کا ایک شعلہ جلائے۔

یہ کہہ کر آپؐ رو پڑے (ثم استعبر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فبکی) آپؐ کے خاندان بنو ہاشم کو چونکہ مکہ میں ہر قسم کی سیادت حاصل تھی، ابتداً لوگوں

کوشبہ ہوا کہ یہ ''باحوصلہ نوجوان'' شاید بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔مگر آپؐ کے مسلسل عمل نے ثابت کر دیا کہ آپؐ کے سامنے آخرت کی پیغام رسانی کے سوا اور کچھ نہیں ۔۔۔۔ایک مرتبہ آپؐ نے ابوجہل کو دعوت دی تو اس نے کہا:

یا محمد! ھل انت منتہٍ عن سبّ الٰھتنا ھل ترید الا ان نشھد انک قد بلغت فنحن نشھد انک قد بلغت (البدایۃ والنہایۃ)

اے محمدؐ! کیا تم ہمارے معبدوں کو برا کہنے سے رک جاؤ گے۔تم یہی تو چاہتے ہو کہ ہم گواہی دیں کہ تم نے پہنچا دیا تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نے پہنچا دیا۔

شعب ابی طالب کی پناہ گزینی کے زمانہ میں حرام مہینوں میں پابندی ختم ہو جاتی تھی، آپؐ کے خاندان کے لوگ اس موقع کو خرید وفروخت میں استعمال کرتے تھے۔وہ قربانی کے جانوروں کے گوشت جمع کرتے تاکہ ان کو سکھا کر رکھ لیں اور سال کے بقیہ مہینوں میں کھاتے رہیں۔مگر آپؐ اس فرصت کے موقع پر قبائل کی قیام گاہوں کی طرف نکل جاتے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچاتے۔ہجرت کا سفر انتہائی نازک سفر تھا،مگر اس سفر میں بھی آپؐ نے دعوت وتبلیغ جاری رکھی۔سیرت کی کتابوں میں اس سلسلے میں متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ مثلاً مقام غمیم پر بریدہ بن حصیب کو دعوت دینا جس کے نتیجہ میں وہ اور ان کے ۸۰ گھروں کا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔اس طرح رکوبہ گھاٹی پر آپؐ کی ملاقات دو آدمیوں سے ہوئی۔آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لائے۔آپؐ نے ان کا نام پوچھا۔انھوں نے کہا ہم قبیلہ اسلم کے لوگ ہیں۔ہمارا پیشہ ڈاکہ زنی تھا۔اس لیے ہم کو مُہانان (دو ذلیل آدمی) کہا جاتا ہے۔آپؐ نے فرمایا:

بل انتما المکرمان (مسند احمد عن ابی سعد) نہیں تم دو باعزت آدمی ہو۔

آپؐ نے صحابہ کا مزاج یہ بنایا کہ ملکوں کو فتح کرنا اور مال غنیمت حاصل کرنا بڑی چیز نہیں۔۔۔بڑی چیز یہ ہے کہ تمھارے ذریعہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو ایمان کی دولت عطا فرمائے۔غزوہ خیبر میں جب آپؐ نے حضرت علی کو جھنڈا عطا کیا تو ان سے فرمایا:

انفذ علی رسلک حتّیٰ تنزل بساحتھم ثم ادعھم الی الاسلام و

اخبرهم بما یجب علیہم من حق اللہ تعالیٰ فیہ۔فو اللہ لان یہدی اللہ بك رجلا واحدا خیرلك من ان یکون لك حمر النعم (متفق علیہ) نرمی کے ساتھ جاؤ۔ جب ان کے میدان میں پہنچ جاؤ تو ان کو اسلام کی دعوت دو، اوران کو بتاؤ کہ ان پر اللہ کے کیا حقوق ہیں۔ خدا کی قسم، اگر تمھارے ذریعہ سے اللہ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

آپ کی زندگی میں یہ پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا کوئی ایک عنوان دینا ہو تو وہ ''دعوت'' کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ آپ نے عام رواج کے مطابق سیاسی، معاشی، تمدنی مسائل کو نشانہ نہیں بنایا، بلکہ ساری توجہ دعوت الی اللہ پر مرکوز کردی۔ ابتدا میں بظاہر یہ ایک کام نظر آتا تھا۔ مگر جب آخری نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ سرا ہے کہ اگر وہ ہاتھ آجائے تو بقیہ چیزیں خود بخود ہاتھ آتی چلی جاتی ہیں۔

صبر واستقامت

اب صبر کو لیجئے۔ صبر کا لفظ عربی زبان میں ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ کسی چیز میں اثر پذیری کے بجائے جماؤ کی کیفیت بتانا مقصود ہو۔ مثلاً صبّارۃ سخت بنجر زمین کو کہتے ہیں جو بیج کو قبول نہ کرے۔ اسی طرح بہادر کو صبور کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خارجی دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو قائم رکھتا ہے۔

یہ صبر اس انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے جس کے اندر اسلام ایک مقصد بن کر شامل ہو گیا ہو۔ اسلام اس کے اندر ایسی حرارت پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد وہ سست نہیں پڑتا۔ وہ کمزوری نہیں دکھاتا۔ وہ عاجزی ظاہر نہیں کرتا۔ (آل عمران 146) ایمان واسلام کا مطلب خدا پر اعتماد کرنا ہے ،اور جو شخص خدا پر اعتماد کرلے وہ اتھاہ طاقت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے کسی مرحلہ پر بے صبری کا کوئی سوال نہیں رہتا۔

ا۔ ایک شخص جب اسلام کا علم بردار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود تو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود وقیود میں بندھا ہوا ہے، جب کہ دوسرا فریق آزاد ہے کہ

جوطریقہ چاہے اپنی کامیابی کے لیے اختیار کرے۔ اس کوحکم دیا گیا کہ اپنی ساری قوت دعوت وتبلیغ کی مہم پر صرف کرے، جب کہ دوسرے لوگ سیاسی کارروائیاں اوراقتصادی تدبیروں سے اپنی پوزیشن کومستحکم بنارہے ہیں۔ اس کو ہرحال میں اخلاقی حدود میں رہنے کا پابند کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے لوگ اس قسم کی تمام بندشوں سے آزاد ہیں۔ اس طرح کی باتیں داعیٔ اسلام کواس حدتک متاثر کرسکتی ہیں کہ اسلامی طریقِ کار کو ہلکا سمجھنے لگے اور اس کے دل میں یہ خیال پرورش پانے لگے کہ اسے بھی وہی طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو دوسرے لوگ اختیار کررہے ہیں۔ یہاں ''صبر'' اس کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔ صبر اس کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ اپنے طریق عمل کو ہلکا اور بے اثر سمجھنے لگے:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسۡتَخِفَّنَّكَ الَّذِيۡنَ لَا يُوۡقِنُوۡنَ۠ ﴿۶۰﴾ (سورۃ الروم)

اے نبی صبر کر، بے شک اللہ کا وعدہ سچ ہے اور نہ سبک کریں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔

2۔ اسلام کی راہ میں صبر کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کی طرف سے جو مصیبتیں ڈالی جائیں، ان کو مکمل طور پر برداشت کیا جائے:

وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا (ابراہیم۔12) (نبیوں نے کہا) ہم صبر کریں گے اس پر جو ایذا تم ہم کو دیتے ہو۔ یہ صبر بذات خود دعوت حق کا ایک جزء ہے۔ کیونکہ داعی اگر مدعو کی جوابی کارروائیوں سے گھبرا اٹھے یا جزع فزع کرنے لگے تو یہ بات مشتبہ ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی دعوت میں سنجیدہ ہے اور واقعۃً اللہ کی رضاجوئی کے لیے لوگوں کو حق کا پیغام دینے اٹھا ہے۔ یہ مصائب تو درحقیقت اس کی سنجیدگی کا امتحان ہیں اور کسی کے لیے اس کی دعوت اسی وقت قابل قبول ہوسکتی ہے جب کہ وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر سنجیدہ ثابت کردے۔

3۔ مخالف کی طرف سے جب کوئی چیز ڈالی جائے تو آدمی عام طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کو خود مخالف کے اوپر لوٹا دے۔ اس کے مقابلہ میں صبر یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس کو اپنے اوپر لے لیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کسی جگہ اہل اسلام کو مدعو قوم کی طرف سے اس اقتصادی تعصب کا سامنا پیش آئے کہ یکساں لیاقت رکھتے ہوئے ان کی جگہ دوسرے

کا انتخاب کیا جانے لگے تو یہ مطالبہ لے کر اٹھنا صبر کے خلاف ہوگا ’’ہمارے ساتھ مساویانہ سلوک کرو‘‘ اس کے برعکس انھیں یہ کرنا چاہئے کہ اس وار کو اپنے اوپر لے لیں۔ یعنی اگر ماحول مساوی لیاقت کی بنیاد پر انھیں ان کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو امتیازی لیاقت پیدا کر کے اسے حاصل کریں۔ مکّی دور میں ہجرت حبشہ ایک اعتبار سے اسی قسم کا ایک عمل تھا۔ مکہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے لیے مکہ میں تجارت کے دروازے بند کر دئے تو انھوں نے پڑوسی ملک میں محنت مزدوری کر کے اپنی معاش حاصل کرنا شروع کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایمان داری اور محنت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ شاہ حبش (نجاشی) نے منادی کے ذریعہ اعلان کرا دیا کہ جو شخص کسی مسلمان کو ستائے، وہ اس کے بدلے اس مسلمان کو 8 درہم تاوان دے۔

صبر بظاہر ایک سلبی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ ایک اعلیٰ ترین ایجابی عمل ہے جس میں آدمی اپنے حریف کے مقابلہ میں فوری جوابی کارروائی کرنے کے بجائے دور تر عوامل پر اعتماد کرتا ہے۔ جب آپ کسی ظلم یا اشتعال انگیزی کے جواب میں فوری اقدام کرتے ہیں تو اس وقت آپ کی کارروائی ایک متاثر ذہن سے نکلی ہوئی کارروائی ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ آدمی کے ابلتے ہوئے جذبات کے زور پر بنتا ہے۔ بجائے اس کے کہ خارجی حقائق و امکانات کا بے لاگ جائزہ لے کر اس کے مطابق گہری منصوبہ بندی کی جائے ،جس کا دوسرا نام صبر ہے۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کو فوری طور پر خود جواب دینے کے بجائے خدا کے ابدی قوانین کو اس کے خلاف کارفرما ہونے کا موقع دیا جائے۔

جب آدمی بے صبری کے ساتھ حریف کے مقابلہ میں دوڑ پڑتا ہے تو اس وقت اس کے رہنما سفلی جذبات اور سطحی محرکات ہوتے ہیں۔ وہ لازمًا ایسی غلطیاں کرتا ہے جس سے اس کا مقدمہ کمزور ہو جائے۔ اس کے برعکس جب آدمی صبر سے کام لیتا ہے تو اس وقت اس کے اندر کی وہ ربّانی قوت اپنا عمل کرنے کے لیے بیدار ہو جاتی ہے جس کو عقل کہتے ہیں۔ انسان کی عقل ایک حیرت انگیز قوت ہے۔ وہ دیوار کے اُس پار دیکھتی ہے اور مستقبل

میں جھانک کر اس میں چھپے ہوئے حقائق کو معلوم کر لیتی ہے جن کے ہاتھ آ جانے کے بعد حریف کے تمام اطراف وجوانب اس طرح قابو میں آ جاتے ہیں جیسے کوئی شکار کسی مضبوط جال میں پھنس جائے اور اس کے بعد اس کی ہر حرکت اس کے اوپر شکاری کی گرفت کو مضبوط کرنے والی ثابت ہو۔

ہجرت کا واقعہ اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ جب قریش نے فیصلہ کر لیا کہ آپؐ کو قتل کر دیں تو ایک صورت یہ تھی کہ آپؐ ان کی تلوار کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس کے برعکس آپ نے ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اپنا مقام عمل تبدیل کر دیں۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ ہجرت سے پہلے آپ روزانہ میرے والد (ابوبکرؓ) کے مکان پر آتے اور آئندہ اقدام کے بارے میں مشورہ کرتے۔ چھ مہینے تک نہایت رازداری کے ساتھ ساری تیاریاں مکمل کی گئیں۔ اس کے بعد ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت آپؐ ایک معتمد رہنما کو لے کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایک پرجوش قائد جو حریف سے لڑ کر شہادت کی یادگار قائم کرنے کو سب سے بڑا کمال سمجھتا ہے، اس کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو ہجرت ایک قسم کا فرار معلوم ہو گی۔ مگر نتائج کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ واحد عظیم واقعہ ہے جس نے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اسی طرح صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اقدام سے رک کر فطرت کو کام کرنے کا موقع دے۔ انسانی فطرت ایک دائمی حقیقت ہے اور اگر خارجی پردے ہٹا دیئے جائیں تو وہ انسانی زندگی میں انتہائی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ فطرت کے اندر ہمیشہ اس آدمی کے لیے نرم گوشہ ہوتا ہے جو گالی کے جواب میں چپ رہ گیا ہو۔ فطرت اپنی اندرونی آواز کے تحت مجبور ہے کہ ظالم کے بجائے مظلوم کو حق پر سمجھے۔ فطرت کی دنیا میں محرومیوں سے استحقاق پیدا ہوتا ہے اور ضبط واستقامت سے اس کا برسرِ حق ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال پیغمبر اسلام اور آپؐ کے خاندان کا مقاطعہ ہے جو نبوت کے ساتویں سال پیش آیا اور جس کے نتیجہ میں ابولہب کو چھوڑ کر سارے بنوہاشم کو ایک پہاڑی درّہ (شعب ابی طالب) میں محصور ہونا پڑا۔ ایک مقصد کے خاطر نہایت خاموشی کے ساتھ بدترین ظلم کو سہتے

رہنا فطرت انسانی میں اپنی بازگشت پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ تین سال گزرے تھے کہ خود دشمنوں کے اندر ابوالبختری، ہشام بن عمرو، زبیر بن امیہ، زمعہ بن الاسود اور مطعم بن عدی جیسے متعدد لوگ پیدا ہو گئے۔ انھوں نے قریش کے لیڈروں سے لڑ کر معاہدہ کو چاک کر ڈالا اور بنو ہاشم کو اس ظالمانہ، مقاطعہ سے نجات مل گئی۔

صبر کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس سے نصرت الٰہی کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک شخص صحیح مقصد کی خاطر صبر کرتا ہے تو وہ اپنے مسائل کے لیے مالک کائنات کے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک صحیح مقصد کے لیے مالک کائنات پر بھروسہ کرے اور وہ اس کے بھروسہ کو پورا نہ کرے۔

اس نصرت کے بے شمار طریقے ہیں۔ کوئی شخص نہ ان کو جان سکتا اور نہ ان کا احاطہ کر سکتا۔ تاہم اسلام اور غیر اسلام کے مقابلہ میں آنے والی ایک خاص نصرت یہ ہے کہ مادی حالات میں موافق کمی بیشی پیدا کر دی جائے۔ اور اہل ایمان کے دل میں اعتماد کی کیفیت ڈال دی جائے اور مخالفین کے دل میں رعب:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (سورۃ الأحزاب۔9)

''اے ایمان والو، اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر بھیجی آندھی اور ایسا لشکر جس کو تم نے نہیں دیکھا۔''

یہ آیت غزوہ احزاب (627) سے متعلق ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی مدد پر دو چیزیں بھیجی تھیں۔ ہوا، اور فرشتوں کی فوج۔ ہوا کوئی انوکھی چیز نہیں۔ وہ ایک دبیز غلاف کی شکل میں ہر وقت کرۂ ارض کے چاروں طرف لپٹی ہوئی موجود ہے۔ مگر ایک خاص وقت میں ایک خاص مقام پر اس کے اندر تیزی پیدا کر دی گئی۔ جس کے نتیجہ میں اہل ایمان کے لیے نصرت بن گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کی مدد کرنا چاہتا ہے تو مادّی واقعات میں شدت پیدا کر دیتا ہے جس کا نتیجہ اس کے حق میں کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

فرشتوں کی فوج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر تلوار چلاتے تھے۔ یہ درحقیقت ایک قسم کی نفسیاتی مدد تھی نہ کہ عام معنوں میں حربی مدد۔ وہ اس لیے آتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں کے دلوں میں ثبات اور دوسری طرف مخالفینِ اسلام کے دلوں میں رعب پیدا کریں۔ (انفال۔12) وہ مسلمانوں کی نظر میں مخالفین اسلام کی فوج کو کم کرکے دکھاتے تھے اور مخالفین اسلام کی نظر میں مسلمانوں کی فوج کو بہت زیادہ کر دیتے تھے۔ (انفال۔44)

عہد فاروقی میں سعدؓ بن ابی وقاص اسلامی لشکر کو لے کر قادسیہ میں اترے جو عربوں کے نزدیک ایران کا دروازہ تھا۔ یہاں زیادہ دنوں تک قیام کرنا پڑا اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئیں۔ حضرت سعدؓ نے کچھ لوگوں کو روانہ کیا کہ کہیں سے بکریاں اور گائیں تلاش کرکے لائیں۔ انھیں ایک ایرانی ملا جس سے انھوں نے بکریوں اور گایوں کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے کہا مجھے کچھ علم نہیں۔ حالاں کہ وہ خود ایک چرواہا تھا اور اس نے اسلامی لشکر کی خبر سن کر اپنے، مویشیوں کو قریب کے گھنے جنگل میں چھپا دیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے:

فصاح ثور منها كذب الراعي، ها نحن في هذه الاجمة

''ایک بیل چلایا، چرواہا جھوٹا ہے۔ ہم یہاں اس جھاڑی میں موجود ہیں۔''

آواز سن کر وہ لوگ جنگل میں گھس گئے اور کچھ مویشیوں کو ہانکتے ہوئے حضرت سعدؓ کے پاس لے گئے۔ اسلامی لشکر کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کو خدا کی ایک کھلی ہوئی امداد سمجھا۔ مگر جیسا کہ مورخ ابن الطقطقی نے لکھا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیل نے یہ عربی جملہ کہا کہ ''ہم یہاں ہیں'' بلکہ یہ اس کی عام آواز میں ایک ڈکار تھی۔ اور اس ڈکار سے مسلمانوں نے سمجھا کہ یہاں مویشی موجود ہیں۔ (الفخری، صفحہ 79)

اللہ پر بھروسہ

''اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی ان کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ

رکھو۔ بلاشبہ وہ خوب سنتا اور جانتا ہے، اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے (انفال 62۔61) قرآن کا یہ حکم اسلامی طریق کار کا خلاصہ ہے۔ اسلام کا طریقہ اصلاً غیر حربی طریقہ ہے۔ حتّیٰ کہ فریق مخالف کی طرف سے دھوکے کا اندیشہ ہو تب بھی اہل اسلام کو خدا کے بھروسہ پر مصالحت کے لیے تیار رہنا چاہئے۔

اس حکم کا مدعا یہ ہے کہ غیر حربی میدان، بالفاظ دیگر وہ میدان جہاں دوسروں سے ٹکراؤ پیدا کئے بغیر تم اپنے لیے مواقع کار پا رہے ہو، وہاں اپنی قوتوں کو لگا دو۔ اور اس کے علاوہ عمل کے جو دوسرے دائرے ہیں، وہاں قدرت کی طاقتوں کو بروئے کار آنے کا موقع دو۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی دو فریق متصادم ہوں تو وہاں تیسرا زیادہ طاقت ور فریق موجود ہوتا ہے اور وہ رب العالمین کی ذات ہے۔ اگر ہم اپنی قوتوں کو اپنے ممکن دائرہ میں محدود رکھیں تو بقیہ دائرہ میں خدا ہمارے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اپنے حاصل شدہ دائرہ عمل کو چھوڑ کر دوسروں کے دائرہ عمل میں چھلانگ لگانا گویا خدا کے دائرہ سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔ ایسا آغاز صرف غضب الٰہی کو بھڑکاتا ہے۔ وہ کسی کے لیے خدا کی رحمت ونصرت کو کھینچنے والا نہیں بن سکتا۔

اصحاب رسول: وہ کیسے لوگ تھے

عمرؓ بن العاص اور خالدؓ بن ولید صفر 8ھ میں اسلام لائے۔ عمرؓ و بن العاص کہتے ہیں کہ میں مدینہ جاتے ہوئے عدہ پہنچا تو راستہ میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا تو ان میں سے ایک خالد بن الولید تھے۔ دونوں میں جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک حصہ یہ تھا:

قلت این تریں، قال محمدًا۔ دخل الناس فی الاسلام فلم یبق احد به طعمٌ (اخرجه البیهقی من طریق الواقدی)

عمرو بن العاص نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ خالد بن الولید نے جواب دیا محمد کے پاس جا رہا ہوں۔ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ کوئی چاشنی والا آدمی باقی نہیں رہا۔

رجل ذو طعم کا مفہوم عربی زبان میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں (Man of Teste) کا۔ اردو میں اس کو صاحب ذوق کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں تمام کارنامے انھیں لوگوں نے انجام دیئے ہیں جن کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ ''ذوق'' کے تحت ردوقبول کا فیصلہ کرتے ہوں۔ باقی وہ لوگ جو فائدوں اور مصلحتوں کے تحت چلتے ہوں، وہ ہمیشہ اپنی ذات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ان پر نہ زندگی کے بڑے بڑے حقائق کھلتے اور نہ ان سے کسی بڑے کام کی امید کی جا سکتی۔

عرب میں جو انسانی گروہ جمع تھا، وہ اس صلاحیت کی اعلیٰ ترین مثال تھا۔ یہ انتہائی اونچی طبیعت کے لوگ تھے۔ اپنے دشمن کے خلاف وہ ہر قسم کا تشدد کر سکتے تھے۔ مگر وہ اپنی آن کو کبھی چھوڑتے نہ تھے۔ کسی بھی حال میں ان سے کسی ذلیل حرکت کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ عرب کردار کی شہادتیں تاریخ میں کثرت سے موجود ہیں۔ یہاں بطور نمونہ صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایران کی ساسانی سلطنت اور روم کی بازنطینی سلطنت دو بڑی حریف حکومتیں تھیں۔ ان میں اکثر جنگ جاری رہتی تھی۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں ان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ 616ء میں ایرانیوں نے رومیوں کے اوپر غلبہ

حاصل کرلیا۔رومی سلطنت کے تقریباً تمام مشرقی مقبوضات ،اردن،شام،فلسطین،عراق ، مصر،سب ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے ۔اوررومی شہنشاہ قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہوگیا۔

یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب کہ مکہ میں اسلام اورغیر اسلام کی کش مکش اپنی شدید ترین شکل میں جاری تھی۔ ایسے حالات میں اہل کتاب رومیوں کے مقابلہ میں بت پرست ایرانیوں کی فتح مکہ کے لوگوں کے لیے گفتگو کا خصوصی موضوع بن گئی۔مشرکین نے اس سے اپنی فتح کا شگون لیا اورمسلمانوں سے کہا کہ جس طرح پڑوس میں ہمارے بت پرست بھائیوں نے آسمانی کتاب کے حاملین پر غلبہ حاصل کیا ہے،اسی طرح ہم بھی تمھارے اوپر غالب آجائیں گے۔عین اس وقت قرآن کی سورہ نمبر 30 اُتری اوراعلان کیا کہ چند سالوں کے بعد دوبارہ حالات بدلیں گےاوررومی،ایرانیوں کےاوپرغالب آجائیں گے۔

سورۂ روم کی ان آیتوں نے مکہ کے مخالفوں کواسلام کا مذاق اڑانے کا نیا موضوع دے دیا۔ ابی بن خلف نے ابوبکرصدیق سے کہا: ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔اگرتم کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو مجھ سے شرط کرلو۔ چنانچہ دونوں کے درمیان یہ شرط ہوئی کہ رومی اگردوبارہ غالب آگئےتوابی بن خلف سواونٹ دے گا۔اوراگراس کے خلاف ہواتوابوبکرؓ صدیق ایک سواونٹ ادا کریں گے۔

اس کے بعدقریش کےساتھ مسلمانوں کی کش مکش اورزیادہ بڑھی یہاں تک کہ ہجرت ہوئی اور 624ء میں جنگ بدرپیش آئی۔ اس جنگ میں قریش کے اکثرسردار مارے گئے جس نے اسلام کے خلاف ان کے غصہ کوجنون کی حدتک پہنچادیا۔عین اس وقت (624ء میں) قیصرروم نے ایرانیوں کونینوا (عراق) کے مقام پرفیصلہ کن شکست دی اوراپنے تمام چھینے ہوئے علاقے ایرانیوں سے واپس لے لیے ـــــ قرآن کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ ابوبکرؓ صدیق اس وقت مدینہ میں تھے۔آپ نے ابی بن خلف کے پاس مکہ میں پیغام بھیجا کہ قرآن کی بات صحیح ثابت ہوئی۔اس لیےتم شرط کےمطابق ایک سواونٹ ادا کرو۔ یہ پیغام مکہ پہنچاتووہاں کسی نے اس کی مخالفت نہ کی۔نہ تاویل وتوجیہہ کےذریعہ اس کوغلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں سےتمام تر دشمنی کے باوجود،مکہ سے ایک سواونٹ مدینہ بھیج

دیئے گئے۔ جب یہ اونٹ مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق سے فرمایا ان کو صدقہ کردو ـــــ حق بات کو مان لینا، خیر میں داخلہ کا واحد دروازہ ہے اور یہ صفت قدیم عربوں کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی۔

یہی وہ عرب تھے جن کے بہترین حصہ کو کاٹ کر (آل عمران 127) اسلام میں شامل کیا گیا تھا، جن کو آج ہم اصحاب رسول کہتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں آئے تو ان کی صلاحیتوں میں اور زیادہ جلا پیدا ہوا۔ وہ ایسے عظیم اوصاف کے مالک بن گئے جیسے اوصاف والے لوگ نہ اس سے پہلے زمین پر آباد ہوئے نہ اس کے بعد دوبارہ دیکھے گئے۔ جاہلیت کے بہتر لوگ اسلام کے بہتر لوگ بن گئے۔ (**خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھو**، (متفق علیہ)

اسلام کا مقصد، آدمی کو مادیات کی سطح سے اٹھا کر روحانیت کی سطح پر پہنچانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ زندگی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں اس کی اپنی فکری سطح اور عالمِ حقیقت کی سطح دونوں ایک ہوجائیں۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو ایک طرف وہ فیضان الٰہی کا مہبط بن جاتا ہے۔ دوسری طرف ظواہر کا پردہ اس کے لیے اس طرح کالعدم ہوجاتا ہے کہ وہ حقائق کو بے نقاب حالت میں دیکھنے لگتا ہے۔

زندگی کی اس سطح پر پہنچنے کی واحد شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے خول سے باہر آجائے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہوکر اپنے آپ کو دیکھنے لگے۔ جب آدمی اپنے خول سے باہر نکل آتا ہے تو وہ فیضان الٰہی کی براہ راست زد میں آجاتا ہے۔ حقائق، خواہ اِس دنیا کے ہوں یا اُس دنیا کے، اس کے لیے اس طرح جانی پہچانی چیز بن جاتے ہیں جس طرح کسی ماں کے لیے اس کی اولاد۔ مگر یہ مقامِ بلند صرف بلند فطرت لوگوں کو ملتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے اپنے آپ کو جس طرح کچلنا پڑتا ہے، اس کی ہمت صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو تمام مصالح ومفادات سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پست فطرت لوگ کبھی اپنی ذات کے خول سے نکل نہیں پاتے۔ اس لیے وہ اسلام کے اونچے مقام کا تجربہ بھی نہیں کرسکتے:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾
(حٰم سجدہ: 35) اور یہ بات انھیں کوملتی ہے جوصبر کرتے ہیں اور یہ بات اسی کوملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے۔

معاصرین کی رائے:

اصحاب رسول کے بارے میں یہاں ان کے بعض معاصرین کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں۔

عن عبد الله بن مسعود قال ان الله نظر فی قلوب العباد فاختار محمدًا صلی الله علیه وسلم فبعثه برسالته وانتخبه بعلمه ،ثم نظر فی قلوب الناس بعدهٗ فاختار الله له اصحابا فجعلهم انصار دینه ووزراء نبیه صلی الله علیه وسلم (ابن عبد البر ،الاستیعاب ،جلد۱ ،صفحه6)

عبداللہؓ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا۔پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔پیغمبری کے لیے آپؐ کی بعثت فرمائی۔آپؐ کو آپؐ کے علم کی وجہ سے منتخب کرلیا اس کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا اور آپؐ کے لیے آپؐ کے ساتھیوں کو چن لیا۔ان کو اپنی دین کا مددگار اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔

حسن بصری تابعی (م 110ھ) نے ایک بار اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا۔

لقد ادرکت سبعین بدریًا اکثر لباسهم الصوف ولو رأیتموهم لقلتم مجانین ولو رأوخیارکم لقالوا مالهولاء من خلاق .ولا رأو اشرار کم لقالوا مایومن هولاء بیوم الحساب

میں نے 70 بدری صحابیوں کو دیکھا ہے۔ان کا لباس زیادہ تر صوف کا ہوتا تھا۔اگر تم ان کو دیکھتے تو تم کہتے یہ پاگل ہیں۔اور اگر وہ تمھارے اچھوں کو دیکھتے تو کہتے کہ ان کا دین میں کوئی حصہ نہیں۔اور اگر وہ تمھارے بروں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ لوگ حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

عن عبد الله بن عمر قال، اولئك اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم کانوا خیر هذه الامة ابرها قلوبا و اعمقها علما و اقلها تکلفا (ابونعیم حلیۃ الاولیاء، جلد ا صفحہ 305)

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں۔ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے بہترین لوگ تھے۔ وہ بہت اچھے دل والے، بہت گہرے علم والے اور تکلفات سے دور تھے۔

عن عبد الله بن مسعود قال، انتم اکثر صیاما و اکثر صلاۃ و اکثر اجتهادا من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وهم کانو خیرا منکم۔ قالوا لِمَ یا ابا عبد الرحمن۔ قَالَ هم کانوا ازهد فی الدنیا۔ و ارغب فی الآخرة (حلیۃ الاولیاء، جلد ا، صفحہ 36)

حضرت ابن مسعود نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا۔ تم نماز روزہ میں اصحاب رسول سے زیادہ ہو۔ ان سے زیادہ مجاہدے کرتے ہو۔ مگر وہ تم سے بہت بہتر تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے جواب دیا۔ وہ دنیا سے بہت زیادہ بے رغبت تھے۔ اور آخرت کے بہت زیادہ مشتاق تھے۔

قال علی بن ابی طالب، والله لقد رأیت اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم فما اری الیوم شیئا یشبههم لقد کانوا یصبحون صفرا شعثا غبرا، وحملت اعینهم حتی تبل ثیابهم، والله فکان القوم باتوا غافلین (البدایۃ والنہایۃ، جلد 8 صفحہ 6)

علی بن ابی طالب نے کہا، خدا کی قسم میں نے اصحاب رسول کو دیکھا ہے، آج کوئی چیز ان کے مشابہ نہیں، وہ خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہو کر صبح کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں اتنا آنسو گراتیں کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے۔ خدا کی قسم آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غفلت میں رات گزاری۔

سئل عبد الله بن عمر، هل کان اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم یضحکون۔ قال نعم والایمان فی قلوبهم اعظم من الجبال۔ (اخرجہ ابونعیم عن قتادہ)

عبد اللہ بن عمر سے پوچھا گیا، نبی کے اصحاب کیا ہنستے بھی تھے۔انھوں نے کہاہاں ۔اورایمان ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہوتا تھا۔

دخل ضرار بن ضمرہ الکنانی علی معاویۃ فقال لہٗ۔صف لی علیا ۔قال: انه کان یستوحش الدنیا وزهرتها،ویستأنس باللیل وظلمته ۔کان والله غزیر العبرة،طویل الفکرة ۔یقلب کفه ویخاطب نفسه۔یعجبه من اللباس ماقصر ومن الطعام ماجشب ۔یعظم اهل الدین ویحب المساکین لایطمع القوی فی باطله ولاییأس الضعیف من عدله ۔فاشهد بالله لقدرأیته فی بعض موافقه وقدارخی اللیل سدوله وغارت نجموه یمیل فی محرابه قابضاعلی لحیته یتململ تململ السلیم ویبکی بکاء الحزین ،فکأنی اسمعه الآن وهویقول یاربنایاربنا (ابونعییم)

ضرار بن ضمرہ امیر معاویہ کے پاس آئے۔امیر معاویہ نے کہا مجھ سے علی کے اوصاف بیان کرو۔انھوں نے کہا۔علی، دنیااوراس کی رونق سے وحشت محسوس کرتے تھے۔ ان کورات اوررات کی تاریکی سے انس تھا۔خدا کی قسم وہ بہت زیادہ عبرت پکڑنے والے، طویل فکرکرنے والے تھے۔اپنی ہتھیلی کو پلٹتے اوراپنے نفس کومخاطب کرتے۔مختصرلباس اورمعمولی کھانا ان کو پسند ہوتاوہ اہل دین کی عزت کرتے مسکینوں کو دوست رکھتے _____ طاقت وراپنے باطل میں ان سے امید نہ کرسکتا تھااورکم زوران کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا تھا۔میں خداکوگواہ بنا کرکہتا ہوں کہ میں علی کوبعض مواقع پر دیکھا ہے جب کہ رات کی تاریکی چھارہی تھی اورستارے غروب ہورہے تھے۔آپ اپنے محراب میں داڑھی پکڑے ہوئے اس طرح بے چین تھے جیسے زہریلے جانور کا ڈسا ہوابے چین ہوتا ہے۔غم زدہ کی طرح رورہے تھے۔جیسے اب بھی میں ان کو بےقرارحالت میں یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں۔ اے ہمارے،اے ہمارےرب۔

معاملات میں اخروی پہلو کو سامنے رکھنا۔

یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید (م 648ء) اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور ابوعبیدہؓ بن الجراح ان کے ماتحت افسر کی حیثیت سے جنگ میں شریک تھے۔حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالدؓ بن ولید کو معزول کر کے ابوعبیدہؓ بن الجراح کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور خالدؓ بن ولید کو ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان لے کر مدینہ سے جو شخص روانہ ہوا تھا، وہ مقام جنگ پر اس وقت پہنچا جب کہ طویل مقابلہ کے بعد لڑائی اپنے آخری انجام کو پہنچنے والی تھی اور فتح کے مقدمات ظاہر ہو چکے تھے۔قاصد نے یہ فرمان اولاً ابوعبیدہؓ بن الجراح کو دیا۔ابوعبیدہؓ فرمان خلافت کے مطابق فوراً سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے کر فتح کا کریڈٹ وصول کر سکتے تھے۔مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خالدؓ بن ولید کی ماتحتی میں بدستور لڑتے رہے:

فاخفى ابو عبيدة الخبر و صار فى مكانه خلف خالد حتى ظهرت مقدمات النصر ۔ وقد سئل عن عدم اخذه بلواء القيادة على الفور فقال :ماسلطان الدنيا اريد و ماللدنيا اعمل

ابوعبیدہ نے خبر کو چھپایا اور خالد کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں تک کہ فتح کے مقدمات ظاہر ہو گئے۔ان سے پوچھا گیا کہ قیادت کا جھنڈا آپ نے فوراً کیوں نہ لے لیا۔فرمایا: میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور نہ دنیا کے لیے عمل کرتا ہوں۔

آخرت کے لحاظ سے کریڈٹ یہ تھا کہ خبر کو چھپایا جائے۔دنیا کا کریڈٹ اس میں ملتا تھا کہ اس کو ظاہر کر دیا جائے ۔ابوعبیدہ نے آخرت کا کریڈٹ لینا پسند کیا اور دنیا کے کریڈٹ کو نظر انداز کر دیا۔

اب خالدؓ بن ولید کے کردار کو دیکھئے ۔یرموک کی فتح کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس عظیم جنگ کے فاتح (خالد بن ولید) کو سپہ سالای سے معزول کر دیا گیا ہے تو ان کے اندر سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔انھوں نے حضرت خالد کی بہادری اور جواں مردی پر تقریریں کیں اور ان کی معزولی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

ان کو ابھارا کہ وہ خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں اور وعدہ کیا کہ ہم سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے۔ (یحرضونہ علی عصیان امر الخلیفۃ ویعدونہ بانھم سیکونون معہ) مگر خالد بن ولید نے اس قسم کا مشورہ کے ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ ابوعبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہیں۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

انی لا اقاتل فی سبیل عمر ولکن فی سبیل رب عمر

میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا، بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں۔

جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچنا:

11 ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اکثر مسلمان ہل گئے۔ عمرؓ فاروق کا یہ حال ہوا کہ مدینہ کی مسجد میں تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی۔ اس کی گردن ماردوں گا۔ ابوبکرؓ صدیق رسول کی محبت میں تمام لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ہجرت کے موقع پر جب آپؐ مکہ میں اچانک ابوبکرؓ صدیق کے گھر آئے اور فرمایا کہ مجھے مکہ سے چلے جانے کا حکم ہو گیا ہے تو ابوبکر صدیق نے پہلی بات یہ فرمائی: ''کیا مجھے بھی ساتھ نصیب ہوگا۔'' آپؐ نے فرمایا ہاں۔ یہ سفر بظاہر موت کا سفر تھا۔ مگر اس نازک موقع پر رسول کی معیت ان کو اتنی محبوب تھی کہ خوشی کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ عشق کی حد تک رسول سے عقیدت ہونے کے باوجود جب آپ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی، تو آپ مسجد میں آئے جس سے متصل رسول اللہ کا حجرہ تھا۔ یہاں لوگ حیران و پریشان تھے۔ عمر فاروق نے سرے سے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ رسول اللہ کی وفات ہو سکتی ہے۔ مگر ابوبکر صدیق نے اپنی روح کو عالم بالا سے اس حد تک مطابق کر لیا تھا کہ آپ کو اصل حقیقت سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے آپ کے چہرے سے چادر اٹھا کر آپؐ کو چوما اور پھر فرمایا: بابی انت وامی ،اما الموتۃ التی کتب اللہ علیك فقد ذقتھا ،ثم لن تصیبك بعدھا موتۃ ابدا (جو موت اللہ

نے آپ کے مقدر کی تھی وہ آپ نے چکھ لی۔ اس کے بعد اب کوئی موت آپ کو آنے والی نہیں) اس کے بعد آپ باہر مجمع میں تشریف لائے اور تقریر کرتے ہوئے کہا:

ایھا الناس، انہ من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ 155)

لوگو! جو شخص محمد کو پوجتا تھا تو محمدؐ کا انتقال ہو گیا۔ اور جو شخص خدا کو پوجتا تھا تو خدا زندہ ہے، اس کو موت آنے والی نہیں۔

یہ عبدیت کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفرت اور محبت کی نفسیات سے الگ ہو کر حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے کامل انسان صدر اول میں بھی تھوڑے تھے، اور بعد کے زمانہ میں تو شاید ایسے لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ الا ماشاء اللہ

اصحاب رسول نے اسی عبدیت کاملہ کا مظاہرہ جمع قرآن کے سلسلے میں کیا۔ ابو بکرؓ صدیق کی خلافت کے زمانہ میں جب زید بن ثابت انصاری نے قرآن کو مدون کیا تو ان کے نسخہ کے بعد بہت سے اجزاء بچ گئے جن پر قرآن کی آیتیں اور سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ تمام اصحاب کے مشورے سے اس ذخیرہ کو جلا دیا گیا۔ اسی طرح عثمان غنی کی خلافت کے زمانہ میں جب قرآن کے نسخے جمع کئے گئے اور چند مستند نسخے تیار کئے گئے تو بہت سے نسخے بچ گئے جو مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے تھے۔ اس بار بھی اصحاب رسول کے متفقہ مشورہ کے مطابق سرکاری نسخوں کے علاوہ تمام نسخے جلا دیئے گئے ـــــ ''قرآن'' کو عظیم تر دینی مصلحت کی خاطر جلانا، ایک ایسی جرأت کا کام ہے جس کا مظاہرہ صرف ایسے لوگ کر سکتے تھے جو حقیقت کو اس بلند مقام سے دیکھ رہے ہوں جہاں ہر دوسری چیز حذف ہو جاتی ہے اور حقیقت اعلیٰ کے سوا کوئی چیز مرکز توجہ بننے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

اختلاف کے باوجود عدل پر قائم رہنا:

عمر فاروق اپنے وقت کی ایک عظیم سلطنت کے حکمراں تھے۔ آپ نے ایک بار تقریر کے دوران کہا: اگر تم لوگ میرے اندر کوئی غلطی دیکھو تو کیا کرو گے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا:

واللہ لوعلمنا فیك اعوجا جالقومناہ بسیوفنا

خدا کی قسم اگر ہم تمھارے اندر کوئی ٹیڑھ دیکھیں تو ہم اس کو تلوار سے سیدھا کردیں گے۔

عمر فاروق نے اس ''گستاخی'' پر آدمی کو تنبیہہ کرنے کے بجائے فرمایا الحمد للہ ان جعل فی المسلمین من یقوم اعوجاج عمر بسیفه (خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ بنائے جو عمر کی ٹیڑھ کو تلوار سے سیدھا کردیں گے) عبد اللہؓ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ عُیَینہ بن حِصن مدینہ آئے اور عمر فاروق سے ملے۔ انھوں نے کہا ھی یاابنَ الخطاب، فو اللہ ما تعطینا الجزل ولا تَحْکُمُ فِیْنَا بِالْعَدْلِ اے خطاب کے بیٹے، خدا کی قسم تم نہ ہم کو کچھ دیتے ہو، نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔

عمر فاروق یہ سن کر غصہ میں آ گئے اور اٹھے کہ آدمی کو ماریں۔ یہ دیکھ کر حُر بن قیس نے کہا: اے امیر المومنین'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''معاف کرو اور جاہلوں سے درگزر کرو۔'' یہ ایک جاہل آدمی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں:

واللہ ما جاوزھا عمر حین تلاھا علیه وکان وقّافا عند کتاب اللہ تعالیٰ (بخاری)

خدا کی قسم قرآن کی آیت سننے کے بعد عمر نے مطلق تجاوز نہیں کیا۔ وہ خدا کی کتاب پر بہت زیادہ رکنے والے آدمی تھے۔

غزوۂ ذات السلاسل (8ھ) میں اولاً عمرو بن العاص 300 کے لشکر کے ساتھ وادی القری کی طرف روانہ کئے گئے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ بن الجراح کو دوسو مہاجرین وانصار کے ساتھ روانہ کیا اور ان کو جھنڈا بھی عطا فرمایا۔ رخصت کرتے ہوئے آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ تم اور عمرو بن العاص دونوں مل کر کام کرنا، اختلاف مت کرنا (اذا قدمتَ علی صاحبک فتطاوعا ولا تختلفا)

جب وہ عمروؓ بن العاص کے پاس پہنچے تو ابوعبیدہؓ الجراح نے چاہا کہ لوگوں کی امامت کریں۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ آپ بطور مدد کے بھیجے گئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ میری امامت کریں جب کہ میں امیر ہوں۔ ابوعبیدہؓ کے دستہ نے جس میں ابوبکر و عمر جیسے لوگ تھے

،کہا کہ عمرو بن العاص اپنے دستہ کے امیر ہیں اور ابوعبیدہؓ اپنے دستہ کے۔مگر عمرو بن العاص نے اس تقسیم سے اتفاق نہیں کیا اور کہا تم لوگ میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہو، اصل قائد میں ہوں (انما انتم امددت بکم فانا القائد) اب ابوعبیدہ بن الجراح نے اپنا حق واپس لے لیا اور کہا: رسول اللہ نے مجھ کو جو آخری نصیحت کی تھی ،وہ یہ تھی کہ تم اور عمرو بن العاص دونوں مل کر کام کرنا اختلاف مت کرنا، اس لیے میں کسی حال میں جھگڑا نہیں کروں گا:

وانك والله ان عصيتني لاطعتك خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا۔

اس قسم کی ناخوش گوار باتیں جب کسی کی زندگی میں پیش آتی ہیں تو فوراً اس کی انا بپھر اٹھتی ہے۔ایسے نازک مواقع پر اپنے کو عجز اور عبدیت کے دائرہ میں محدود رکھنا، جیل جانے اور پھانسی پر چڑھنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔اس امتحان میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو اپنی ذات کی نفی کر کے خدا کی بندگی میں داخل ہوئے ہوں۔

فراست مومن

ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله مومن کی فراست سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اگر ایک طرف عالم آخرت کی حقیقتوں کو آدمی کے اوپر منکشف کرتا ہے تو دوسری طرف وہ موجودہ دنیا کے حقائق بھی اس پر کھولتا ہے، حتیٰ کہ اس کی نظر اتنی بے پناہ ہو جاتی ہے کہ دنیا کے معاملات میں نہایت عاقلانہ فیصلے کرے اور ایسے اقدامات تجویز کرے جس کو فیصلہ کن انجام تک پہنچنے سے کوئی روک نہ سکتا ہو۔

یہاں میں بطور مثال صرف دو حوالوں کا ذکر کروں گا۔عمر فاروق نے ایک بار فرمایا:

ليس العاقل الذی يعرف الخير من الشر ولكنه الذی يعرف خير الشرين (العبقريات 505)

عقلمند وہ نہیں ہے جو خیراور شر کو جانے ۔ عقلمند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کیا ہے۔

خلیفہ دوم کے اس قول میں زندگی کے معاملات کا نہایت گہرا شعور پایا جاتا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے خیروشر میں انتخاب (Choice) کا موقع ہو۔ جب کہ یہ امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ دو ناپسندیدہ صورت حال میں سے اس صورت حال کو قبول کرلیا جائے جو ''خیر'' کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا موقع دیتی ہو۔ جو چیز آج حاصل نہیں ہو رہی ہے، وہ کل مزید تیاریوں کے بعد حاصل ہو جائے ___ خلیفہ دوم نے اپنے اس مختصر جملہ میں دنیا کی آدھی سیاست بتادی ہے۔اس گہرے سیاسی راز تک وہ اس لیے پہنچ سکے کہ وہ ردعمل کی نفسیات سے الگ رہ کر معاملات پر غور کر سکتے تھے۔

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں اٹھنے والی اسلامی تحریکوں کی مثال سے اس قول کی حکمت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے ۔ان ملکوں کے اسلامی رہنماؤں کا مقصد غیر اسلامی طرز کے حکمرانوں کو ہٹا کر اسلامی طرز کے حکمرانوں کو برسرِ اقتدار لانا تھا۔انھوں نے یہ فرض کرلیا کہ وہ اس حالت میں ہیں کہ خیر (اسلامی نظام) اور شر (سیکولر نظام) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکیں ۔ انھوں نے ''شر'' کو ختم کرنے کی جد جہد شروع کردی تا کہ اس کے بعد ''خیر'' کو اوپر آنے کا موقع مل جائے ۔ اکثر ملکوں میں ، دوسری سیاسی طاقتوں کے ساتھ متحدہ محاذ میں شریک ہوکر، وہ مفروضہ شر کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوگئے ۔(انڈونیشیا میں ولندیزی ،مصر میں شاہ فاروق، ہندستان میں انگریز، پاکستان میں ایوب اور بھٹو، وغیرہ) مگراس کامیابی کے بعد جوانجام سامنے آیا، وہ صرف یہ تھا کہ فاروق کی جگہ ناصر، ایوب کی جگہ بھٹو، ولندیزی کی جگہ سوئیکارنو اور مستعمرین کی جگہ اکثریت کرسیٔ اقتدار پر قابض ہوگئی ۔ گویا وہ ایک شر اور دوسرے شر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی پوزیشن میں تھے نہ کہ حقیقۃً خیروشر میں سے کسی ایک کو۔ان تحریکوں نے جو طاقت ایک شر کو ہٹا کر دوسرے شر کو لانے میں خرچ کی ، اسی طاقت کو اگر وہ اسلام کے اشاعت واستحکام میں لگاتے تو وہ زیادہ بہتر طور پر ''خیر'' کی منزل کی طرف سفر کر سکتے تھے۔

علی بن ابی طالب کے زمانہ میں تحکیم کا جو واقعہ پیش آیا، اس کے بعد آپ کی فوج سے تقریباً 10 ہزار آدمی الگ ہو گئے جو عام طور پر خوارج کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ خلیفہ چہارم کے خلاف سخت غم وغصہ میں مبتلا تھے اور آپ سے جنگ کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ خوارج ہمارے اوپر حملہ آور ہوں، ہم خود بڑھ کر ان کے اوپر حملہ کریں اور ان کا خاتمہ کر دیں۔ علی بن ابی طالب نے فرمایا:

لا اقاتلهم حتى يقاتلوني وسيفعلون (عباس محمود العقاد، العبقریات الاسلامیہ دار الآداب بیروت 1966، صفحہ 664)

میں ان سے نہیں لڑوں گا جب تک وہ خود مجھ سے لڑنے کے لیے نہ آئیں۔ اور وہ ضرور ایسا کریں گے۔

خلیفہ چہارم کے یہ دس ہزار ساتھی آپ سے بگڑ کر اور آپ کو مطعون کر کے نہایت نازک موقع پر آپ سے الگ ہو گئے تھے۔ اگر آپ بھی انھیں کی طرح منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے تو آپ کبھی یہ جملہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر آپ ایک غیر متاثر ذہن کے تحت پورے واقعہ کا مطالعہ کر رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس گہرے راز کو پالیا کہ خوارج کی یہ جماعت انتہائی جذباتی لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان کو غصہ اور نفرت نے ہم سے جدا کیا ہے۔ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا لوگ زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتے۔ ان کی بے صبری ضرور ان کو ابھارے گی کہ وہ ہمارے اوپر حملہ کریں۔ ایسی حالت میں جارحیت کا الزام ہم اپنے سر کیوں لیں۔ ہمیں ان کی طرف سے ہونے والی جارحیت کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب وہ جارحیت کر کے ہمارے لیے جنگ کا جواز پیدا کر دیں، اس وقت زیادہ بہتر طور پر ہمارے لیے یہ موقع ہوگا کہ ان کے اوپر بھرپور حملہ کر کے ان کا استیصال کر دیں۔

قابل پیشین گوئی کردار

قرآن کی سورہ نمبر 67 میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی کائنات میں کوئی ''تفاوت'' نہیں۔ تفاوت کے معنی ہیں فرق، عدم مطابقت۔ تفاوت الشیئان: دو چیزوں کا ایک دوسرے سے

مختلف ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے، اس میں مطلوب اورعمل کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ خدا کا جو تخلیقی منصوبہ ہے، اسی کے مطابق عملاً ساری کائنات چل رہی ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ساری کائنات مکمل طور پر قوانین فطرت کے مطابق ہے۔ یہ مطابقت اتنی زیادہ ہے کہ کائنات میں ہونے والے واقعات کی نہایت صحت کے ساتھ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ جب ہم قوانین فطرت کو جان لیں تو ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں حالت میں فلاں قسم کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ پانی کو آگ پر رکھنے سے لے کر خلائی کشتی کو سیارہ کی طرف بھیجنے تک ساری سرگرمیاں اسی لیے ہیں کہ ہم کو یقین ہے کہ کائنات کی ہر چیز مکمل طور پر اپنے قانون کی پروی کرتی ہے، وہ اس سے منحرف نہیں ہوتی۔

فکروعمل کی یہ مطابقت انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مادی کائنات کے لیے قوانین طبیعی مقرر کئے ہیں اور ساری کائنات کامل یکسوئی کے ساتھ اس کی پیروی کررہی ہے۔ اسی طرح اس نے انسان کے لیے قوانین شرعی مقرر کئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس سے ہم آہنگ ہوکر اپنی زندگی گزارے۔ زمین وآسمان کو خدا نے بزور اپنے مقررہ قوانین کا تابع بنادیا ہے، انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو قوانین کے مطابق بنائے۔ طبیعی دنیا، جس طرح قوانین قدرت کے تحت کامل طور پر قابل پیشین گوئی (Predictable) ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ، اخلاقی اعتبار سے، انسان قابل پیشین گوئی بن جائے۔ مومن اپنے ذاتی ارادہ کو خدا کے ارادہ کے تابع کردیتا ہے، اس لیے وہ قابل پیشین گوئی ہوتا ہے۔ مومن سے معاملہ کرتے وقت ایک شخص پیشگی طور پر اندازہ کرسکتا ہے کہ اس کو کس قسم کے ردعمل سے سابقہ پیش آئے گا۔

حسن بصری تابعی نے نفاق (خلاف ایمان حالت) کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔ من النفاق اختلاف القلب واللسان واختلاف السرّ والعلانية واختلاف الدخول والخروج (جامع العلوم والحکم، صفحہ 377)

نفاق یہ ہے کہ قلب اور زبان میں فرق ہو، چھپے اور کھلے میں فرق ہو، داخل ہونے

اور خارج ہونے میں فرق ہو۔

اصحاب رسول کے ایمان نے اس قسم کے فرق کو ان کی زندگیوں سے مٹا دیا تھا۔ جس طرح مشین کے رہنما پرچہ کو دیکھ کر ایک آدمی سمجھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح عمل کرے گی، اسی طرح قرآن وسنت کو دیکھ کر ایک شخص معلوم کر سکتا تھا کہ اصحاب رسول کا ردعمل کسی معاملہ میں کیا ہوگا۔ ــــــ وہ جانتا تھا کہ ایک صحابی سے جب عہد و پیمان کا کوئی معاملہ ہوگا تو لازماً اس کو پورا کرے گا (بقرہ 177)۔ کوئی مالی لین دین ہوگا تو اس کی ٹھیک ٹھیک ادائگی کی جائے گی (مائدہ:۱) اگر کسی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے تو عدل کے خلاف رویہ کا اس کو سامنا کرنا نہیں ہوگا (مائدہ8) وہ حاکم ہو یا ماتحت، دونوں حالتوں میں وہ انھیں حدود پر قائم رہے گا جو اس کے رب نے اس کے لیے مقرر کر دیئے ہیں (توبہ 112)۔ اگر وہ کسی کے اوپر غلبہ پالے تو وہ ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کرے گا (من کظم غیظا وھو قادر علی ان ینفذہ ـ ـ ـ ـ ابوداؤد، ترمذی) اس کی غلطی کی گرفت کی جائے گی تو اس کو عزت کا سوال بن کر وہ اپنی غلطی سے لپٹا نہیں رہے گا بلکہ صاف لفظوں میں اعتراف کر لے گا (بقرہ 206) اس سے کسی بات کو منوانے کے لیے طاقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ایک لفظی دلیل اس سے کوئی صحیح بات منوانے کے لیے کافی ہوگی (محمد۔ 3) حتیٰ کہ صحابی کے بارے ایک شخص یہاں تک یقین رکھ سکتا تھا کہ وہ اس معاملہ پر اپنا معاملہ نہیں کرے گا (لایَبِعْ بَعضُکم علیٰ بیعِ بعض۔ مسلم) اگر کوئی ایسی بات سامنے آئے جس کی بابت وہ علم و مطالعہ نہ رکھتا ہو، تو وہ صاف طریقہ سے کہہ دے گا کہ میں نہیں جانتا (من لم یعلَمْ فَلیقُل اللہ اعلم ، بخاری) ــــــ مادی کائنات ''طوعاً وکرھاً'' خدا کے منصوبہ کے مطابق بنی ہوئی ہے۔ اصحاب رسول نے اپنی مرضی سے اپنے آپ کو خدائی منصوبہ کے مطابق بنالیا تھا۔ رضی اللہ عنہم رضوا عنہ (بینہ)

اصحاب رسول کا یہی قابل پیشین گوئی کردار ان کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ایک آدمی نفس و شیطان کے قبضہ میں ہو تو پیشگی طور پر یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی معاملہ میں وہ کس قسم کا مظاہرہ کرے گا۔ مگر جب آدمی اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں خدا کا بندہ بنالے تو وہ اسی طرح قابل پیشین گوئی بن جاتا ہے جس طرح خدا کی بقیہ کائنات۔

موجودہ زمانے میں بعض مشینی معاشروں نے ٹکنکل پہلو سے اپنے کو قابل پیشین گوئی بنانے کی کوشش کی ہے۔ایک ہندستانی سیاح جاپان کی ٹرین میں سفر کررہا تھا۔اس نے دیکھا کہ اسٹیشنوں کے نام صرف جاپانی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔جب کہ جاپانی ریلوے اپنا ٹائم ٹیبل انگریزی میں بھی فراہم کرتی ہے۔ہندستانی سیاح نے اپنے ایک جاپانی ہم سفر سے شکایت کی کہ آپ لوگ اسٹیشنوں کے بورڈ پر صرف جاپانی زبان میں نام لکھتے ہیں، میرے جیسا آدمی کیسے جانے کہ اس کا مطلوبہ اسٹیشن آ گیا۔"اس کا حل بہت آسان ہے۔" جاپانی نے مسافر نے کہا" آپ اپنی گھڑی کو صحیح رکھئے اور انگریزی ٹائم ٹیبل جو آپ کے پاس ہے،اس میں دیکھ لیجئے کہ آپ کے مطلوبہ اسٹیشن پر ٹرین کے پہنچنے کا وقت کیا ہے۔آپ کی گھڑی کی سوئی جب مقررہ وقت پر پہنچے گی تو آپ کی گاڑی اسی اسٹیشن پر کھڑی ہوگی۔"

منصوبہ اور عمل درآمد کے درمیان یہ مطابقت جو بعض مشینی معاشروں نے ٹکنکل سطح پر حاصل کی ہے،یہی انسان سے شرعی اور اخلاقی اعتبار سے مطلوب ہے۔اصحاب رسول،انسانی تاریخ میں،اس کا معیار کا سب سے کامیاب نمونہ تھے۔ ان کے بارے میں پیشگی طور پر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ کسی معاملہ میں ان کا رویہ کیا ہوگا۔اور اگر بشری کمزوری یا بھول چوک سے کبھی ان کے عقیدہ اور عمل میں فرق آتا تو یاددہانی کے بعد فوراً اس کی اصلاح کر لیتے تھے:

ذهب بلال الى عمر مستاذنًا فقال له الخادم اِنه نائم ۔فساله كيف تجدون عمر ۔قال خير الناس الاانه اذاغضب فهوامرعظيم ۔ قال بلال :لو كنتُ عنده اذاغضب قرأت عليه القرآن حتى يذهبَ غضبه (العبقریات الاسلامیہ،صفحہ 397)

بلال ایک روز عمر فاروق کے یہاں ملاقات کے لیے گئے۔خادم نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں۔ بلال نے خادم سے پوچھا،تم لوگ عمر کو کیسا پاتے ہو۔خادم نے جواب دیا،وہ بہترین انسان ہیں۔مگر جب وہ غصہ میں آجائیں تو ان کا غصہ بڑا سخت ہوتا ہے۔بلال نے کہا: اگر میں ان کے غصہ کے وقت ہوتا تو میں ان کے سامنے قرآن پڑھتا۔اس کے بعد ان کا غصہ ختم ہوجاتا۔

حسنین: اسلامی تاریخ کے دو علامتی کردار

حسن اور حسین، اسلامی تاریخ میں، دو مختلف قسم کے طریقِ کار کی علامت ہیں۔ حسین، سیاسی طریق کار کی علامت ہیں اور حسن غیر سیاسی طریق کار کی۔ امام حسین نے وقت کے مسلم حکمراں سے ٹکرا کر جس سیاسی مقصد کو حاصل کرنا چاہا، اسی مقصد کو امام حسن نے ٹکراؤ کے میدان سے واپسی کے ذریعہ حاصل کیا۔ اگر چہ امام حسین کا کردار اتنا مشہور ہوا کہ ہر آدمی اس سے واقف ہو گیا۔ جب کہ امام حسن کے کردار سے، اس کی ساری عظمتوں کے باوجود، بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس عظیم کردار کی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔

امام حسین بن علی (4-61ھ) کی چھاپ بعد کی اسلامی تاریخ پر اتنی زیادہ ہے کہ آنجناب، کم از کم عملاً، اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی علامت بن گئے ہیں۔ مسلمان ہر سال جس دھوم سے ''10 محرم'' کی یادگار مناتے ہیں، کسی بھی دوسرے دن کی یادگار اس طرح نہیں مناتے۔ حتّٰی کہ شاید ''12 ربیع الاول'' کی بھی نہیں۔ عام خیال کے مطابق اسلام کی روح یہ ہے کہ آدمی ناحق کے آگے سر نہ جھکائے۔ خواہ اس راہ میں لڑ کر اس کو اپنی جان دے دینی پڑے۔ اسی کا نام، لوگوں کے نزدیک، شہادت ہے۔ یہ شہادت اپنی اعلیٰ ترین شکل میں امام حسین کی زندگی میں متمثل ہوئی ہے۔ آپ کے ساتھ، عام روایت کے مطابق، کل 72 آدمی تھے۔ دوسری طرف آپ کے مقابلہ کے لیے چھ ہزار کا لشکر پورے ساز وسامان کے ساتھ موجود تھا۔ مگر آپ ظالم حکمراں کے آگے نہیں جھکے اور لڑ کر اپنی جان دے دی:

سر داد مگر نداد دست در دست یزید

عجیب بات ہے کہ اسلامی تاریخ کی یہ سب سے زیادہ مشہور بات نہ اسلام کے مطابق ہے اور نہ خود تاریخی واقعات کے مطابق۔ اسلامی اور تاریخ دونوں اس تصویر کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

واقعات کیا کہتے ہیں

اب دیکھئے کہ اصل تاریخی تصویر کیا ہے۔ مکہ میں قبیلہ قریش (بنو عبد مناف) کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک بنو ہاشم۔ دوسرے بنو امیہ۔ ان دونوں میں قدیم زمانہ سے خاندانی رقابت چلی آ رہی تھی۔ بنو ہاشم میں پیغمبر پیدا ہوئے تو ہاشمیوں میں تو صرف ایک شخص عبد العزیٰ) آپؐ کا دشمن بنا۔ مگر اموی گھرانے کے لوگ عام طور پر آپؐ کے مخالف ہو گئے۔ تاہم ان کی مخالفت کامیاب نہ ہو سکی۔ فتح مکہ (8ھ) کے بعد، عرب کے دوسرے قبائل کی طرح، بنو امیہ بھی اسلام میں داخل ہو گئے۔ عہد رسالت اور بعد کو خلافت راشدہ کے زمانہ میں ان کے لائق افراد نے مختلف اسلامی عہدے حاصل کئے۔ خلیفہ سوم عثمان بن عفان جو کہ اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے زمانہ (35-24) میں بنو امیہ کا اثر ورسوخ کافی بڑھ گیا۔ اس کے بعد جب علی بن ابی طالب کا انتخاب ہوا، جو پہلے ہاشمی خلیفہ تھے، تو بنو امیہ کی رقابت جاگ اٹھی۔ خون عثمان کے مسئلہ نے ان کا ساتھ دیا اور انھوں نے خلیفہ چہارم کی بیعت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ آپ کا پورا زمانہ خلافت (40-35ھ) باہمی خانہ جنگیوں میں گزرا۔ یہاں تک کہ آپ ایک جنونی مسلمان کے ہاتھ سے شہید کر دیئے گئے۔

علی بن ابی طالب کے بعد آپ کے صاحبزادہ حسن بن علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ صرف عراق اور خراسان (ایران) کی خلافت امام حسن کے حصہ میں آئی تھی۔ بقیہ تمام ممالک، یمن، حجاز، شام فلسطین، مصر وغیرہ معاویہ بن ابی سفیان اموی کے زیر قبضہ تھے۔ جنھوں نے علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت نہیں کی تھی اور اب حسن کی خلافت کو تسلیم کرنے سے بھی انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ربیع الاول 41ھ میں صورت حال اس نوبت کو پہنچ چکی تھی کہ ایک طرف امام حسن کے ساتھ چالیس ہزار سے زیادہ مسلح افراد تھے جو موت پر بیعت کئے ہوئے تھے۔ دوسری طرف امیر معاویہ کے جھنڈے کے نیچے ساٹھ ہزار کا لشکر مرنے مارنے پر تیار تھا۔ امام حسن نے خیال کیا کہ میرے والد کی پانچ سالہ خلافت کے زمانہ میں مسلمان خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوتے رہے۔ اب اگر میں خلافت پر اصرار کرتا ہوں تو عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ باہمی قتل وخون

مزید نامعلوم مدت تک جاری رہے گا۔ امام حسن اگر چہ حق پر تھے اور وہی مما لک اسلامی کے جائز خلیفہ تھے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ فریق ثانی ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے، وہ خود ہی میدان مقابلہ سے ہٹ گئے اور خلافت کا عہدہ امیر معاویہ کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد 20 سال (60۔41ھ) تک حالات پر سکون رہے۔ اسلامی قوتیں آپس کی جنگ کے بجائے اسلام کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں لگ گئیں۔ امیر معاویہ کے انتقال (رجب 60ھ) کے بعد خلافت کا مسئلہ دوبارہ زندہ ہوا۔ امام حسین، جو اپنے بڑے بھائی کی دست برداری خلافت سے خوش نہ تھے، انھوں نے امیر معاویہ کے لڑکے یزید بن معاویہ (64۔25ھ) کی خلافت کو ماننے سے اسی طرح انکار کر دیا جس طرح اس سے پہلے معاویہ بن ابی سفیان نے ان کے والد علی بن ابی طالب کی خلافت کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ یہیں سے امام حسین بن علی (61۔4ھ) کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جس کی یاد ہر سال 10 محرم کو منائی جاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یزید بن معاویہ نے دمشق کے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد اپنے مدینہ کے والی عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا کہ لوگوں سے میرے نام پر بیعت لو۔ ولید نے لوگوں کو جمع کیا تو امام حسین نے فوری طور پر بیعت ہونے سے معذوری ظاہر کی۔ اگلے روز وہ خاموشی کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو لے کر مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ تاہم مکہ بھی ان کے لیے سکون کی جگہ نہ بن سکا۔ کیونکہ مکہ کے لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ صورت حال امام حسین پر اس قدر گراں تھی کہ وہ اور ان کے اہل خاندان مکہ میں عبداللہ بن زبیر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو عملاً اس وقت مکہ کے حاکم تھے۔

خون عثمان کے مسئلہ نے مکہ اور مدینہ کو خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کے لیے نامساعد بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے مدینہ کو چھوڑ کر کوفہ (عراق) کا قیام اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح اسلام کا دار الخلافہ 36ھ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ امام حسن نے خلافت سے دست برداری (41ھ) کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر دیا اور اپنے سابق وطن (مدینہ) کی طرف لوٹ آئے۔ کوفیوں کی نفسیات کے بارے میں عرب شاعر فرزدق نے نہایت صحیح طور

پر امام حسین سے کہا تھا: ''اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں بے نیام نہیں ہوسکتیں۔'' یزید کو جب خلافت کا عہدہ ملا تو اہل کوفہ کی محبتِ اہل بیت جوش میں آئی۔ انھوں نے امام حسین کو خطوط لکھنے شروع کئے کہ آپ کوفہ آجائیں۔ ہم سب لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے۔ اس قسم کے تقریباً ڈیڑھ سو خطوط کوفہ سے مکہ پہنچے۔

امام حسن صورت حال کی نزاکت کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین کو وصیت کردی تھی کہ تم کبھی کوفہ والوں کی باتوں سے فریب مت کھانا۔ میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ نبوت اور خلافت ہمارے خاندان میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے تمھارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملہ میں خاموش رہو۔ مگر امام حسین کی حوصلہ مند طبیعت اس قسم کے کسی مشورہ پر راضی نہ ہوسکتی تھی۔ انھوں نے کوفہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل بن ابی طالب کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم پہلے کوفہ جاؤ اور وہاں بالواسطہ طور پر میرے لیے بیعت لو۔ جلد ہی میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔ مسلم بن عقیل اس منصوبہ سے متفق نہ تھے۔ تاہم امام حسین کے اصرار پر وہ کوفہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

مسلم بن عقیل جب امام حسین کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ پہنچے تو وہاں بہت سے لوگوں نے ان کی پذیرائی کی۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً 18 ہزار آدمی نیابۃً ان کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ یزید کو جب خبر ہوئی تو اس نے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ والوں کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا۔ عبید اللہ بن زیاد بصرہ سے کوفہ پہنچا اور لوگوں کو جمع کرکے انھیں سخت تنبیہ کی۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل اور ان کے کوفی میزبان ہانی بن عروہ کو اپنے محل کی چھت پر کھڑا کرکے قتل کرادیا۔ ان کے کٹے ہوئے سر اور خون آلود جسم ہوا میں لہراتے ہوئے لوگوں کے سامنے زمین پر گرے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ امام حسین کا ساتھ دینے سے پہلے لوگوں کو سوچ لینا چاہئے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ تمام لوگ خاموش ہوکر اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

مکہ میں امام حسین ان تمام واقعات سے بے خبر رہ کر کوفہ جانے کی تیاری کررہے

تھے۔عبداللہ بن عمرؓ،عبداللہ بن عباسؓ،عمرو بن سعد بن العاصؓ،عبدالرحمن بن حارثؓ اور مکہ کے دوسرے بزرگوں نے امام حسین کو شدت سے منع کیا۔عبداللہ بن زبیر نے کہا کہ آپ کوفہ جانے کے بجائے مکہ کی حکومت قبول فرمائیں۔آپ ہاتھ بڑھائیں۔میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے مدینہ سے خط لکھ کر باصرار منع کیا۔مگر انھوں نے نہیں مانا۔حتّٰی کہ انھوں نے عبد اللہ بن عباسؓ کی اس آخری بات کو ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ عورتوں اور بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر سفر کریں یا کم از کم حج کے بعد روانہ ہوں جس میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔

امام حسین ذی الحجہ 60ھ کے پہلے ہفتہ میں کوفہ کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں عبد اللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔انھوں نے امام حسین سے کہا۔"میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ مکہ واپس چلے جائیں۔۔اگر آپ بنوامیہ سے خلافت چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔اور پھر ہر ایک ہاشمی،ہر ایک عرب اور ہر ایک مسلمان کے قتل پر دلیر ہو جائیں گے۔"مگر امام حسین کی حوصلہ مند طبیعت کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔یزید بن معاویہ اور اس کے والئ عراق عبید اللہ بن زیاد کو سب خبریں مل رہی تھیں۔انھوں نے چھ ہزار کی فوج مختلف مقامات پر لگادی کہ آپ کو کوفہ میں داخل نہ ہونے دیں۔امام حسین کے ساتھ ابتدائی چند سو آدمی تھے۔جب ان کو یزید کی فوج کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو لوگ چھٹنا شروع ہوئے یہاں تک کربلا پہنچتے پہنچتے آپ کے قافلہ کی تعداد بہتّر رہ گئی۔صرف اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگ باقی رہ گئے۔

تاہم آخر وقت میں امام حسین کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔مسلم بن عقیل کے قتل، کوفیوں کی بے وفائی اور یزید کے لشکر جرار کے قابلہ میں آپ کا مختصر قافلہ،ان چیزوں نے آپ کی کامیابی کے امکان کو ختم کر دیا تھا۔آپ نے سمجھ لیا کہ تصادم کا واحد مطلب ہے موت۔امام حسین ایک انتہائی شریف اور بہادر آدمی تھے۔جنگ یا موت انھیں خوف زدہ نہیں کر سکتی تھی۔مگر اپنے ساتھیوں نیز عورتوں اور بچوں کے لیے اپنے دل میں جذبۂ رحم کی پیدائش کو روکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ آخر وقت میں وہ یزید سے صلح

کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ انھوں نے یزید کے والی عبیداللہ بن زیاد کے سامنے تین تجویزیں پیش کیں:

1۔ میں مکہ واپس چلا جاؤں اور وہاں خاموشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاؤں۔
2۔ مجھے کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔
3۔ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلوں۔ (إمّا ان اضع يدي في يديزيد ، الطبری، جلد 4، صفحہ 313)

امام حسین کے رویہ میں اس تبدیلی سے یزید کی فوج کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ اگرچہ دونوں کربلا کے میدان میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ اس کے باوجود ''نواسۂ رسول'' کے احترام کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے لوگ مل کر نمازیں ادا کرتے تھے اور اکثر حسین ہی لوگوں کے امام ہوتے تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کے پاس امام حسین کا پیغام پہنچا تو وہ بھی بہت خوش ہوا کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر مسئلہ ختم ہو جائے گا اور امام حسین یزید کے ہاتھ بیعت کرلیں گے۔ لیکن عبید اللہ بن زیاد کا ایک مشیر شمر ذی الجوشن، جو نہایت بری طبیعت کا آدمی تھا، اس نے عین وقت پر عبید اللہ بن زیاد کے ذہن کو پھیر دیا۔ اس نے سمجھایا کہ امام حسین کے مسئلہ کو آخری طور پر ختم کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ عبید اللہ بن زیاد کے حکم پر اس کی فوجوں نے امام حسین کے لیے لوٹنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ وہ جس سمت سے بھی واپس ہونا چاہتے، ادھر ہی ایک فوج ان کا راستہ روکنے کے لیے موجود رہتی۔

10 محرم 61ھ کو یزید کی فوجوں کی طرف سے حملہ کا آغاز ہوا۔ امام حسین کے قافلہ نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ سارے لوگ کٹ گئے اور آخر میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف امام حسین بچ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یزید کی فوج کا ہر آدمی آپ پر وار کرنے سے بچتا تھا اور طرح دے جاتا تھا۔ آخر میں وہی شمر ذی الجوشن آگے بڑھا جس نے عبید اللہ بن زیاد کو آپ کے خلاف جنگ کے لیے اکسایا تھا۔ اس نے چند آدمیوں کو لے کر

اس بہادر انسان پر قاتلانہ حملہ کیا اور آپ کا کام تمام کر دیا۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ شمر ذی الجوشن امام حسین کا پھوپھا لگتا تھا اور عمرو بن سعد، جس نے امام حسین کے قافلے کی طرف پہلا تیر پھینکا تھا، امام حسین کا ماموں۔

امام حسین کے معاملہ کی یہ تصویر جو طبری اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں ملتی ہے، وہ اس سے کافی مختلف ہے جو ہمارے شعراء اور مقررین ومحررین پُرجوش الفاظ میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام حسین کا سیاسی اقدام بڑی حد تک ذاتی حوصلہ کے تحت وجود میں آنے والا اقدام تھا۔ اس وقت جو صحابہ کرام زندہ تھے، وہ سب اس معاملہ میں آپ کے خلاف تھے۔ مکہ اور مدینہ کے بزرگ ان کو اس اقدام سے روک رہے تھے، حتیٰ کہ خود آپ کے اعزہ بھی آپ سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کی حوصلہ مند طبیعت کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ تاہم آخری دنوں میں معاملہ کی نزاکت ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ٹھیک اسی رائے پر پہنچ گئے جہاں ان کے بڑے بھائی امام حسین اپنی دور اندیشی سے 20 سال قبل پہنچے تھے۔ یزید بن معاویہ جو اپنے دار الخلافہ دمشق (شام) میں مقیم تھا۔ اگر وہ خود کربلا (عراق) کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ موجود ہوتا اور حسین و یزید کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ امام حسین کی آخری شرط پر راضی ہو جاتا ـــــــــ یزید اُس امام حسین کا دشمن تھا جو اس کا سیاسی حریف ہو۔ بیعتِ خلافت کے بعد امام حسین اس کے لیے ''نواسۂ رسول'' ہوتے اور وہ ان کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن کی طرف لوٹا دیتا۔ مگر یزید کو امام حسین کی مصالحانہ پیش کش کا علم صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کا سر ان کے تن سے جدا کیا جا چکا تھا۔

سیاسی حریف کا مسئلہ

امام حسین نے مقابلہ کے آخری دن (10 محرم 61ھ) کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر کی، وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے، دیگر باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا: ''عیسیٰ کا گدھا بھی اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قیامت تک اس کی پرورش کرتے۔

تم کیسے مسلمان اور کیسے امتی ہو کہ اپنے رسول کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ دراصل ''رسول کے گدھے'' کا معاملہ ہوتا تو مسلمان بھی اس کو پوجتے۔ رسول کے نواسے کا احترام کرنے کے لیے وہ دل وجان سے تیار تھے۔ مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ رسول کا نواسہ (امام حسین) ان کا سیاسی حریف بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور سیاسی حریف کو کوئی نہیں بخشتا، خواہ وہ عیسائی ہو یا مسلمان۔ وہی یزید جس نے 61ھ میں امام حسین کے استیصال کے لیے ایک ظالم سردار (عبید اللہ بن زیاد) کو مقرر کیا، اسی نے 62ھ میں مدینہ پر چڑھائی کے لیے مسلم بن عقبہ کو روانہ کیا تو اس کو تاکیدی حکم دیا کہ حسین کے صاحبزادے علی بن حسین بن علی (38-95) کا پورا خیال رکھنا اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علی بن حسین (امام زین العابدین) حادثۂ کربلا کے بعد سیاست سے الگ ہو کر مدینہ کے نواح میں مقیم ہو گئے تھے۔ اہل مدینہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہا تو انھوں نے بیعت لینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''میرے باپ اور دادا دونوں خلافت کے معاملہ میں اپنی جانیں کھو چکے ہیں۔ کیا میں بھی اس میں مشغول ہو کر اپنے کو قتل کراؤں۔'' کربلا کی جنگ کے خاتمہ کے بعد امام حسین کے بچے ہوئے اہل خانہ کے ساتھ یزید نے نہایت عزت واحترام کا برتاؤ کیا اور ان کو ہر طرح کی مدد دے کر مدینہ کی طرف واپس بھیجا۔ یزید نے حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر وغیرہ سے بیعت لینے کے لیے جنگ کی۔ مگر عبد اللہ بن عمر سے اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس نے مدینہ میں اپنے عامل ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا کہ عبد اللہ بن عمر بیعت نہ کریں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی جہ یہ تھی کہ اس کو معلوم تھا کہ عبد اللہ بن عمر ایک عابد وزاہد آدمی ہیں۔ ان کے اندر کوئی سیاسی حوصلہ نہیں ہے۔

یزید کے والد معاویہ بن ابی سفیان نے اپنی سیاست کا اصول ایک جملہ میں اس طرح بتایا تھا: انی لا احول بین الناس وبین السنتھم مالم یحولوا بیننا وبین ملکنا (ابن اثیر، تاریخ کامل، جلد 4، صفحہ 5) میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں۔ یزید کو بھی یہی اصول سیات، اگر کلی طور پر نہیں تو بڑی حد تک، وراثۃً ملا تھا۔ حادثہ کربلا

کا ردعمل مدینہ پر یہ ہوا کہ لوگ یزید کی حکومت کے باغی ہو گئے۔ یزید کے ہم قبیلہ (بنوامیہ) اس وقت مدینہ میں تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں آباد تھے، ان کو پکڑنا اور پریشان کرنا شروع کردیا۔ بنوامیہ نے ایک قاصد کے ذریعہ یزید کو مطلع کیا قاصد نے جب دمشق پہنچ کر یزید کو صورت حال کی خبر دی تو اس نے یہ شعر پڑھا:

لقد بدّلوا الحلم الذی فی سجیّتی فبدلتُ قومی غلظة بلیان

بردباری جو میری خصلت تھی، لوگوں نے اس کو بدل دیا۔ اس لیے میں نے اپنی قوم کے ساتھ نرمی کے بجائے سختی اختیار کرلی (الفخری)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام حسین اگر یزید بن معاویہ کے سیاسی حریف نہ بنتے تو آپ کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہوتا۔

امام حسن کا کردار

یزید کے مقابلہ میں جو صورت حال امام حسین کی زندگی میں پیش آئی، یہی اس سے زیادہ شدید شکل میں آپ کے بڑے بھائی امام حسن (50-3ھ) کی زندگی میں معاویہ کے مقابلہ میں پیش آچکی تھی۔ مگر آپ نے اس سے بالکل مختلف ردعمل کا اظہار کیا جس کا نمونہ ہم کو امام حسین کی زندگی میں ملتا ہے۔ یہاں یہ یاددلانا مناسب ہوگا کہ حدیث کی کتابوں میں مناقب کے ذیل میں حسنین کے بارے میں بہت سی روایتیں آتی ہیں۔ تاہم دونوں بھائیوں میں ایک فرق ہے۔ امام حسین کے بارے میں جو صحیح روایات ہیں ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کے لیے زیادہ تر ''محبت'' کا ذکر ہے جو نواسہ ہونے کی حیثیت سے آپ کے لیے بالکل فطری تھی۔ مثال کے طور پر اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

هٰذانِ ابْنای وابنا ابنتی ،اللّٰھم انی احبُّھما فاحبّھما (رواہ الترمذی واسنادہ لین)

یہ دونوں (حسن، حسین) میرے لڑکے ہیں اور میری لڑکی کے لڑکے ہیں۔

خدایا! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر۔

دوسری طرف امام حسن کے بارے میں جو روایات ہیں، وہ نہ صرف سنداً زیادہ قوی ہیں، بلکہ محبتِ فطری سے آگے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً انس بن مالک بتاتے ہیں:

لم یکن اشبه بالنبی صلی الله علیه و سلم من الحسن بن علی

(رواہ البخاری) حسن بن علی سے زیادہ کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نہ تھا۔

صوری اور طبعی مشابہت کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ صحیح روایات میں امام حسین کے لیے کسی تاریخی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب کہ دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن کے بارے میں ایک عظیم کردار ادا کرنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی:

عن ابی بکرة قال: رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم علی المنبر والحسن ابن علی الی جنبه وهو یُقبِل علی الناس مرّةً وعلیه اُخری ویقول: انّ ابنی هذا سیّدٌ، ولعلّ الله ان یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین (رواہ البخاری)

ابوبکرہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ کو منبر پر دیکھا ہے حسن بن علی آپ کے پہلو میں تھے۔ آپ ایک بار لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، دوسری بار ان کی طرف۔ اور فرماتے۔ یہ میرا لڑکا سردار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے۔ (۱)

رسول کی یہ پیشین گوئی امام حسن کی زندگی میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ آپ کی بیعت 40ھ میں اس حال میں ہوئی کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لوگ بنوامیہ کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے، کچھ بنوہاشم کے ___ دونوں میں سے کوئی نہ دوسرے کو ختم کرسکتا تھا اور نہ ہار ماننے کے لیے تیار تھا۔ آپ نے بیعت لی تو آپ نے لوگوں سے یہ بھی اقرار لیا: ”میں جس سے جنگ کروں گا تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح

---

(۱) یہ روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے۔ مثلاً ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں
ان ابنی هذا سید وعسی الله ان یبقیه حتی یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین

کروں تم اس سے صلح کروگے۔'' حضرت علی کی شہادت کے بعد آنجناب کے صاحبزادہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہونا بنوامیہ کے قائد معاویہ بن ابی سفیان کے لیے نئے چیلنج کے ہم معنی تھا۔ وہ اپنے دارالسلطنت دمشق سے ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر کوفہ کی جانب روانہ ہوئے جہاں حسن بن علی مقیم تھے۔ امام حسن کوفہ سے نکلے تو آپ کے ساتھ بھی تقریباً اتنی ہی فوجی طاقت تھی۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں پہاڑ جیسے لشکر (کتائب امثال الجبال) آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ آپ کے والد علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر موت کی بیعت کر چکے تھے۔ اور لڑنے مرنے سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھے۔

دونوں طرف کے لشکر مدائن کے قریب جمع ہوئے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے امام حسن کے نام پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر صلح ہے۔ مناسب یہ کہ آپ مجھ کو خلیفہ تسلیم کر کے میرے ہاتھ پر بیعت ہو جائیں۔ امام حسن نے غور و فکر کے بعد اس پیش کش کو منظور کر لیا۔ چھ ماہ خلیفہ رہ کر 41ھ میں امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور خلافت ان کے سپرد کر دی۔

امام حسن کے پُرجوش حامیوں کے لیے یہ ''ذلت'' ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور وغل کیا۔ آپ کو عار المسلمین (مسلمانوں کے لیے ننگ) اور مذلّ المومنین (مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے) کا خطاب دیا۔ حتّٰی کی آپ کو کافر بتایا، آپ کے کپڑے نوچے، آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا:

''خلافت اگر معاویہ کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا، اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔''

صلح کے بعد امیر معاویہ نے امام حسن کے لیے ایک لاکھ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ (حافظ ذہبی، العبر، جلد ۱، صفحہ 48)

ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا۔ 41ھ جو اسلامی تاریخی میں، صفین وجمل کے بعد، تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام

کی اشاعت وتوسیع میں صرف ہونے لگی ___ پیچھے ہٹنا سب سے بڑی بہادری ہے۔اگر چہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بہادری کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

پیغمبر اسلام کی وفات (۱۱ھ) کے بعد 20 سال تک اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کی فتح کی خبر آتی تھی۔مگر تیسرے خلیفہ کے آخری زمانہ میں جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں۔انھوں نے تقریباً 10 سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بند دروازہ کو جس شخص نے دوبارہ کھولا، وہ امام حسن ہی تھے۔ 41ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔مگر حقیقۃً یہ زیادہ بہتر طور پر میدان عمل کی طرف جانا تھا۔ یہ مسلمانوں کی قوت کو باہمی مقابلہ آرائی سے ہٹا کر خارجی میدان میں جدوجہد کی طرف موڑ دینا تھا۔اس واپسی نے اسلام کی تاریخ میں کامیابی کے نئے امکانات کھول دیئے۔امام حسن اگر خلافت پر اصرار کرتے تو عجب نہیں کہ اسلامی تاریخ پہلی صدی ہجری ہی میں ختم ہو جاتی۔مسلمان آپس میں لڑلڑ کر برباد ہوتے رہتے اور قیاصری واکاسرہ اور یہود و منافقین دوبارہ زندہ ہو کر ہمیشہ کے لیے اسلام کا استیصال کر دیتے تاریخ اسلام کے ہیرو کا انتخاب اگر حسنین میں سے کسی کے لیے کرنا ہو تو بلا شبہ وہ امام حسن ہوں گے۔

پیغمبر کی ہدایات

امام حسن کا یہ مسلک کوئی اتفاقی یا طبعی چیز نہ تھا۔وہ شریعت کی واضح تعلیمات پر مبنی تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بتادیا تھا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کی سیاست میں بگاڑ آنے والا ہے۔ چنانچہ آپ نے انتہائی واضح لفظوں میں حکم دیا تھا کہ 'اصلاح'' کے نام پر تم لوگ آپس میں لڑنے مت لگنا بلکہ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں مصروف رہنا حدیث کی کتابوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے اس قسم کی روایتیں موجود ہیں۔

حضرت حذیفہ کہتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ ''خیر'' کی بابت پوچھتے تھے۔میں آپؐ سے ''شر'' کی بابت سوال کرتا تھا،اس اندیشہ سے کہ کہیں میں اس میں

مبتلا ہو جاؤں۔ میں نے پوچھا، ہم جاہلیت اور شر میں تھے۔ پھر اللہ نے ہم خیر دیا اس خیر کے بعد پھر شر ہے (فهل بعد هٰذا الخير من شر) آپؐ نے فرمایا ہاں:

یکون بعدی ائمة لا یهدون بهُدای ولا یستنّون بسنتی ۔ وسیقوم فیهم رجالٌ قلوبهم قلوب الشیاطین فی جُثمان انس۔ قال حُذیفة قلتُ : کیف اصنع یارسول اللهِ اِن ادرکت ذلك۔ قال تَسمعُ وتطیعُ الامیر وان ضُرِبَ ظهرك واُخِذَ مالك، فاسمع واطع (رواہ مسلم)

میرے بعد ایسے امیر ہوں گے جو میری ہدایت کو نہیں اختیار کریں گے اور میری سنت پر نہیں چلیں گے۔ ان میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو بظاہر انسان ہوں گے مگر ان کے جسم کے اندر شیطانی دل ہوں گے حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا۔ اے خدا کے رسول اگر میں اس زمانہ کو پاؤں تو کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا۔ امیر کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ خواہ تمھاری پیٹھ پر مارا جائے اور تمھارا مال چھینا جائے۔ ہر حال میں سن اور اطاعت کر۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: وَاِلا فمت وانت عاضٌ علی جِذْل شجرة (ورنہ مرجاؤ اس حال میں کہ تم درخت کے ٹھنٹھ سے لپٹے ہوئے ہو۔ (۱)

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ویلٌ للعرب مِن شرٍّ قد اقتراب، افلح من کفَّ یدہ (رواہ ابوداؤد)

خرابی ہے عرب کی اس شر سے جو قریب آ لگا۔ اس میں وہ شخص کامیاب رہے گا جس نے اپنے ہاتھ کو روکا۔

ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے فتنہ سے ڈرایا۔ لوگوں

---

(۱) افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر کی قسم کی جو روایات کتب حدیث میں آئی ہیں، ان سے مراد انفرادی نصیحت ہے۔ اس کا بھی بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو تنہائی میں کیا جائے (سئل ابن عباس عن امر السلطان بالمعروف ونهیه عن المنکر فقال: ان کنت فاعلا ولابد ففیها بینك وبینه۔ جامع العلوم والحکم، صفحہ 71) مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلانے کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے اور حدیث میں اس کو صریح طور پر منع کیا گیا ہے۔

نے پوچھا: ہم کو آپؐ کیا حکم دیتے ہیں (فَمَا تَأمرنا) آپؐ نے فرمایا:

كسّروا فيها قِسِيَّكم وقطّعوا فيها اوتاركم واضربوا سيوفكم بالحجارة۔ والزموا فيها اجواف بيوتكم ۔ فان دُخِل على احدٍ منكم فليكن كخير بنَي آدم

(رواہ ابوداؤد)

اس میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو۔اپنی ثالث کو کاٹ ڈالو۔اپنی تلواروں کو پتھر پر پٹک دو۔اوراپنے گھروں کے اندر بیٹھ رہو۔اگرکوئی تم کو مارنے کے لیے تمھارے گھر میں گھس آئے تو تم آدم کے دولڑکوں میں سے بہتر لڑکے بنو۔(قتل ہوجاؤ مگر قتل نہ کرو)

یہی ہدایت تھی جس پر خلیفہ سوم عثمان بن عفان نے عمل کیا۔آپ محرم 24ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ذی الحجہ 35ھ میں مسلمان بلوائیوں نے آپ کو شہید کر دیا۔جب کہ آپ کی عمر 82 سال تھی ۔اس وقت مدینہ کے وفادار مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے مکان پر موجود تھی اور بلوائیوں کو روکنے کے لیے لڑنے مرنے پر تیار تھی۔مگر خلیفہ سوم نے ان کو قسم دلا دلا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ کرنے سے روکا۔آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتے رہے۔یہاں تک کہ لوگوں نے تلواروں اور نیزوں سے آپ کو قتل کر دیا

خلیفہ سوم کا اس طرح خاموشی سے قتل ہوجانا اتفاقاً نہیں بلکہ ارادۃً تھا۔ یہ دراصل شریعت کے حکم کی تعمیل تھی۔شریعت کے مطابق،اپنی طرف سے جارحیت کا آغاز بندۂ مومن کے لیے کسی حال میں جائز نہیں۔مسلمان دعوت ونصیحت کی راہ سے عمل کرتا ہے نہ کہ قتال کی راہ سے ۔اس کے بعد اگر دوسروں کی طرف سے جارحیت کا آغاز ہوتو دوصورتیں ہیں۔ جارحیت کا آغاز اگر کفار کی طرف سے ہوتو مخصوص شرائط کے تحت اس کے دفاع کا حکم ہے (بقرہ۔90) لیکن جارحیت کا آغاز اگر مسلمان کی طرف سے کیا گیا ہوتو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ دفاع کے طور پر بھی اپنے دینی بھائی پر وار نہ کیا جائے:

لَئِنْ بَسَطْتَ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ (المائدہ:28)

اگر تو نے مجھے مارنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں تجھ کو مارنے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔

خلیفہ سوم نے اسی دوسرے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے مسلمان حملہ آوروں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا اور خاموشی سے شہید ہو گئے۔ وہ آدم کے دو بیٹوں میں سے بہتر بیٹے بن گئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جس خلیفہ نے اصول شریعت کی اتنی بڑی عملی مثال قائم کی تھی، اس کے خون کا انتقام لینے کے لیے، آپ کے بعد، مسلمان پانچ سال (40-35ھ) تک باہم لڑتے رہے۔ ایک خون عثمان کے نام پر ایک لاکھ مسلمانوں کو خود مسلمانوں کی تلواروں نے ذبح کر دیا۔ اس قتل وخون کے باوجود قاتلین عثمان کا مسئلہ خدا کے یہاں فیصل ہونے کے لیے باقی رہ گیا۔

انفرادی لڑائی سے کہیں زیادہ بڑی وہ لڑائی ہے جو ایک قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف کی جائے۔ اس قسم کا ٹکراؤ دنیا وآخرت کی بربادی ہے۔ آنحضرتؐ کو اندازہ تھا کہ اصلاح سیاست کا جذبہ لوگوں کو اپنے حکمرانوں کے خلاف ابھارے گا۔ آپؐ نے لوگوں کو پیشگی طور پر منع فرما دیا کہ اس قسم کی تحریک ہرگز نہ اٹھائیں۔ اپنے حکمرانوں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے کے بجائے ان کو نصیحت کریں۔ اس سے بھی اصلاح نہ ہو تو خاموشی اختیار کریں اور ان کے حق میں اللہ سے دعا مانگنے پر قناعت کریں۔ اس تاکید کی وجہ یہ تھی کہ ایک قائم شدہ حکومت کے خلاف حق کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا فساد میں مزید اضافہ کے سوا کسی اور نتیجہ تک نہیں پہنچاتا:

عَنْ جَرِيرِ بنِ عَبْدِاللہ قَال قالَ لِي رَسُولُ اللہِ صَلّی اللہ علیہ وسلم فی حجة الْودَاعِ: استنصِتِ النَّاسَ، ثُمَّ قَالَ: لَاتَرْجِعُوبَعْدِی كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ (متفق علیہ)

حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن مجھ سے فرمایا۔ ''لوگوں کو چپ رکھو'' پھر فرمایا، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

انھیں ہدایات کا نتیجہ تھا کہ جنگ صفین (36ھ) کے وقت اصحاب رسول دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے۔ مگر مسلمانوں کی اس باہمی لڑائی میں عملاً شریک ہونے والے

اصحاب کی تعداد بمشکل 30 تھی (ابن تیمیہ، منہاج السنہ، جلد ۳، صفحہ 86)

حدیث کی کتابوں میں فتن کے ابواب کے تحت کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جو اس کو غیر مشتبہ طور پر واضح کر رہی ہیں۔ انھیں واضح ہدایات کی بنا پر بعد کو فقہ میں یہ مسئلہ بنا کہ سلطان متغلب کے خلاف خروج (بغاوت) جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے امت میں انتشار اور باہمی قتل و خون وجود میں آتا ہے۔

یہاں اس سلسلے میں چند مزید روایتیں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔

عَن عَوفِ بنِ مالكٍ رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول :خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرارائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم ۔ ولتلعنونهم ویلعنونکم قال: قلنایارسول الله افلا ننابذهم ،قال: لا مااقاموفیکم الصلاۃ (رواہ مسلم)

عوف بن مالک کہتے ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے: تمھارے بہتر امیر وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کے لیے دعا کرو، وہ تمھارے لیے دعا کریں۔ اس کے برعکس تمھارے برے امیر وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔ ہم نے عرض کیا اے خدا کے رسول، ہم ان سے کیوں نہ لڑیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں۔

عن ابی هُنَیْدَۃَ وائلِ بنِ حُجْرٍ رضی الله عنه قال: سأل سَلَمَۃُ بنُ یزیدَ الجُعْفِیُّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم فقال یانبیَّ الله ارأیتہ اِن قامت علینا امراءُ یسألونا حقهم ویمنعونا حقّنافماتامرنا،فاعرض عنه ۔ثم سأله فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ،اسمعوا واطیعوافانماعلیهم ماحمّلوو علیکم ماحُمّلتم (رواہ مسلم)

وائل بن حجر کہتے ہیں کہ سلمہ بن یزید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، اگر ہمارے حاکم ایسے ہوں جو اپنا حق مانگیں اور ہمارا حق نہ دیں تو آپؐ ہم

کو کیا ہدایت دیتے ہیں آپؐ نے منھ پھیر لیا۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا، سنو اور اطاعت کرو۔ جو وہ کریں گے اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے، جو تم کرو گے، اس کے تم ذمہ دار ہو گے۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:من کره من امیره شيئاً فَلْيَصْبِرْ فانه من خرج من السلطان شبرا مات ميتةً جاهليةً (متفق علیہ)

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اپنے امیر کی کوئی بات ناپسند ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ صبر کرے۔ اگر وہ اس کی اطاعت سے ایک بالشت بھی نکلا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔[1]

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول ا لله صلى الله عليه وسلم: انها ستكون بعدی اَثَرَةٌ وامورٌ تنكرونها .قالوا يارسول الله كيف تأمر من ادرك ذلك ،قال : تودون الحق الذى عليكم وتسألون الله الذى لكم (متفق علیہ)

عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے بعد خود غرضی و بے انصافی ہوگی اور ایسی باتیں ہوں گی جن کو تم ناپسند کرو گے ۔لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول۔ پھر آپؐ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تمھارے اوپر جو حق ہے، اس کو ادا کرو۔ اور تمھارا جو حق ہے اس کو خدا سے مانگو۔

عن ابی سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوشك ان يكون خيرَ مالِ المسلم غنمٌ يتبع بها شعَفَّ الجبال ومواقع القطر ، يَفرُّ

---

[1] من خرج من السلطان شبراً مات ميتةٍ جاهلية اور من شَذّ شُذَّ فی النار وغیرہ روایات کا تعلق سیاسی شذوذ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے اندر جو سیاسی نظام بالفعل قائم ہو اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس سے سیاسی علیحدگی جائز نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی علٰحدگی، خواہ وہ اصلاح کے جذبہ سے ہو، صرف بگاڑ میں اضافہ کرتی ہے اور ''حرث ونسل'' کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔

بدینہ من الفتن (رواہ البخاری)

ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاعنقریب مسلمان کا سب سے اچھا سرمایہ بکریاں ہوں گی جن کو لے کروہ پہاڑوں کے اوپر اور بارش کی جگہوں پر چلا جائے (سیاسی) فتنوں کی وجہ سے وہ اپنے دین کو لے کر بھاگے گا۔

پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد کہ تمھارے حکمراں جب تک تم کو نماز پڑھنے دیں، ان سے مت لڑو، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ان سے کبھی نہ لڑو۔ کیونکہ ایسا کوئی بھی مسلم حکمراں نہیں ہوسکتا جس سے لوگ ''نماز'' پر راضی ہوجائیں، پھر بھی وہ ان کی مسجدوں کو ڈھائے اوران کو رکوع وسجدہ نہ کرنے دے _____ تمام مسلم حکمراں جن کو ہم نے ''ظالم'' کے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے، وہ اسی وقت ظالم بنے جب کہ ان کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا۔ اور ''ظلم'' کی یہ قسم اتنی عام ہے کہ ہر صاحب امر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی ادارہ کے ہوں یا غیر سیاسی ادارہ کے۔

دوسری بات یہ ہے اس ہدایت کا مطلب امت کو ''ظالم حکمرانوں کی بے زبان رعیت'' بنانا نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ بڑے اور گہرے کام کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ امت کے افراد میں منفی ذہنیت کے بجائے مثبت ذہنیت کی پرورش کرنا ہے۔ ان کی کوششوں کو تخریب سے ہٹا کر تعمیر کی طرف لگانا ہے۔ یہ اس عظیم حقیقت کی نشان دہی ہے کہ زندگی میں براہ راست اقدام سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز وہ کام ہیں جو بالواسطہ میدانوں میں کئے جاتے ہیں۔ جو اگرچہ ظاہری دھوم دھام سے خالی ہوتے ہیں۔ تاہم وہ اتنے مؤثر ہوتے ہیں کہ بالآخر حریف کو اس زمین ہی سے محروم کر دیتے ہیں جس پر وہ کھڑا ہوا ہے _____ اللہ سے دعا کرنا، ایک دوسرے کے لیے محبت اور خیر خواہی کی فضا پیدا کرنا، دوسروں کے خلاف تحریک اٹھانے کے بجائے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر توجہ دینا، اپنی حق تلفی پر قانع رہ کر دوسروں کے حقوق ادا کرنا، سیاسی محاذ آرائی کا طریقہ چھوڑ کر خاموش تلقین کے ذریعہ انسانی فطرت کو جگانا، برسر اقتدار افراد سے ٹکرانے کے بجائے عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرنا، اپنے ممکن دائرہ میں اپنی تعمیری کوششوں کو جاری رکھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے اندر اتھاہ تسخیری امکانات رکھتی ہیں۔

اور اگر کوئی وہ صحیح طور پر ان کو اختیار کر لے تو کوئی چیز اس کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

سیاسی منازعت بے فائدہ

پہلی صدی ہجری کا تجربہ آخری طور پر ثابت کر چکا ہے کہ قائم شدہ سیاسی نظام کے خلاف محاذ بنانا، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو، صرف بگاڑ میں اضافہ کرتا ہے۔ بلکہ نئے نئے مسئلے پیدا کر کے معاملہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ سیاستِ عثمانی کی اصلاح کی تحریک نے قبیلہ قریش کی دو شاخوں، بنو امیہ اور بنو ہاشم، کے قدیم خاندانی جھگڑے کو نئی شدید تر شکل میں زندہ کر دیا۔ اس نے نو مسلم یہودی عبد اللہ بن سبا کو وہ موافق زمین دی جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے ''وصی'' کا عقیدہ ایجاد کیا اور استحقاق خلافت کے سیاسی مسئلہ کو اعتقاد کا مسئلہ بنا ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دائمی طور پر دو متحارب فرقوں (شیعہ اور سنی) میں تقسیم ہو گئے۔ دبی ہوئی عصبیتوں کو موقع ملا کہ وہ ''نظریاتی'' نعروں کے سایہ میں ایک دوسرے کے خلاف اٹھ سکیں۔ عربی لوگ، جو عجمیوں کو حقیر سمجھتے تھے، امیر معاویہ کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو گئے۔ عجمی لوگ، جو عرب اقتدار سے متنفر تھے، علی بن ابی طالب کے لشکر میں جمع ہو گئے۔ اصلاح سیاست کی تحریک صرف فسادِ سیاست پر منتج ہوئی۔ اس نے سارے ممالک اسلامی میں انارکی پیدا کر کے خلیفہ سوم کو شہید کر دیا۔ مگر صرف آپ کے قتل پر معاملہ ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اب عمل اور ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو امیر معاویہ کی خلافت کے ایک عارضی وقفہ (60-41ھ) کو چھوڑ کر سیکڑوں برس تک جاری رہا۔ لاکھوں قیمتی جانیں انتہائی بے دردی کے ساتھ ہلاک کر دی گئیں۔ اور اصل مسئلہ (خلافت میں بگاڑ کی اصلاح یا خون عثمان کا قصاص) پھر بھی وہیں حل ہونے کے لیے باقی رہ گیا جہاں تمام مسائل کو بالآخر حل ہونا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ حکومت کے لیے جو جنگ شروع کی جائے، اس کا خاتمہ نہ کامیابی پر ہوتا ہے اور نہ ناکامی پر۔ جماعت الف اور جماعت ب کی جنگ ختم ہوگی تو خود اس جماعت میں دو گروہ ہو جائیں گے جو جیت کر اوپر آئی ہے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں حصول خلافت کی جنگ 35ھ میں شروع ہوئی اور تقریباً ایک سو سال تک مختلف شکلوں میں جاری رہی۔ اس

پوری مدت میں بنوامیہ کا اقتدار قائم رہا۔ 133ھ میں بنوہاشم (بنوعباس) ایرانیوں کی مدد سے بنوامیہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر اب بنوہاشم، عباسیوں اور علویوں میں تقسیم ہوکر خود ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے۔ محمد بن عبداللہ بن حسن مثنی بن حسن بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب جو مہدی نفس ذکیہ (م145ھ) کے نام سے مشہور ہوئے، عباسی خلیفہ ابوجعفر عبداللہ منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کے سیاسی حریف تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ابوجعفر منصور (158-101ھ) کے خلاف ''صالح نظام'' کی تحریک چلائی۔ اس مقابلہ میں منصور کامیاب ہوا اور اس نے علویوں کو کچل ڈالا۔ یہ دونوں ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ابوطالب بن عبدالمطلب کی اولاد تھا، دوسرا عباس بن عبدالمطلب کی اولاد۔ جب تک بنوامیہ کو اقتدار سے ہٹانے کا سوال تھا دونوں متحدہ سیاسی محاذ بنائے ہوئے تھے۔ مگر جب حکومت بدلی تو دونوں ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ یہ رقابت اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک ایک نے دوسرے کو پیس نہ ڈالا۔

شہادت عثمان کے بعد اولاً ام المومنین عائشہؓ (58) قاتلین عثمان کو سزا دلانے کا مطالبہ لے کر اٹھیں۔ زبیر بن العوام، طلحہ بن زبیر اور دوسرے بہت سے لوگ ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ عائشہ کے جھنڈے کے نیچے 30 ہزار آدمی تھے اور علی بن ابی طالب کے ساتھ 20 ہزار۔ بصرہ کے قریب مقابلہ ہوا جو جنگ جمل (36ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقابلہ میں 10 ہزار مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ذبح ہوگئے۔ طلحہ اور زبیر بھی جنگ سے واپس ہوئے راستہ میں ختم ہوگئے۔ طلحہ زخم کے سبب سے۔ اور زبیر کو مقام وادی السباع میں ایک شخص نے حالت نماز میں مار ڈالا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ معاویہ بن ابی سفیان، جو اس وقت شام کے والی تھے، انھوں نے اس تحریک کا جھنڈا سنبھال لیا۔ علی بن ابی طالب کی طرف سے مطالبۂ بیعت تھا، معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے مطالبۂ قصاص۔ دوبارہ شام میں صفین کے مقام پر شدید تر مقابلہ (37ھ) ہوا۔ تقریباً 70 ہزار مسلمانوں کی گردنیں خود مسلمانوں کے ہاتھوں کاٹ ڈالی گئیں۔ اس عظیم ہلاکت کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوا تو تحکیم (دومۃ الجندل) کا

طریقہ اختیار کیا گیا۔ تاہم اصل مسئلہ دوبارہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ البتہ عمرو بن العاص نے اس موقع پر جو کردار ادا کیا، اس کی وجہ سے مزید نقصان یہ ہوا کہ جان کے قتل کے ساتھ اعتماد کے قتل کی روایات بھی مسلم معاشرہ میں قائم ہوگئیں۔ یہی بے اعتمادی کی فضا تھی جس نے خارجی فرقہ کو پیدا کیا، جس نے مقام نہروان (37ھ) پر علی بن ابی طالب سے مقابلہ کیا اور تقریباً 10 ہزار مسلمان مارے گئے۔ ان کی بے اعتمادی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے امیر معاویہ، عمرو بن العاص، اور علی بن ابی طالب کو یکساں طور پر گردن زدنی قرار دے دیا۔ (۱)

خون عثمان کے نام پر پانچ سال (35-40ھ) کی خانہ جنگی اور بے حساب نقصانات کے بعد عملاً جو ہوا۔ وہ یہ کہ امیر معاویہ کی سیاست مستحکم ہوگئی۔ بیشتر مسلم ممالک، یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر، سب امیر معاویہ کے زیر حکم آ گئے۔ علی بن ابی طالب کی حکومت عراق اور ایران تک محدود ہوگئی۔ علی بن ابی طالب کی شہادت (40ھ) کے بعد امام حسن کی خلافت سے دست برداری نے ان کی مزید مدد کی اور 20 سال (40-60ھ) تک وہ پوری اسلامی دنیا پر بلا نزاع حکومت کرتے رہے۔

امیر معاویہ کے بعد مسئلہ دوبارہ جاگ اٹھا۔ امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد

---

(۱) صحابہ کے باہمی اختلاف کو آج کل کے لوگوں کے اختلاف پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بہت اونچے لوگوں کا اختلاف تھا جو اختلاف کے وقت بھی اپنی اونچائی کو باقی رکھتے ہیں۔
اسحٰق بن راہویہ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:
سمع علی یوم الجمل ویوم الصفین رجلا یغلو فی القول فقال لا تقولوا الا خیرا۔ انما هم قوم زعموا انا بغینا علیهم ،وزعمنا انهم بغوا علینا فقاتلناهم (ابن تیمیہ، منہاج السنہ، جلد 3 صفحہ 61) علی نے جنگ جمل وصفین کے بارے میں ایک شخص کو سنا کہ وہ سخت باتیں کر رہا ہے، آپ نے فرمایا، کلمہ خیر کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ دراصل انھوں نے یہ سمجھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ اس بنا پر ہم ان سے لڑ رہے ہیں۔
زبیر بن العوام جنگ جمل میں حضرت علی کے خلاف تھے۔ جنگ میں حضرت علی کو فتح ہوئی۔ حضرت زبیر اپنے گھوڑے کا منھ پھیر کر چل دیئے۔ بصرہ کے ایک شخص نے ان کا پیچھا کیا اور وادی السباع میں ان کو حالت نماز میں مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ حضرت علی کے پاس ان کی تلوار لے کر پہنچا اور دربان سے کہا کہ زبیر کے قاتل کے لیے اجازت حاصل کر۔ وہ سمجھتا تھا کہ علی اپنے حریف کے قتل کو سن کر خوش ہوں گے اور اس کو انعام دیں گے۔ مگر آپ نے فرمایا: ابن صفیہ (زبیر) کے قاتل کو دوزخ کی خوش خبری سنا دو۔''

بنایا تھا اور اس کی خلافت کے لیے بیعت لی تھی۔ لوگوں میں یہ احساس دبا ہوا تھا کہ امیر معاویہ نے انتخاب خلافت کے مسئلہ کو غیر شورائی طریق پر طے کر کے غلطی کی ہے۔ یزید کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد کچھ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یزید اس منصب کا اہل نہیں ہے۔ مسلم معاشرہ میں اس وقت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، حسین بن علی اور عبدالرحمن بن ابی بکر جیسے جلیل القدر لوگ موجود تھے۔ چنانچہ ایک طبقہ نے یزید کی خلافت پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نئی تحریک کے دو خاص قائد تھے۔ ایک عبداللہ بن زبیر، دوسرے حسین بن علی۔

تاہم صحابہ کرام کی اکثریت اس معاملہ میں یا تو خاموش تھی یا لوگوں کو یہ نصیحت کر رہی تھی کہ یزید کی خلافت کو تسلیم کر لو تاکہ مزید قتل وخون نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس مکہ میں تھے کہ امیر معاویہ کی موت کی خبر آئی۔ لوگ ان کا تاثر جاننے کے لیے ان کے پاس جمع ہو گئے۔ اس موقع پر آپ نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

وان ابنه یزید لمن صالحی اهله فالزموامجالسکم واعطوا اطاعتکم وبیعتکم (بلاذری، انساب الاشراف، یروشلم 1940، قسم 2، صفحہ 4)

معاویہ کا لڑکا یزید ان کے لائق اہل خانہ میں سے ہے۔ لہٰذا تم لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی اطاعت و بیعت اس کو دے دو۔

اسی طرح محمد بن حنفیہ نے یزید کے حق میں کلمہ خیر کہہ کر لوگوں کو اس کی بغاوت سے روکا۔ حمید بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے وقت میں حضرت بشیرؓ کے پاس گیا جو صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے فرمایا:

یقولون انما یزیدلیس بخیر امة محمدصلی الله علیه وسلم وانا اقول ذلك ۔ولکن لان یجمع الله امة محمداحبّ الیّ من ان یفترق (الذہبی، تاریخ الاسلام، جلد 2، صفحہ 68) لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمدؐ میں سب سے بہتر نہیں ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں، لیکن امت محمدؐ کا اتحاد مجھے اس کے اختلاف کی نسبت زیادہ پسند ہے۔

یہ نقطۂ نظر دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واضح ہدایت پر مبنی تھا کہ حکمرانوں سے سیاسی منازعت مت کرو، اور اپنے اصلاحی جذبہ کے اظہار کے لیے عمل کا دوسرا (غیر سیاسی) میدان تلاش

کرو، مگر تعمیری نقطۂ نظر، سیاسی نقطۂ نظر کے مقابلہ میں، ہمیشہ کم لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیشتر لوگ سیاسی معرکہ آرائی کی راہ پر چل پڑے اور نتیجہ میں امام حسین اور عبداللہ بن زبیر جیسے اعلیٰ صلاحیتوں کے انسان اور ان کے ساتھ بے شمار دوسرے مسلمان خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہو گئے۔ یزید کو جب معلوم ہوا کہ مکہ اور مدینہ کے لوگ باغی ہو گئے ہیں تو اس نے حرمین پر بھی حملے کرائے۔ خانہ کعبہ کی دیواریں ڈھائی گئیں ــــــ ان تمام قربانیوں کے باوجود اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ یزید کی حکومت کو موت کے فرشتہ کے سوا کوئی ختم نہ کر سکا۔

پہلی صدی ہجری کی ان خانہ جنگیوں کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بڑے بڑے صحابہ جو رستم واسفندیار کو زیر کرتے ہوئے سیلاب کی طرح اسلام کو آگے بڑھا رہے تھے، وہ اجتماعی زندگی سے الگ ہو گئے۔ سعد بن ابی وقاص فاتح ایران شہروں سے دور چلے گئے جہاں وہ اونٹ اور بکریاں چراتے رہتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ جو اپنی خصوصیات کی بنا پر عمر ثانی بن سکتے تھے، باہمی جھگڑوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ گیر ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تاہم میدان جنگ سے ان حضرات کی واپسی محض منفی نوعیت کی نہ تھی۔ اس کا ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ اب وہ تعلیم وارشاد کی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ احادیث کی روایت کرنا، شریعت اسلام کی حقیقت سمجھانا اور سیرت نبوی سے لوگوں کو آگاہ کرنا اب ان کا مشغلہ تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حدیث اور سیرت اور اسلامی تاریخ کا ذخیرہ جمع ہوا۔ میدان جنگ میں کارنامہ دکھانے والوں نے میدان درس میں اپنے لیے اسلامی خدمت کا کام تلاش کر لیا۔ (۱)

---

(۱) جہاں تک حاکم کی اپنی ذمہ داری کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت سخت تنبیہات منقول ہیں:
مَامِنْ اَحَدٍ مِنْ اُمَّتِی وَلِیَ مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ شَیْئًا لَمْ یَحْفَظْهُمْ بِمَا یَحْفَظُ بِهٖ نَفْسَهٗ وَاَهْلَهٗ اِلَّا لَمْ یَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ (المعجم الصغیر للطبرانی) میری امت میں جو کوئی بھی مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہو پھر وہ اس طرح ان کی حفاظت نہ کرے جس طرح وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے تو وہ بہشت کی مہک بھی نہ پائے گا۔
یہ حکم امیر کے لیے ہے۔ مگر جہاں تک مامور کا تعلق ہے، اس کا فرض یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کرے خواہ امیر اس کو پسند ہو یا ناپسند۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الجهادُ واجب علیکم مع کل امیر برا کان او فاجرا وان عمل الکبائر** (ابوداؤد، مشکواۃ باب الامامۃ) امیر اچھا ہو یا برا، اور خواہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو۔ اس کے تحت جہاد کرنا مسلمانوں کے اوپر فرض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومتی ادارہ کی اصلاح کے نام پر محاذ نہ بناؤ۔ اس کے تحت دین کی اشاعت وتبلیغ کے جو مواقع ہیں، ان پر اپنی قوتیں صرف کرو۔

یزید کی ولی عہدی

معاویہ بن ابی سفیان کا اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا زبردست اختلافی مسئلہ رہا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اس تقرر نے اسلامی تاریخ میں صرف المیے کا اضافہ کیا ہے۔تاہم محتاط مبصرین کی رائے ہے کہ معاویہ اپنے تقرر میں نیک نیت تھے۔ وہ دیانت داری کے ساتھ سمجھتے تھے کہ یزید تمام ممالک اسلامی میں خلافت کے لیے سب سے زیادہ اہل ہے۔ابن خلدون کے نزدیک ''معاویہ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی۔'' عبداللہ بن عمر نے جب اس تقرر پر اعتراض کیا تو معاویہ کا جواب یہ تھا۔

انی خفت ان اذر الرعیۃ من بعدی کالغنم المطیرۃ لیس لھا راع
(البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر جلد 8 صفحہ 80)

مجھے خوف ہوا کہ میں عوام کو بکریوں کے منتشر گلہ کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

اس طرح متعدد روایتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ معاویہ اپنے انتخاب میں مخلص تھے۔حتّٰی کہ نقل کیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر انھوں نے دعا کی:

اللّٰھم ان کنت عھدت لیزید لما رأیت من فضلہ فبغلہ ما املت واعنہ ،وان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ وانہ لیس لما صنعت بہ اھلا فاقبضہ قبل ان یبلغ ذلك (الذہبی ،تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام جلد 2 صفحہ 367)

اے اللہ اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچا دے جس کی میں نے اس کے لیے امید کی ہے۔اور اس کی مدد فرما۔اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی تو اس کے خلافت تک پہنچنے سے پہلے اس کی روح کو قبض کر لے۔

تاہم یہ سوال باقی ہے ایک ایسے شخص کو ممالک اسلامی کی خلافت کے لیے نامزد

کرنے پر وہ کیسے مطمئن ہو گئے جس کے بارے میں اصحاب رسولؐ میں سے صرف ایک بزرگ (مغیرہ بن شعبہ) کی حمایت انھیں حاصل تھی۔ بقیہ اصحاب جو اس وقت ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے، یا تو اس تقرر کے خلاف تھے یا افتراق امت سے بچنے کے لیے انھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ نیز یہ کہ خود معاویہ بن ابی سفیان مسلّمہ طور پر ایک انتہائی دور اندیش آدمی تھے۔ عمر فاروقؓ کے الفاظ میں، وہ غصہ کے وقت ہنسنے والے (من یضحك فی الغضب) آدمی تھے۔ ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی صلاحیت ان میں حیرت انگیز حد تک پائی جاتی تھی۔ ایسے ایک مدبر نے ایک ایسی رائے کی صحت پر کیسے یقین کر لیا جس کی صحت واصابت کی تصدیق بعد کی تاریخ نے نہیں کی۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ 41ھ میں جب حسن بن علی نے ایک عظیم سیاسی نزاع کو ختم کیا اور معاویہ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کر لی تو، اگر چہ امام حسن کی فرمائش کے طور پر نہیں۔ تاہم بطور خود، امیر معاویہ نے عبداللہ بن عامر کے سامنے زبانی طور پر یہ اقرار کر لیا تھا کہ ان کے بعد امام حسن خلیفہ ہوں گے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

كان معاوية لما صالح الحسن عهد للحسن بالامر من بعده فلما مات الحسن قوى امريزيد عند معاوية ورأى انه لذلك اهلا (البدایۃ والنہایہ، جلد 8 صفحہ 80) جب معاویہ نے حسن سے صلح کی تھی تو حسن کو اپنے خلافت کا ولی عہد بنانا منظور کر لیا تھا۔ مگر جب حسن کی وفات ہوگئی تو یزید کی طرف معاویہ کا رجحان قوی ہو گیا۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ خلافت کا اہل ہے۔

حسن بن علی نے معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو کر جو بے مثال قربانی دی تھی۔ اس کا یہ صرف ایک ادنیٰ صلہ تھا کہ وہ ان کے لائق بھائی حسین بن علی کے حق میں وعدۂ ولی عہدی کو پورا کر دیتے۔ مگر یہ بات بھی معاویہ کے ذہن میں جگہ نہ پاسکی۔ اور انھوں نے پورے اصرار اور اہتمام کے ساتھ اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے منصب کے لیے نامزد کر دیا اور اس کے لیے لوگوں سے بیعت لی۔

جہاں تک یزید کی نااہلی کا سوال ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ

اس کے عہد میں حسین بن علی کو قتل کیا گیا۔ یہ نہ صرف ایک ظالمانہ فعل تھا، بلکہ سیاسی اعتبار سے مکمل طور پر ایک غیر مدبرانہ اقدام تھا۔ یزید کو ایک عظیم مملکت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے جاننا چاہئے تھا کہ رسول کے نواسے کو قتل کرنا لازمًا اپنا ردعمل پیدا کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حتّٰی کہ اس سے نمٹنے کے لیے اس کو مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنا پڑا جس میں حرمین کے تقریباً دو ہزار مسلمان مارے گئے۔حسین کے خون کے بعد عامۃ المسلمین کے خون کو حلال کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہو گیا۔

دوسری بات جس سے یزید مکمل طور پر بے خبر رہا، وہ یہ کہ ایک شریف انسان سے مصالحت کا امکان آخر وقت تک ہوتا ہے تاریخ بتاتی ہے حسین نے اگر چہ مکہ سے نکلنے کے معاملہ میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ یزید کو اس کے آخری انجام تک پہنچانے سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے۔ تاہم کربلا پہنچ کر جب انھیں معلوم ہوا کہ کوفہ والوں کے جن خطوط پر انھوں نے اس حد تک بھروسہ کر لیا تھا کہ اپنے اہل وعیال سمیت گھر سے نکل پڑے تھے، وہ محض دھوکا تھے ۔تو امام حسین نے طے کر لیا کہ سیاست کو یزید کے حوالے کر کے خاموش زندگی پر قانع ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یزید و حسین کا قضیہ، کم از کم اپنے آخری مرحلہ میں، ٹھیک اسی نقطہ پر پہنچ چکا تھا جہاں معاویہ وحسن کا قضیہ پہنچا تھا۔ مگر معاویہ ایک جہاں دیدہ آدمی تھے۔ انھوں نے سادہ کاغذ پر اپنا دستخط اور مہر ثبت کر کے حسن بن علی کے پاس بھیج دیا کہ صلح کی جو شرائط چاہو اس پر لکھ دو ___ اس کے برعکس حسین بن علی کی اسی قسم کی پیش کش پر یزید کے آدمیوں نے حسین کو قتل کر دیا۔ یزید اگر چہ میدان جنگ میں موجود نہ تھا۔ اس نے امام حسین کا سر دیکھ کر ان کے قتل پر شدید ردّعمل کا اظہار کیا۔ تاہم وہ اس جرم سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ کوئی صاحب اختیار اپنے گرد جو فضا بناتا ہے اسی کے مطابق اس کے ماتحت عمل کرتے ہیں۔

یزید کی ولی عہدی کا واقعہ بتاتا ہے کہ اخلاص اور نیک نیتی کی ساتھ بھی آدمی کتنی بڑی غلطی کر سکتا ہے ۔آدمی عام طور پر اپنی پسند ناپسند سے مغلوب (Obsessed) رہتا ہے۔ اس کے قریبی حالات اس کا جو مزاج بنا دیتے ہیں، بس اسی کے تحت وہ سوچنے لگتا ہے۔ اس

کی فکر ایک قسم کی متاثر فکر (Conditioned Thinking) بن جاتی ہے۔ وہ نیک نیت ہو کر بھی غلط فیصلے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مشورہ کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ مشورہ کے ذریعہ ایک غلطی دوسرے پر واضح ہوتی رہتی ہے۔ اور جہاں تک اجتماعی امور کا تعلق ہے، اس کے لیے تو مشورہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا جمعہ کی نماز کے لیے جماعت ___ معاویہ بلاشبہ نیک نیت تھے۔ تاہم ان کا فیصلہ متاثر ذہن سے نکلا ہوا فیصلہ تھا جس میں ان حقائق کی رعایت شامل نہ تھی جو ان کے اپنے ذہن کے باہر انتہائی عریاں شکل میں پائے جا رہے تھے۔

الامر اسرح من ذلك (فیصلہ کی گھڑی زیادہ قریب ہے)

کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے یزید کو بلا کر کچھ نصیحتیں کیں۔ اس میں انھوں نے کہا: ''بیٹے! میں نے تم کو پالان کسنے اور سفر کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ دشواریوں کو آسان، دشمنوں کو تابع اور عرب کی مغرور گردنوں کو مطیع بنا دیا ہے۔ میں نے تمھارے لیے وہ چیزیں فراہم کر دی ہیں جو اس سے پہلے کسی نے فراہم نہیں کیں۔ (محمد بن علی بن طباطبا، تاریخ الفخری)

آدمی پر جب کسی خیال کا غلبہ ہوتا ہے تو اکثر وہ حقائق اس سے اوجھل ہو جاتے ہیں جو اس کے خلاف جا رہے ہوں۔ ایسا ہی امیر معاویہ کے ساتھ ہوا۔ وہ دو انتہائی سنگین حقیقتوں کو بھول گئے۔ ایک یہ کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کو شوریٰ کے اختیار میں دیا گیا ہے۔ ایک حکمراں کا اپنے بیٹے کو خلیفہ نامزد کرنا اسلام کے مزاج کے خلاف ایک واقعہ ہوگا جو ضرور اپنا ردعمل پیدا کرے گا۔ اس طرح ان کے حریف بنو ہاشم کو اموی اقتدار کے خلاف اپنی تحریک کو زندہ کرنے کے لیے ایک نظریاتی بنیاد ہاتھ آ جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ امیر معاویہ کے دنیا سے جاتے ہی تمام اسلامی ممالک میں یزید کے خلاف شورش شروع ہوگئی خلیفہ کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک دن بھی اس نے چین سے نہیں گزارا۔

دوسری اہم بات جس کو امیر معاویہ بھول گئے، وہ یہ کہ جس موت کے کنارے کھڑے ہو کر وہ اپنے بیٹے کو وصیت کر رہے ہیں، ان کا بیٹا بھی بہت جلد وہیں پہنچنے والا ہے۔ تاریخ

بتاتی ہے کہ یزید کو بمشکل ساڑھے تین سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہ مر گیا۔ یزید کے بعد امیر معاویہ کا پوتا معاویہ بن یزید بن معاویہ (64-39ھ) تخت نشین ہوا۔ مگر وہ صرف تین ماہ میں ختم ہو گیا۔ امیر معاویہ کے بعد چار سال سے بھی کم مدت میں خلافت، معاویہ کے بیٹوں اور پوتوں سے نکل کر مروان بن حکم بن ابی العاص بن امیہ (65-2ھ) کے گھرانے میں چلی گئی۔ معاویہ اگر انسان کے اس غیر یقینی مستقبل کو دیکھ لیتے تو وہ شاید ایسا اقدام نہ کرتے جس نے مورخ کو یہ لکھنے کا موقع دیا کہ: ''معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں قیصر و کسریٰ کی سنت کو رواج دیا۔''

دوسری طرف غیر صالح حکمرانوں کو بے دخل کرنے علم بلند کرنے والوں کے لیے بھی اس واقعہ میں بہت بڑی نصیحت ہے ــــــ آدمی اگر صبر کا طریقہ اختیار کرے اور اپنے اصلاحی عمل کو اپنے ممکن دائرہ میں محدود رکھے تو بہت جلد اس کو معلوم ہو گا کہ مالک کائنات زیادہ بہتر اور کامیاب طور پر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کی تدبیر کر رہا ہے جس کو ہم اپنی بے صبری کی وجہ سے صرف ناکام طور پر وقوع میں لانا چاہتے ہیں۔

یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو 8 جنوری 1978ء کو برہان پور (مدھیہ پردیش) میں حلقہ نیرنگ خیال کے زیر اہتمام ایک اجتماع میں کی گئی۔

باب سوم

قرآن و حدیث سے

کہووہ اللہ ایک ہے۔اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد،اس کا کوئی ہمسر نہیں (قرآن،سورہ اخلاص)

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔وہ زندہ ہے، سب کو تھامے ہوئے ہے۔اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ نیند آتی ۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے،اسی کا ہے ۔کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، سب کا اسے علم ہے۔اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہوسکتا،مگر جو وہ چاہے ۔اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں ۔وہی سب سے اوپر ہے،سب سے بڑا۔(بقرہ 255)

لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے۔اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔کاش یہ ظالم اس بات کو جان لیتے جس کو وہ عذاب دیکھ کر جانیں گے کہ ساری طاقت اللہ ہی کے پاس ہے اور یہ کہ اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔جب کہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے،ان لوگوں سے الگ ہو جائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے۔اس وقت وہ عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو ہم بھی ان سے الگ ہو جاتے جس طرح وہ ہم سے الگ ہو رہے ہیں۔اس طرح اللہ ان کے اعمال کو سامان حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے کبھی نہ نکل پائیں گے۔(بقرہ 67-65)

یقیناً اللہ اِس کو نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے۔اس کے سوا اور گناہوں کو معاف کر دے گا جسے وہ معاف کرنا چاہے۔جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا وہ

گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔(نساء 116)

لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے قبل والوں کو پیدا کیا تا کہ تم بچ جاؤ۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنا دیا۔ اوپر سے پانی برسایا، پھر تمھاری غذا کے لیے ہر طرح کی پیداوار نکالی۔ سو تم کسی کو اللہ کا برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔(بقرہ 22۔21)

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تم کو بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے۔ اور یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(نساء۔85)

ایمان والے وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز کی پابندی کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں۔ ان کے رب کے پاس ان کا بڑا مرتبہ ہے، قصوروں سے درگزر ہے، اور بہترین روزی ہے۔(انفال 4۔3)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے پورب کی طرف کر لیے یا پچھّم کی طرف۔ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، آخرت کے دن کو، فرشتوں کو، آسمانی کتابوں کو اور پیغمبروں کو مانے۔ اللہ کی محبت میں اپنا مال دے رشتہ داروں کو، یتیموں کو، محتاجوں کو، مسافروں کو، سوال کرنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ اور نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں، اور تنگی و مصیبت میں اور مقابلہ کے وقت صبر کریں یہی لوگ ہیں جو سچے اترے اور یہی لوگ متقی ہیں۔(بقرہ 177)

وہ جب اس کلام کو سنتے ہیں جو پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ بول اٹھتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ ہم کیوں نہ اللہ پر ایمان لائیں اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے جب کہ ہم اس بات کی حرص رکھتے ہیں

کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں میں شامل کرے۔ ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ ان کو ایسے باغ دے گا جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے بدلہ نیکی کرنے والوں کا۔ (مائدہ 85 ـ 83)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں رکھتے اور نہ ستاتے، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ایک معقول بات اور درگزر ایسے صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔ اللہ بے نیاز اور تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر یا تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔ جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور جو نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر (بقرہ 64 ـ 262)

اے ایمان والو سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو اور اس آگ سے ڈرو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کا حکم مانو تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین ہیں اور جو خدا سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو فراغت اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں، جو غصہ کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے کوئی برا کام ہو جاتا ہے یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے، اور وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگنے لگتے ہیں۔ اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو بجز اللہ کے۔ اور یہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جان رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ کیسا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔ (آل عمران 36 ـ 130)

تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ

جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ادب کے ساتھ بات کرو۔ ان کے سامنے شفقت اور انکساری کے ساتھ جھکے رہو۔ اور اس طرح دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! ان پر رحم فرما، جیسے انھوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے جی میں ہے۔ اگر تم نیک بن کر رہو تو وہ رجوع کرنے والوں کی غلطی کو معاف کر دیتا ہے۔ رشتہ داروں کو ان کا حق دو، اور محتاج کو، اور مسافر کو۔ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اپنے رب کی طرف سے جس رزق کے آنے کی تم کو امید ہو۔ اگر اس کے انتظار میں تم کو ان سے پہلوتہی کرنا پڑے تو ان کو نرم جواب دے دو۔ نہ تو ایسا ہو کہ تم اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم بالآخر ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مار ڈالو۔ ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ یقیناً ان کو مار ڈالنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بدکاری کے پاس نہ جاؤ۔ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اور جو ظلم سے قتل کیا گیا ہو تو اس کے وارث کو ہم نے قصاص کے مطالبہ کا حق دیا ہے، پس چاہئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں۔ عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں پوچھ ہونے والی ہے۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو صحیح ترازو سے تول کر دو۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔ ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمھیں علم نہ ہو، کیونکہ کان اور آنکھ اور دل، ان سب کی بابت ہر ایک سے پوچھ ہوگی۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ سارے برے کام، تیرے رب کو سخت ناپسند ہیں۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تم پر وحی کے ذریعے سے بھیجی ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنانا ورنہ تم جہنم میں پھینک دیئے جاؤ گے۔ ملامت زدہ اور راندہ ہو کر۔ (بنی اسرائیل 39-23)

لقمان نے اپنے بیٹے کونصیحت کرتے ہوئے کہا بیٹے! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بلا شبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔اور ہم نے انسان کواس کے ماں باپ کے متعلق تا کید کی ہے۔اس کی ماں نے تھک تھک کراس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے، اس لیے ہم نے نصیحت کی کہ میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر کر۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اگر والدین تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک مانے جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا کہنا نہ مان ۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔اس وقت میں بتادوں گا جو کچھ تم کررہے تھے۔اور لقمان نے کہا۔اے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو اور کسی پتھر کے اندر یا آسمان یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اس کو نکال لائے گا، بیشک اللہ بڑا باریک بیں اور باخبر ہے۔اے بیٹے !نماز کی پابندی کر، بھلی بات لوگوں کو سکھا، اور برے کاموں سے منع کر۔ اور جو کچھ تجھ پر پڑے اس پر صبر کر، بلا شبہ یہ ہمت کے کام ہیں۔ لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر، زمین میں اکڑ کر نہ چل، بیشک اللہ خود پسند اور فخر کرنے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اپنی آواز کو نرم رکھ، سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔(لقمان 19۔13)

یقیناً کامیاب ہوگئے ایمان والے جو اپنی نماز میں زاری کرنے والے ہیں۔ جو بے فائدہ باتوں سے دور رہتے ہیں۔ جو زکوۃ ادا کرتے ہیں۔ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوا اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر انھیں کوئی الزام نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں، جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں، جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے ۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔ (مومنون 11۔10)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب بے سمجھ لوگ ان سے بے سمجھی کی بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام ۔ جو راتوں کو اپنے

رب کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! دوزخ کو ہم سے ہٹا دے، اس کا عذاب تو لازم ہو جانے والا ہے۔ وہ برا ٹھکانا ہے اور بری جگہ ہے رہنے کی۔ وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی، ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر رہتا ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو نہیں مار ڈالتے مگر حق پر۔ وہ بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا، اور وہ ہمیشہ اس میں رسوا ہو کر رہے گا الّا یہ کہ کوئی توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے، وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے ہیں کہ جب خدا کی باتوں سے ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر اس پر نہیں گرتے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک دے اور کر دے ہم کو پرہیزگاروں کے آگے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل بالا خانوں کی شکل میں پائیں گے۔ وہاں سلام و دعا کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ وہ کیسا اچھا ٹھکانہ ہے اور کیسی خوب جگہ رہنے کی۔ (فرقان 76-63)

جو کچھ تم کو دیا گیا ہے، وہ محض دنیا کی زندگی کو برتنے کے لیے ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے، وہ زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں۔ اور جب غصہ آ جائے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز کی پابندی کی۔ اور جو اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر

جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو ظلم ہونے کے بعد برابر کا بدلہ لے، اس کو کوئی الزام نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ (شوریٰ 43-36)

جس کو ڈر ہو گا وہ نصیحت پکڑے گا۔ اور اس سے گریز کرے گا وہ بدبخت جس کو بڑی آگ میں جانا ہے۔ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ کامیاب ہو گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا۔ پھر نماز ادا کی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ (اعلیٰ 17-10)

انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دار بنایا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ محتاج کو کھانا دینے کی آپس میں تاکید نہیں کرتے۔ میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کی محبت میں بری طرح پڑے ہوئے ہو۔ ہرگز نہیں۔ جب زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور تمھارا رب ظاہر ہو گا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔ اور جہنم اس روز سامنے لائی جائے گی۔ اس دن انسان کو سمجھ آ جائے گی۔ مگر اب سمجھ آنے کا موقع کہاں۔ آدمی کہے گا کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں۔ اور جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی ورح! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ اللہ سے راضی، اللہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (فجر 30-15)

تباہی ہے ہر اس شخص کی جو عیب نکالتا ہے اور رغبت کرتا ہے، جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں۔

وہ شخص تو روندنے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا ۔اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے ۔، وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک جا پہنچے گی ۔ وہ ان پر بند کر دی جائے گی ، او نچے او نچے ستونوں میں ۔(ھمزہ)

اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مرد کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔آپس میں ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو ۔ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے، جو لوگ ان چیزوں سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں ۔اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو، تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ۔کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا ۔اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اللہ سے ڈرو ، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے ۔(حجرات 13۔11)

جس نے نیک کام کیا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ، بشرطیکہ وہ ایمان والا ہو، اس کو ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور بدلے میں ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا اجر دیں گے ۔(97)
اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیک عمل کرتے ہیں ۔(نحل 127)

جو شخص میری نصیحت سے منھ پھیرے گا، اس کے لیے ہے تنگ زندگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے ۔ وہ کہے گا اے میرے رب کیوں تو نے مجھ کو اندھا اٹھایا، دنیا میں تو میں آنکھ والا تھا ۔اللہ فرمائے گا، ہاں، اسی طرح پہنچی تھیں تمھارے پاس ہماری نشانیاں ، پھر تم نے ان کو بھلا دیا ۔اسی طرح آج تم کو بھلایا جا رہا ہے ۔اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی نشانیاں نہ ماننے والے کو بدلا دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت باقی رہنے والا ہے ۔(طہ 27۔134)

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے خاص کر دیں گے جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور عاقبت متقیوں ہی کے لیے ہے ۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا، اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے ۔اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والے وہی سزا پائیں

گے جو وہ کرتے تھے۔(قصص 84-83)

جس شخص نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہشات سے روکا، اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔(نازعات 41-38)

جوکوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا ،وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ شخص آخرت میں ناکام و نامراد ہے گا۔(آل عمران 85)

کلامِ نبوت

عَنْ اَبِیْ مَسْعُود الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ ،قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم : اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی اِذَالَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ (رواه البخاری)

ابومسعود انصاری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگلے کلام نبوت سے جو باتیں لوگوں نے پائیں ان میں سے یہ ہے: جب تم کو شرم نہ آئے تو جو جی چاہے کرو۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بنِ صَخْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ ،قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم :"اِنَّ اللهَ لاینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم "(رواه مسلم)

اللہ تمھارے مالوں اور تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ قَالَ: لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ ،اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ (متفق علیه)

بہادر وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے۔ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدٍ الحَسَنِ عَلِی بْنِ اَبِی طَالِبٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ :"دَعْ مَایَرِیْبُكَ اِلیٰ مَالَایَرِیْبُكَ ۔ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِینۃ وَالْكَذِبُ رِیبَۃٌ(رواہ الترمذی)

جس بات میں شک نظر آئے اس کو چھوڑ دو، اور جس میں شک نہ ہو اس کو اختیار کرلو۔ کیوں کہ سچ ، اطمینان ہے۔ اور جھوٹ، شک ہے۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَۃَ وَاَبِی عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا عَنْ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ قَالَ:"اِتَّقِ اللہ حَیْثُمَا کُنْتُ ، وَاَتبِعِ السَّیِئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا ،وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ"(رواہ الترمذی)

تم جہاں بھی ہو، اللہ سے ڈرو۔ برائی کے بعد نیکی کرو، وہ برائی کو مٹا دے گی۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

عَنْ اَبِیْ یَعْلیٰ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ قَالَ:الکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہُ وَعَمِلَ لِمَابَعْدَ الْمَوْتِ ،وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللہِ(رواہ الترمذی)

عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو دبائے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے۔ عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشوں کے پیچھے ڈال دے اور اللہ پر امیدیں باندھے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ :مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْ کُہُ مَالَایَعْنِیْہِ"(رواہُ التِرمذِی وغیرہ)

آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو بے فائدہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ قَالَ:"لَتُؤَدُّنَّ الحقُوقَ اِلیٰ اَھْلِھَا یَوْمَ القِیَامَۃِ حَتّٰی یُقَادَ لِلشَّاۃِ الجَلحَاءِ مِنَ الشاۃِ القَرْنَا"(رَواہُ مُسْلِمٌ)

قیامت کے دن حق والوں کو حق دلائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کو سینگ والی بکری سے حق دلایا جائے گا۔

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ: "مَنْ لَايَرْحَمُ النَّاسَ لَايَرْحَمْهُ اللهُ" (متفق عليه)

جوشخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللہ عنه" (متفق عليه)

مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اورزبان سے لوگ محفوظ رہیں اورمہاجر وہ ہے جواس کام کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: "لَايُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِه" (متفق عليه)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: "كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ" (متفق عليه)

تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص سے اس کے گلہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ: "وَاللهِ لايُؤمِنُ، واللهِ لايُؤمِنُ، واللهِ لايُؤمِنُ!" قِيْلَ مَنْ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: "الّذِي لَايَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ، (متفق عليه)

خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ: اُنْظُرُوْ اِلىٰ مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنكُمْ وَلَاتَنْظُرُوااِلىٰ مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَاَجْدَرُ اَنْ لَاتَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيكُم" (متفق عليه)

اپنے سے کم درجہ والوں کو دیکھو۔ اس کو نہ دیکھو جو درجہ میں تم سے اوپر ہے۔ اس طرح تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ سهلِ بنِ سَعْدِ السَّاعِدِی رَضِیَ اللہُ عنه قالَ جاءَ رجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ فَقالَ :یارَسولَ الله دُلَّنِی عَلیٰ عَمَلٍ اِذَا عَمِلتُہُ اَحَبَّنِی الله وَاَحبَّنِی النَّاسُ ،فقالَ :"ازْهَدْ فِی الدُّنیا یُحِبَّكَ اللہُ ، وَازْهَدْ فِیمَا عِنْدَ النَّاسِ یُحِبَّكَ النَّاسُ"(رواہ ابن ماجہ وغیرہ)

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا، اے خدا کے رسولؐ مجھے ایسا عمل بتائیے ، جب میں اس کو اختیار کرلوں تو اللہ مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ آپؐ نے فرمایا، دنیا سے بے رغبت ہوجاؤ ،اللہ تم سے محبت کرے گا۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے بے رغبت ہوجاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے۔

عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ :"مَاذِئبَانِ جَائِرَانِ ارسِلافِی غَنَمٍ بِاَفْسَدَ مِنْ حِرص، الْمَرْءِ عَلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِیْنِہٖ"(رَواہُ الترمذی)

دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے گلے میں چھوڑ دئے جائیں تو وہ گلے کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا کسی آدمی کے دین کے لیے مال اور عزت کی حرص پہنچاتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عَمْرِو بنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُولَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قَالَ:قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَہُ اللہُ بِمَآ اٰتَاہُ" (رواہ مسلم)

کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اسلام اختیار کیا، اس کو بقدر ضرورت رزق ملا، اور اللہ نے جو کچھ اس کو عطا فرمایا، اس پر اس کو قانع بنادیا۔

لَاتَكُوْنُوا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحسَنَ النَّاسُ اَحسَنَّا وَاِنْ اَسَآؤُا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحسنُوا وَاِنْ اَسَاؤُ افَلَا تَظْلِمُوْا۔ (مشکوٰۃ باب الظلم)

یہ مت کہو کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے، اگر لوگوں نے بدسلوکی کی تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا خوگر بناؤ کہ لوگ اچھا سلوک کریں تو تم بھی اچھا سلوک کرو۔ اگر لوگ برا سلوک کریں تو تم ظالم نہ بنو۔

البرحسن الخلق،والاثم ماحاك فی صدرك و کرهت ان يطلع عليه الناس (مسلم)

نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے۔ گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور تم کو ناپسند ہو کہ لوگ اس سے باخبر ہو جائیں۔

عَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عَرْوَةَ السَّعْدِيِّ الصَّحَابِيِّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَن يَّكُونَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتیّٰ يَدَعَ مالا بَأسَ بِهِ حَذَراً لِّمَا بِهِ بَأس" (رواہُ الترمذی)

بندہ اس وقت تک تقویٰ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کا حال یہ نہ ہو جائے کہ گناہ کے اندیشے سے ایسی چیز کو چھوڑ دے جس میں بظاہر گناہ نہیں ہے۔

عَنْ اَبِی سَعِيْدِ الْخُدرِيِّ رَضِیَ اللہُ عنہُ قالَ قالَ رَجُل: اَيُّ النّاس اَفْضَلُ يَارَسُولَ اللہِ؟ قالَ: "مُؤمِن يُجاهِدُ بنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيلِ اللہِ" قالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ "يَتَّقِي اللہَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ" (مُتَّفق عَلَيه)

ایک شخص نے پوچھا، اے خدا کے رسول لوگوں میں بہتر کون ہے، آپؐ نے فرمایا، جو اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال کے ساتھ جدوجہد کرے، پوچھا پھر کون، فرمایا جو اللہ سے ڈرے اور لوگوں کو اپنے شر سے بچائے۔

عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قَالَ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فی قَلْبِهِ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبر!" قِيْلَ وَما الكِبر۔ قال الكبر بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ" (رواہُ مسلم)

جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی گھمنڈ ہو۔ پوچھا گیا، گھمنڈ کیا ہے فرمایا، حق بات نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ :"مَنْ كَانَ يُؤمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْلِيَصْمُتْ"(مُتَّفق عَلَيه)

جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ بات کہے تو بھلی بات کہے ورنہ چپ رہے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ:"اَتَدْرُون مَاالغِيبَةُ ؟"قَالُوا:الله وَرَسُولُهُ اَعْلَمُ ۔قَالَ "ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَايَكرَهُ"قِيلَ : اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِي اَخِي مَااَقُولُ؟قال:"اِن كَانَ فِيْهِ مَاتَقُولُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، وَان لَم يَكُنْ فِيهِ تَقُول فَقَدبَهَتَّهُ"(رواہُ سلم)

آپ نے فرمایا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے ۔لوگوں نے جواب دیا۔ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا تم اپنے بھائی کے حق میں ایسی بات کہو جو اس کو ناپسند ہو، کہا گیا، اگر وہ بات میرے بھائی میں موجود ہو؟ آپ نے فرمایا۔ جو بات تم نے کہی اگر وہ بات تمھارے بھائی میں ہے تو تم نے اس کی غیبت کی ۔اگر تم نے ایسی بات کہی جو اس کے اندر نہیں ہے تو تم نے بہتان باندھا۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ:"كُلّ الْمُسْلِمِ عَلىَ الْمُسْلِمِ حَرَام: دَمُهُ وعرضُهُ ومَالُهُ"(رواہ مُسلم)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں: اس کا خون، اس کی عزت اور اس کا مال۔

عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرِو بنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ:"اَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا :اِذا اؤتُمِنَ خَانَ، وَاِذا حدثَّ كَذَبَ واذا عَاهَدَ غَدَرَ وَاذا خاصَمَ فَجَرَ"(مُتَّفق عَلَيه)

چار باتیں کسی میں ہوں تو وہ پکا منافق ہے۔ امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پھر جائے۔ بحث کرے تو جھگڑنے لگے۔

عَنْ اَبِي مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ،قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم :

"لَيۡسَ الۡمُؤۡمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الۡفَاحِشِ وَلا البَذِيّ" (وَرَوَاهُ التِّرمِذِيُّ)

مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، فحش بولنے والا اور زبان دراز نہیں ہوتا۔

عَنۡ عَبۡدِ اللهِ بۡنِ عَمۡرٍ بنِ الۡعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّم : "مَنۡ اَحَبَّ اَنۡ يُزَحۡزَحَ عَنِ النارِ وَيُدۡخَلَ الۡجَنَّةَ فَلۡتَأۡتِهِ مَنِيَّتُهُ وَ هُوَ يُؤۡمِنُ بِاللهِ وَالۡيَوۡمِ الآخِرِ، وَالۡيَأۡتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِى يُحِبُّ اَنۡ يُؤۡتَى إِلَيۡهِ" (رَوَاهُ مُسۡلِم)

جس کو یہ پسند ہو کہ وہ آگ سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

عَنۡ اَبِي هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنۡهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمۡ قَالَ: "اِيَّاكُم وَالۡحَسَدَ فان الحسَدَ يَأۡكُلُ الحَسَنَاتِ كَمَا تَأۡكُلُ النَّارُ الۡحَطَبَ" (رواہ ابوداؤد)

تم لوگ حسد سے بچو۔ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

عَنۡ عِيَاضِ بۡنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللهُ عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّم : "اِنَّ اللهَ تَعَالىٰ اَوۡحىٰ اِلَيَّ اَنۡ تَوَاضَعُوۡ حَتّىٰ لَا يَبۡغِي اَحَدٌ عَلىٰ اَحَدٍ، وَلَا يَفۡخَرَ اَحَدٌ عَلىٰ اَحَدٍ" (رواہ مسلم)

اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے۔ اور کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

ثلاث مَنۡ كنّ فيه يَسّرَ الله حَتۡفَهٗ وَاَدۡخله جنته رِفقٌ بِالضَّعِيف، وَشَفۡقَةٌ عَلَى الۡوَالِدين واحۡسَانٌ اِلَى المَمۡلوك (ترمذی)

تین باتیں جس میں ہوں اللہ اس کی موت کو آسان بنا دیتا ہے اور اس کو اپنی جنت میں داخل کرتا ہے۔ کمزوروں سے نرمی، ماں باپ سے محبت، خادموں سے اچھا سلوک۔

اياكم والظنّ فان الظنّ اكذب الحديث (مشکوۃ) گمان سے بچو۔ کیونکہ

گمان بہت بڑا جھوٹ ہے۔

کفی بالمرء کَذِبًان یُحدِّث بکل ماسمع (متفق علیہ) آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ سنی ہوئی بات کو دہرانے لگے۔

مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفَرْس فی اَخِیّتِہٖ یحول ثم یرجِع الیٰ اخیتہ (بیہقی) مومن اور ایمان کی مثال گھوڑے کی ہے جو کھونٹے سے بندھا ہو۔ وہ گھومتا ہے پھر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُولَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قَالَ ثلٰثٌ مِنْ اَخْلَاقِ الْاِیْمَانِ مَنْ اِذاغَضِبَ لَمْ یُدْخِلْہُ غَضَبُہٗ فِیْ بَاطِلٍ، وَمَنْ اِذارَضِیَ لَمْ یُخْرِجْہُ رِضَاہُ مِنْ حَقٍّ وَمَنْ اِذا قَدَرَلَمْ یَتَعَاط مَالَیْسَ لَہٗ(المعجم الصغیر للطبرانی۔ ص۳۱)

تین باتیں ایمانی اخلاق میں سے ہیں۔ جب غصہ آئے تو آدمی کا غصّہ اس کو باطل میں نہ داخل کردے۔ جب وہ خوش ہو تو اس کی خوشی اس کو حق سے باہر نہ کردے۔ جب وہ کسی کے اوپر قدرت پائے تو وہ چیز نہ لے جس پر اس کا حق نہیں ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطیٰ لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانِ (رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان ص7)

جس نے محبت کی تو اللہ کے لیے محبت کی۔ نفرت کی تو اللہ کے لیے نفرت کی۔ دیا تو اللہ کے لیے دیا اور روکا تو اللہ کے لیے روکا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اَلْمُسْلِمُ اَخُوْ الْمُسْلِمِ لایخذُلُہٗ وَلَایَکذِبُہٗ وَلَایَظْلِمُہٗ اِنَّ اَحَدَکُمْ مِرْاٰۃُ اخِیْہِ فَاِنْ رای اَذًیً فَلْیُمِطْ عَنْہُ۔ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ اس سے جھوٹ نہیں کہتا، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا۔ تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے۔ اگر وہ

اپنے بھائی میں کوئی عیب دیکھے تو اس کو دور کر دے۔

عَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْد قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللهِ اَنْ يُعتِقَهٗ مِنَ النّار (بیہقی بحوالہ مشکوٰۃ)

جس نے اپنے مسلمان بھائی کی طرف سے اس کی غیر موجودگی میں مدافعت کی تو اللہ پر لازم ہے کہ اس کو جہنم کی آگ سے آزاد کر دے۔

عن عبد الله بن عمر قال اخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بمنكبتى فقال: كن فى الدنيا كانك غريب اوعابر سبيل (بخاری)

عبد اللہ بن عمر کہتے کہ رسول اللہؐ نے میرا شانہ پکڑ کر فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم پردیسی ہو یا راہ چلتے مسافر۔

عن عقبة بن عامر قال: لقيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فابتدأته ،فاخذت بيده، فقلت:يارسول الله !بم نجاة المومن ـ قال:ياعقبة اخرس لسانك وليسعك بيتك ،وابك على خطيئتك...قال عقبة :ثم لقيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فابتدأته ،فاخذت بيده، فقلت: يارسول الله اخبرنى بفواضل الاعمال فقال :ياعقبة صل من قطعك واعط من حرمك ،واعرض عمن ظلمك(رواه احمد والترمذى)

عقبہ بن عامر کہتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ میں نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ اے خدا کے رسول ،مومن کی نجات کس چیز میں ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ اے عقبہ ،اپنی زبان کو گونگا بنالو۔ تمھارا گھر تمھارے لیے کافی ہوجائے ۔اور اپنی خطاؤں پر آنسو بہاؤ۔ عقبہ کہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ میں نے آپؐ کا ہاتھا پکڑ لیا اور پوچھا۔ اے خدا کے رسول ، مجھے بتایئے کہ افضل اعمال کون سے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا۔ اے عقبہ، جو تجھ سے کٹے تم اس سے جڑو، جو تم کو محروم کرے تم اس کو دو۔ اور جو تمھارے اوپر ظلم کرے اس سے اعراض کرو۔

عن ابی ذرٍّ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :اِنّی اَرَی مالا ترَونَ، واَسمعُ مالاتسمعون، اَطّتِ السَّمَاءُ وحُقَّ لهاان تَئِطَّ ،مافیهامَوضِعُ اربعِ اصابعَ اِلَّاوملَكٌ واضِعٌ جبهَته ساجدًالِلّٰه تعالیٰ .وَاللہ لوتعلمون ماآعْلمُ لَضَحِكْتُم قَلِیلًاولَبَكَیْتُم كثیرا، ولاتلذّذْتم بالنساء علی الفُرُش، وَلَخَرجْتم الی الصُّعُداتِ تجارُون للہ تعالی.قال ابو ذر: واللہ لَوَدِدْتُ اِنّی شجرةٌ تُعضَدُ(ترمذی،ابن ماجه،احمد)

ابوذر کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں دیکھتا ہوں جوتم نہیں دیکھتے ، اورسنتا ہوں جوتم نہیں سنتے۔آسمان میں چرچراہٹ کی آواز ہورہی ہےاورحق ہے کہ اس میں آواز ہو۔اس میں چارانگل جگہ بھی ایسی نہیں جہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہوئے اللہ کوسجدہ نہ کررہاہو۔خدا کی قسم اگرتم وہ جانو جومیں جانتا ہوں توتم ہنسوکم اورروؤ زیادہ۔اورتم کوگھروں میں اپنے بستروں پرلطف نہ آئے۔تم اللہ کوپکارتے ہوئے میدان میں نکل جاؤ۔ ابوذر نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد کہا: کاش میں ایک درخت ہوتا جوکاٹ دیا جاتا۔

اسلام کیا ہے

اسلام کوئی نیا مذہب نہیں۔ یہ اسی مذہب کا زیادہ جامع اور صحیح ایڈیشن ہے جو خدا کے دوسرے رسول پچھلے زمانوں میں لے کر آتے رہے۔

انسان اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے تخلیق کا شاہکار ہے۔ مگر صلاحیتوں کے ظہور کے اعتبار سے انسان اس دنیا کی سب سے زیادہ ناکام مخلوق ہے۔ ایک درخت ہزار برس تک ہرا بھرا کھڑا رہتا ہے۔ مگر انسان سو سال سے بھی کم مدت میں مرجاتا ہے۔ خوشیوں اور لذتوں سے ہم سیر نہیں ہو پاتے کہ وہ اچانک ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ انسان جب اپنے علم، تجربہ اور پختگی کی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔

کیا انسانی زندگی ایک المیہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ نہیں۔ علم الموت (Thanatology) اور سائیکیکل ریسرچ سے ثابت ہوا ہے کہ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں۔ مذہب اس دریافت کو مکمل کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی، اصل منزل کی طرف محض ایک سفر ہے۔ انسانی زندگی کی مثال تو وہ برف (Iceberg) کی سی ہے۔ جس کا بہت تھوڑا حصہ اوپر نظر آتا ہے اور زیادہ حصہ سمندر کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا ہماری مدت حیات کا وہ مختصر حصہ ہے جس میں ہم اپنی اگلی طویل تر زندگی کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ ہماری زندگی کو ہمارے خالق نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک، پیدائش سے لے کر موت تک۔ دوسرا موت کے بعد۔ موجودہ دنیا ہماری صلاحیتوں کے ظہور کے لیے نامکمل ہے۔ وہ زوال اور فنا کے قانون سے بندھی ہوئی ہے۔ یہاں ہم اپنی امنگوں اور سرگرمیوں کو آخری حد تک پورا نہیں کر پاتے۔ اسی کے ساتھ دوسری چیز یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسی کارفرما قوت نہیں جو بھلے اور برے کو اپنے اپنے دائرہ میں رکھے۔ جو اس بات کی نگرانی کرے کہ عزت اور سربلندی انھیں کو ملے جو واقعی اس کے حق دار ہیں اور وہ لوگ لازماً اس سے محروم رہیں جنھوں نے اپنے اندر اس کا واقعی استحقاق پیدا نہیں کیا ہے۔ زندگی کا اگلا مرحلہ انھیں کمیوں کی دائمی تلافی ہے۔

دنیا کی موجودہ صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ خالق نے انسان کو یہاں آزادی اور اختیار دے رکھا ہے، اور اپنے آپ کو عارضی طور پر غیب کے پردہ میں چھپالیا ہے۔ جب تمام پیدا ہونے والے انسان پیدا ہوکر اپنے امتحان کی مدت پوری کر چکے ہوں گے تو زمین وآسمان کا قانون بدل دیا جائے گا۔ اور خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوجائے گا۔ اس کے بعد ایک ایسا عالم بنایا جائے جہاں موجودہ دنیا کی تمام کمیوں کو ختم کر کے اس کو ایک مکمل دنیا بنا دیا جائے گا اور انسان براہ راست خدا کے زیر حکم آجائے گا جس طرح آج بھی بقیہ دنیا براہ راست خدا کے زیر حکم ہے۔ بائبل کے الفاظ میں انسانی بادشاہت ختم ہوکر ''آسمانی بادشاہت'' شروع ہوگی۔ اس کے بعد انسان اپنی تمناؤں کی دنیا میں اپنی زندگی شروع کرے گا اور وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ پالے گا جس کا آج وہ صرف خواب دیکھ سکتا ہے۔ مگر اس جنّتی زندگی میں صرف انھیں لوگوں کو حصہ ملے گا جنھوں نے اپنی موجودہ زندگی میں اس کی تیاری کی ہو۔ جنھوں نے غفلت یا سرکشی میں موجودہ مواقع کو کھودیا ہو، ان کے لیے اس اگلی زندگی میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے، وہ آج بھی ہر قسم کے نقص سے خالی ہے۔ انسانی بستیوں سے دور فطرت کی دنیا کتنی حسین ہے۔ صبح کے وقت جب پہاڑوں اور درختوں کے اوپر سورج اپنی سنہری کرنیں پھیلاتا ہے اور چڑیوں کے چہچہے کے ساتھ نئے دن کا آغاز ہوتا ہے تو یہ ایسا بے پناہ منظر ہوتا ہے کہ دیکھنے والا چاہنے لگتا ہے کہ خود بھی اس آفاقی حسن کے اندر جذب ہوجائے۔ زمین کے سبزہ زاروں سے لے کر آسمان کو جگمگاتے ہوئے ستاروں تک کی یہ دنیا براہِ راست خدا کے زیر حکم ہے۔ یہ کثافت (Pollution) اور بدعنوانی (Corruption) سے پاک ہوکر اپنا عمل کر رہی ہے۔ اس کے برعکس انسان دنیا میں عارضی طور پر انسان کو اختیار ملا ہوا ہے۔ اس اختیار اور آزادی نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ جب اس صورت حال کو ختم کر کے انسانی دنیا میں بھی خدائی اقتدار قائم ہوجائے گا تو یہاں بھی اسی طرح ایک حسین دنیا وجود میں آجائے گی جس کا مشاہدہ ہم اپنے سے باہر کی دنیا میں کر رہے ہیں۔

جس طرح انڈے کے بظاہر سادہ خول کے اندر ایک مکمل زندگی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے اور یہ امکان اتنا قوی ہوتا ہے کہ حالات کی مساعدت پاتے ہی خول توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح ہماری موجودہ دنیا کے اندر ایک اور زیادہ مکمل دنیا کا امکان چھپا ہوا ہے۔ جب وقت آئے گا تو یہ امکان اپنے تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ کر ظاہر ہو جائے گا۔

''دنیا کے اندر دوسری دنیا چھپا ہونا'' ایک ایسی حقیقت ہے جو آج کے انسان کے لیے جانی بوجھی چیز بن چکی ہے۔ آج جب ہم ریڈیو یا ٹیلی وژن کھولتے ہیں تو اچانک ہم دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے گردوپیش ایک ایسی دنیا موجود تھی جس سے ہم اپنا سیٹ کھولنے سے پہلے بالکل بے خبر تھے۔ جدید سائنسی انقلاب نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا کے اندر ایک اور زیادہ مکمل دنیا، چھپی ہوئی تھی، مگر انسان صرف سو برس پہلے تک اس امکان سے قطعاً بے خبر تھا۔ انسان اس زمین پر نامعلوم مدت سے آباد ہے اور تقریباً 10 ہزار برس کے واقعات تو کسی نہ کسی درجہ میں تاریخی ریکارڈ میں آچکے ہیں۔ مگر اس طویل ترین تاریخ میں انسان کی واقفیت صرف ان ذرائع حیات تک محدود تھی جو ظاہری طور پر اس کو اپنی آنکھوں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اب چند سو برس پہلے اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بیسویں صدی میں ہماری موجودہ دنیا ایک بالکل مختلف قسم کی دنیا میں تبدیل ہو جائے گی جہاں منصوبہ بند شہر ہوں گے۔ بٹن دبانے سے مکانات روشن ہو جایا کریں گے۔ انسان ہوا میں اڑے گا۔ وہ رڈیائی لہروں کے ذریعہ خلائی راکٹوں کو کنٹرول کرے گا۔ انسان کی آواز ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں پورے کرۂ ارض کا چکر لگا لے گی۔ زمین کے کسی بھی حصہ میں رہنے والا ایک آدمی کسی بھی دوسرے حصہ کے ایک آدمی سے اس طرح بات کرے گا جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ انسان کی ہو بہو تصویریں اتاری جائیں گی۔ وہ چاند اور دوسرے سیاروں کا سفر کرے گا۔ وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کی باتیں لوگوں کو جادو اور طلسم کی باتیں معلوم ہوتیں۔ مگر آج ہماری سابقہ دنیا کے اندر سے یہ دوسری دنیا نکل کر ہماری آنکھوں کے سامنے آچکی ہے۔

یہ ہے انسانی زندگی کی اصل حقیقت۔ اس حقیقت سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خالق نے پہلا انتظام یہ کیا کہ خود انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک برتر زندگی کا تصور رکھ

دیا تاکہ وہ اپنی اندرون طلب کے تحت اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا رہے۔ساری انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک برتر زندگی کا خواب انسان کے اندرون میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی طرح اس کو نکال نہیں سکتا۔

اس برتر زندگی کو انسان کس طرح پا سکتا ہے، اس کو بتانے کے لیے خالق نے یہ انتظام کیا کہ رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ابوالبشر آدم نہ صرف پہلے انسان تھے بلکہ خدا کے رسول بھی تھے۔جن کو خدا نے شعوری طور پر اپنی مرضی کا علم دیا تھا۔اس کے بعد نوح، ابراہیم ،موسیٰ،عیسیٰ اور دوسرے ہزاروں پیغمبر ہر ملک میں اور ہر بستی میں آئے اور ہر زمانہ میں انسان کو زندگی کی حقیقت بتاتے رہے اور اس واقعہ سے آگاہ کرتے رہے کہ یہ کائنات کس خاص منصوبہ کے تحت بنائی گئی ہے اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔مگر ان پیغمبروں کے ذریعہ جو خدائی تعلیم انسان کے پاس بھیجی گئی ،اس کو انسان بار بار ضائع کرتا رہا۔یا تو اصل آسمانی متن ہی گم ہو گیا یا اس میں انسانی کلام اس طرح مل گیا کہ یہ معلوم کرنا ممکن نہ رہا کہ کون سا حصہ خدائی کلام کا ہے اور کون سا وہ جو انسان کے ہاتھوں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب انسانیت دورِ تاریخ میں پہنچ گئی ۔اس وقت خدا نے پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری کتاب بھیجی اور اپنی خصوصی مدد سے دوسرے تمام ادیان کو زیر کرکے اس کتاب کی بنیاد پر ایک طاقت ور سلطنت قائم کردی جو ایک ہزار سال تک پوری شان کے ساتھ چلتی رہی۔اور خدا کی آخری کتاب کی حفاظت کرتی رہی۔اس کے بعد وہ وقت آیا جب انسانی تاریخ ایک قدم اور آگے بڑھی اور پریس کے دور میں داخل ہو گئی۔ پہلے قرآن کا ہر نسخہ الگ الگ ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔اب یہ ممکن ہو گیا کہ ایک صحیح نسخہ لکھ کر اس سے کروڑوں نسخے چھاپ لیے جائیں۔اس طرح قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

عرب کے پیغمبر جو دین خدا کی طرف سے لائے ،اس کی حیثیت کسی نئے دین کی نہیں۔ یہ ٹھیک وہی دین ہے جس کو پچھلے نبیوں نے اپنے اپنے زمانہ میں پیش کیا تھا۔قرآن کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ پچھلی آسمانی تعلیمات کا مستند اڈیشن ہے۔پیغمبر عربی نے خدا کے دین

کوتاریخ کی حیثیت دے دی ہے، جب کہ اس سے پہلے خدا کا دین محض افسانوی روایات کے مجموعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح پچھلے صحیفوں میں ترجمہ یا الحاق کے ذریعہ جو غلطیاں داخل ہوگئی تھیں ان کی اصلاح کی اور اس میں ضروری احکام کا اضافہ کرکے اس کو ایسا جامع صحیفہ بنادیا جو قیامت تک انسان کی ضرورت پوری کرتا رہے۔ اسرائیلی انبیاء کے ذریعہ خدا نے پہلے ہی فرمادیا تھا کہ بعد کے زمانہ میں میں نیا عہد باندھوں گا جو میرا ''ابدی عہد'' ہوگا۔ (یوحنا۔14۔16) موجودہ بائبل میں انجیل کو ''نیا عہد نامہ'' کہا جاتا ہے۔ مگر خدا کا نیا عہد نامہ حقیقۃً قرآن ہے۔ انجیل تو صرف اس نئے عہد نامہ کی بشارت تھی نہ کہ خود نیا عہد نامہ تھی۔

اسلام ایک سادہ مذہب

جارج سیل(1736۔1697) کا انگریزی ترجمہ قرآن پہلی بار 1734 میں چھپا۔اس ترجمہ کے پانچویں ایڈیشن کے دیباچہ میں سرایڈورڈ ڈینی سن راز(E.Denison Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

The central doctrine preached by Mohammad to his contemporaries in Arabia, who worshipped the stars; to the Persians, worshipped Ormuz and Ahriman ; the Indians,who worshipped idols;and theTurks ,who had no particular worship ,was the unity of God,and the simplicity of his creed was probably a more potent factor in the apread of Islam than the sword of the Ghazis ____ It is an amazing circumstance that the Turks though irresistable in the onslaught of their arms where all conquered in their turm by the faith of Islam ,and founded Mohammaden dynasties .The Mongols of the thirteenth century did their best to wipe out all traces of Islam when they sacked Baghdad,but though the Caliphate was relegated to obscurity in Egypt, .the newly founded empires quikly became Mohammaden states.

Introduction of George Sale's translation of the Koran, p.vii

محمدؐ کی تعلیمات کا بنیادی اصول توحید تھا۔اسی کی تبلیغ انھوں نے اپنے عرب معاصرین کے سامنے کی جو ستاروں کو پوجتے تھے۔اسی کی تبلیغ ایرانیوں کے سامنے کی جو یزداں واہرمن کو مانتے تھے۔اسی کی تبلیغ ہندستانیوں کے سامنے کی جو بتوں کو پوجتے تھے۔اسی کی تبلیغ ترکوں کے سامنے کی جو کسی خاص چیز کے پرستار نہ تھے۔عقیدۂ توحید کی سادگی ،اسلام کی توسیع واشاعت میں، غالباً غازیوں کی تلوار سے زیادہ بڑا عامل تھا۔یہ ایک تعجب خیز واقعہ ہے کہ ترک جن کی فوجی یلغار ناقابل مزاحمت بن گئی تھی، ان سب کو اسلام کے عقیدہ نے فتح کرلیا اور انھوں نے مسلم حکومتیں قائم کیں۔ تیرھویں صدی کے منگولوں نے جب بغداد کو تاراج کیا تو انھوں نے اسلام کے آثار کو مٹا ڈالنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے

تھے۔اس وقت خلیفہ اسلام کو اگرچہ مصر کی تاریکی میں دھکیل دیا گیا تھا، منگولوں کی بنائی ہوئی حکومتیں بہت جلد مسلم ریاستوں میں تبدیل ہوگئیں۔

انگریز مستشرق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام کی ترقی کا راز اس کی سادگی ہے۔ہم اس میں صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ خدا کے رسولوں نے یہی سادہ دین ہر دور کے لوگوں کو دیا تھا۔مگر بعد کو ان کی قوموں نے خودساختہ اضافوں کے ذریعہ ان کو پیچیدہ بنادیا ــــــ کہیں مذہب ایک ناقابل فہم فلسفہ بن گیا۔کہیں عبادت نے بوجھل رسوم کی صورت اختیار کرلی۔کہیں روحانیت کے نام پر پُرمشقت عملیات ایجاد کرلی گئیں۔کہیں نجات کے لیے ضروری قرار پایا کہ آدمی دنیا کو ترک کرکے تجرد کی زندگی گزارے۔وغیرہ۔ پیغمبر اسلام کے ذریعہ اللہ نے کتاب مہیمن (مائدہ:48) بھیجی جس نے دین خداوندی کو ہر قسم کی انسانی آمیزشوں سے پاک کرکے اس کی اصل صورت میں ہمارے حوالے کردیا۔(نحل 64)

اسلام کا خلاصہ پیغمبر اسلام نے ایک مختصر حدیث میں بیان کیا ہے جو الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف طریقوں سے نقل ہوئی ہے:

عن عبد الله بن عمر بن الخطاب قال سمِعتُ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم یقولُ بُنی الاسلامُ علی خمسٍ:شهادةِ اَن لااله الاالله، واَنَّ محمداً عبدُه ورسولُه، واقامِ الصلاةِ، وایتاء الزکاة، وحج البیت،وصومِ رمضان۔ (بخاری ومسلم)

عبداللہ بن عمر بتاتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اسلام کی ان پانچ بنیادوں کا مقصد ایک طرف یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو پہچان کر اس سے جڑ جائے۔دوسری طرف یہ کہ وہ اس حقیقت کا عملی اعتراف کرے کہ اس کے

وجود اور اس کے اثاثہ پر اس کے خدا کا حق ہے اور اسی کے ساتھ خدا کے ان بندوں کا بھی جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہے۔

ہر انسان فطرت خداوندی پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب سن شعور کو پہنچتا ہے تو اس کا اندرون کسی ایسی ہستی کو پانے کے لیے زور کرنے لگتا ہے جس کو اگرچہ وہ شعوری طور نہیں جانتا۔ مگر اس کا تقاضا اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ اس کو نظر انداز بھی نہیں کرسکتا۔ انبیاء یہی بتانے کے لیے آئے کہ تم جس کو پانا چاہتے ہو، وہ اللہ رب العالمین ہے جو تمھارا پیدا کرنے والا ہے۔ اور مرنے کے بعد اسی کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

قدرتی طور پر آدمی اپنے قریبی ماحول میں اس سوال کا جواب تلاش کرنا شروع کرتا ہے۔ مگر اس کو مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ کوئی چیز اس کی نفسیات کے خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی ۔ یہاں اسلام اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ خدا کے تصور کو، تمام انسانی ملاوٹوں سے پاک کر کے آدمی کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اس وقت انسانی فطرت کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے تقاضے کا جواب پالیا:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ رباوبالاسلا م دینا وبمحمد رسولا (مسلم)

ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو اس پر راضی ہو گیا کہ اللہ اس کا رب، اسلام اس کا دین، اور محمد اس کے رسول ہوں۔

بندہ اپنے رب کی خدمت میں کیا چیز پیش کرے، اس کے لیے اسلام نے ایسی چیز بتائی جو ہر شخص کے پاس لازمًا موجود ہوتی ہے:

عن عمربنِ الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اِنماالاعمالُ بالنیات وانمالکلّ امرئٍ مانویٰ ۔فمن کانت ھجرتُه الی اللہ ورسوله فھجرته الی اللہ ورسوله ومن کانت ھجرتُه لدنیایصیبھااوامرأةٍ یَنکحُھافھجرته اِلی ماھاجر الیه (بخاری ومسلم)

عمر بن خطاب بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے

سنا،عمل کا مدار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔جس کی ہجرت اللہ اوراس کے رسول کے لیے ہوگی تواس کی ہجرت اللہ اوراس کے رسول کے لیے ہے۔اور جس کی ہجرت دنیا پانے کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہوتواس کی ہجرت اس کے لیے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

اس حدیث کے مطابق خدا کی نظر میں ظاہری ہیئت یا مقدار کی کوئی اہمیت نہیں۔ساری اہمیت یہ ہے کہ آدمی نے کس دل سے کوئی کام کیا ہے۔عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے:

رب عمل صغیر تعظمه النية ،ورب عمل كبير تصغره النية

بہت سے بظاہر چھوٹے عمل کواس کی نیت بڑا کر دیتی ہے۔اسی طرح بہت سے بظاہر بڑے عمل کواس کی نیت چھوٹا کر دیتی ہے۔

اسلام نے اعمال ورسوم کی کوئی طویل فہرست انسان کو نہیں دی۔اسلام نے بتایا کہ بھلائی اور برائی کوئی دور کی چیزیں نہیں ہیں وہ انسانیت کی جانی بوجھی چیزیں (معروف ومنکر) ہیں۔تم خود اپنے دل سے فتویٰ پوچھ کر جان سکتے ہو کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔حدیث میں ہے:

ان الخير طمانينة وان الشر ريبة (ابن حبان)

خیر وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو اور شر وہ جو دل میں کھٹکے۔

حسان بن ابی سنان نے کہا:

ماشیء اهون من الورع ،اذا رابك شيء فدعه

پرہیز گاری بے حد آسان ہے۔جب کسی چیز میں شبہ ہوتو اس کو چھوڑ دو۔

دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے کا نہایت آسان اصول یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرنے لگو:

لايكون المومن مومنا حتى لا يرضى لاخيه الا ما يرضى لنفسه

کوئی مومن مومن نہیں ہوتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی

وہی چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

اسلام کی یہ تعلیمات بتاتی ہیں کہ خدا کا دین پراسرار عملیات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے نہ کوئی ماوراء فہم چیز ہے۔ وہ سیدھا سادا فطرت کا طریقہ ہے۔ آدمی جب اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے آپ کو اپنی فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے نہ کہ کسی غیر متعلق خارجی فہرست اعمال کو اپنے اوپر اوڑھاتا ہے۔

آدمی خواہ کتنا ہی درست زندگی گزارنے کی کوشش کرے، بہرحال اس سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر انسان کو کیا کرنا چاہئے، اس میں انسانی ذہنوں نے زبردست ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اسلام میں اس کی بالکل سادہ صورت یہ بتائی گئی ہے کہ اگر خدا کے معاملہ میں کوئی غلطی ہوجائے تو یاد آتے ہی فوراً توبہ کرلو۔ یعنی غلطی کی روش ترک کرکے اپنے کو صحیح راستہ پر ڈال دو۔ اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو معاف کردے اور تم کو زیادہ بہتر عمل کی توفیق دے۔ قرآن میں کہا گیا ہے: ''اے لوگو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ کیوں کہ خدا سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔'' (زمر۔53) اور اگر غلطی کا تعلق انسان سے ہو تو اللہ سے مغفرت چاہنے کے ساتھ خود متعلقہ انسان سے مل کر اس کی تلافی کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی کا مال چھین لیا ہو تو اس کا مال واپس کرے۔ اگر کسی کو زبان سے برا بھلا کہا ہے تو اس سے معافی مانگے۔ غرض جس قسم کی غلطی ہے اسی کے مطابق اس کی تلافی کی جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کی مزید تعلیم یہ ہے کہ جب کوئی برائی ہوجائے تو اس کے بعد نیکی کرو۔ ایسا کرکے آدمی گویا اپنے گناہوں کو دھوتا ہے نیز اپنے غلط عمل کے اثرات کی تلافی کرتا ہے۔ ایک حدیث ہے:

اتَّقِ اللہ حیثُما کنتَ واتبعِ السّیئۃَ الحسنۃَ تمحُھا۔ وخالق الناس بخلُقٍ حَسَنٍ (ترمذی)

تم جہاں بھی ہو، اللہ سے ڈرو، برائی صادر ہوجائے تو اس کے بعد نیکی کرو، وہ برائی کو مٹا دے گی۔ لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہو۔

اسلام کی اصولی تعلیمات کی طرح، اسلام کا عملی نظام بھی نہایت سیدھا اور مختصر ہے۔

عبادت کے آداب، قانون کی دفعات سب فطرت کے طریقوں کی طرح بالکل سادہ ہیں۔ اسی طرح تیوہاراورتقریبات ،موت اور پیدائش ،نکاح اورمیراث ،غرض وہ سارے معاملات جوورزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں، ان میں رسوم کی بندشیں بالکل ختم کردی گئی ہیں۔ ہرمعاملے کوسیدھے سادے فطری حدود میں انجام دینے کی تعلیم دی گئی ہے (انی ارسلت بحنیفیة سمحة، بروایت عائشہ)

فی امسند عن ابن عباس قال: قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الادیان احبّ الی اللہ قال الحنفیة السمحة

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین کونسا ہے۔آپؐ نے فرمایا: وہ جو سیدھا اور نرم ہو۔

اہم یہ وہ اسلام ہے جوقرآن وحدیث میں ہے اور جواصحاب رسول کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے، جہاں تک رواجی اسلام کا تعلق ہے، بعد کے مسلمانوں نے حیرت انگیز جسارت کے ساتھ اس میں وہ تمام اضافے کرڈالے ہیں جن کوختم کرنے کے لیے اسلام آیا تھا۔ یہ اللہ کا خصوصی انعام ہے کا اس نے ،پچھلی امتوں کے برعکس، امت محمد سے یہ اختیار چھین لیا کہ وہ متن اسلام میں کسی قسم کا تصرف کرسکیں۔ ورنہ آج کسی بندہ خدا کے لیے سچے دین کو جاننا اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا پیغمبراسلام کی بعثت سے پہلے ان لوگوں کے لیے تھا جو یہ کہتے ہوئے مرگئے: ''خدایا اگر میں جانتا کہ تیری عبادت کا طریقہ کیا ہے تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔''

اسلامی عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ چند سیدھے سادے آداب کا اہتمام کرکے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کوذہنوں میں تازہ کرلیا جائے۔ پیدائش کے وقت کی کل اختیاری رسم یہ ہے کہ نومولود کے کان میں اذان کے الفاظ کہہ دیئے جائیں۔موت کے وقت کی سادہ رسم یہ ہے کہ مردہ کومعمولی کپڑے میں لپیٹ کر دعائیہ نماز پڑھی جائے اور قبر کے اندر رکھ کر اس کواوپر سے ڈھک دیا جائے۔نکاح کی کل شرعی رسم یہ ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق ایک مختصرسی رقم بطورمہر مقررکرکے طرفین ایجاب وقبول کرلیں۔تیوہار کے دن کی ساری رسم یہ ہے کہ کسی

مقام کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوں اور اللہ کی بڑائی کا کلمہ بولتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کرلیں۔ بس اس طرح کے چند آداب کے سوا شریعت نے کسی معاملہ میں مسلمانوں کو کسی رسمیاتی ڈھانچہ کا پابند نہیں بنایا۔ اسلام میں ساری اہمیت قلبی اخلاص کی ہے نہ کہ رسمیاتی ڈھانچوں کی۔

جہاں تک عدالتی قوانین کا تعلق ہے وہ بھی، دنیا کے دوسرے قانونی نظاموں کے برعکس، بے حد سادہ ہیں۔ آج کل قوانین کی اتنی کثرت ہے کہ ججوں کو بعض اوقات سارے قوانین کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ہندستان میں پانچ سال (1976-1971) کے اندر 3723 قوانین اور ضابطے مختلف سطحوں پر وضع کئے گئے۔ یعنی ہر دن بارہ نئے قوانین۔ (ٹائمس آف انڈیا، 26 فروری 1978) اس کے برعکس اسلام میں قانونی نظام کو انتہائی سادہ اور مختصر رکھا گیا ہے، اور تجربہ بتاتا ہے کہ قانونی نظام کا سادہ اور مختصر ہونا ہی انصاف کی واحد ضمانت ہے۔ قانون کی دفعات میں اضافہ صرف قانونی موشگافیوں (Legal Technicalities) کو بڑھاتا ہے جو عملاً صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ''غیر ہوشیار'' لوگ تو ناحق قانون کے جال میں پھنستے رہیں اور ''ہوشیار'' لوگ ہر قسم کا جرم کرنے کے باوجود قانونی اعتبار سے ہمیشہ بے داغ بنے رہیں۔

اسلامی تعلیمات کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک عام آدمی کے لیے بھی تسکین کا پورا سامان ہے اور ایک انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کے لیے بھی۔ مثال کے طور پر قرآن میں کہا گیا ہے: وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہُ (خدا کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے) عام آدمی اس کا یہ مطلب لے گا کہ نبی یا ولی یا اور کوئی کسی کے گناہوں کو بخشنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لیے خدا ہی سے لپٹو اور اسی سے معافی مانگو۔ مگر ایک ماہرِ علوم کے لیے بھی اس میں مکمل غذا کا سامان موجود ہے۔

جدید علم نے اس واقعہ کی تصدیق کی ہے کہ انسان کا قول وعمل، حتیٰ کہ اس کا ارادہ بھی انتہائی صحت کے ساتھ کائنات میں نقش ہو رہا ہے۔ اس لیے خالص علمی اعتبار سے گناہ کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی شخص سے جو برائی صادر ہوئی ہے، اس کو ریکارڈ سے

خارج (Expunged) قرار دے دیا جائے۔ مگر یہی علم ہم کو بتاتا ہے کہ موجوداتِ عالم میں سے ایک ذرہ کو محو کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔ سارے انسان مل کر بھی کائنات کے ایک نقش کو مٹا نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عمل جو کسی انسان سے صادر ہو چکا ہے، اس کو اس کائنات میں ''خارج از ریکارڈ'' قرار دینے کے لیے خدائی طاقتیں درکار ہیں۔ جس نے کائنات کو وجود دیا ہے، وہی اس کے کسی جزو کو مٹا بھی سکتا ہے۔ وہی ایک انسان کے کسی عمل سے اس کو پاک کرسکتا ہے ـــــ اس علم کے ساتھ جو شخص پڑھے گا مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہ اس کے قدم اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیں گے۔ وہ بے اختیار روتا ہوا سجدہ میں گر پڑے گا۔

اسلامی تعلیمات: ایک فکری مطالعہ

ایچ۔اے۔کریبس H.A.Krebs نے نوبل انعام پانے والوں کے علمی حالات کا مطالعہ کیا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ایک سائنس داں کو جو چیز نوبل انعام پانے کے قابل بناتی ہے، وہ دراصل کسی بڑے سائنس داں کی صحبت ہے۔ یہ بڑا سائنس داں اپنے شاگرد کو معلومات کا ڈھیر یا ساز وسامان کا انبار نہیں دیتا۔ بلکہ ایک سائنسی روح (Scientific Spirit) اور ذہنی رجحان (Attitude of Mind) اس کی طرف منتقل کرتا ہے۔اس اسپرٹ یا رجحان کی روشنی میں وہ اپنا سائنسی عمل جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ سائنس داں بن کر نوبل انعام پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

یہی بات، بلاشبہ، اسلام کے بارے میں کہی جاسکتی۔طبیعیات میں مہارت حاصل کرنے کی جو شرط ہے، وہی الٰہیات میں گہری معرفت حاصل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔اسلام کے ذریعہ انسان کو جو چیز ملتی ہے، وہ قوانین وضوابط کے مجموعہ سے زیادہ ایک ذہن اور مزاج ہے۔ یہ ذہن اور مزاج جب کسی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کے تمام رویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس کو خدا کی اس ابدی جنت تک پہنچا دیتا ہے جو کسی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اس سلسلے میں یہاں ہم اسلام کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

تصوراتی عبادت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے جب پہلا انسان بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں۔ یہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ انسان کو اس کائنات میں برتر مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔انسان کو یہ برتری، قرآن کے مطابق، اس لیے حاصل ہے کہ اس کو علم اسماء دیا گیا ہے۔یعنی وہ اسماء (ناموں) کے ذریعہ مسمّیات (چیزوں) کو جانتا ہے، جب کہ فرشتے مسمیات کے ذریعہ مسمیات کو جانتے ہیں۔(بقرہ۔31) انسان

کے اندر یہ مخصوص صلاحیت ہے کہ وہ کسی چیز کو سوچ کر جان لیتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ حسی طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ اس کے برعکس فرشتے چیزوں کو اس لیے جانتے ہیں کہ وہ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو تصوراتی علم حاصل ہے اور فرشتوں کو مشاہداتی۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خدا کو انسان سے کیا مطلوب ہے اور فرشتوں سے کیا مطلوب۔ انسان سے تصوراتی عبادت مطلوب ہے اور فرشتوں سے مشاہداتی عبادت۔ فرشتے جس خدا کو دیکھ کر اس کی تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں، انسان کو اسی خدا کی تسبیح و تقدیس دیکھے بغیر کرنا ہے۔

علم کا آغاز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو شعور کی اس سطح پر لائے جہاں وہ دیکھے بغیر حقائق کا ادراک کر سکے۔ بہت سے جانوروں کی ساخت ایسی ہے کہ اپنی سونگھنے کی صلاحیت کے ذریعے واقعات کو جانتے ہیں۔ اگر وہ آنکھ کے ذریعہ جاننے پر اصرار کریں تو وہ چیزوں سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح انسان کی تخلیق کچھ اس ڈھنگ پر ہوئی وہ گہری باتوں کو اپنے ذہن کے ذریعہ ہی جان سکتا ہے۔ اگر وہ دیکھنے اور چھونے کی حد تک اپنے علم کو محدود کر لے تو وہ تمام اہم باتوں کو جاننے سے محروم رہے گا۔

تصوراتی عبادت کا ایک پہلو اور ہے۔

ایک معمولی آدمی کے مقابلہ میں ایک مشہور قائد کا استقبال کیوں زیادہ ہوتا ہے جب کہ دونوں میں ظاہری طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ قائد کی وہ غیر مرئی حیثیت (امیج) ہے جو اس کے اعمال اور اس کی قربانیوں سے اس کی شخصیت کے گرد بنی ہے۔ یہ امیج محسوس شکل میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ محض تصوراتی چیز ہے۔ مگر یہ تصوراتی حقیقت اتنی اہم ہے کہ ہر جگہ اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اسی طرح آدمی کی ایک اور امیج بن رہی ہے۔ یہ اخروی امیج ہے۔ موجودہ دنیا میں ایک شخص کے کارناموں کی امیج اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے بنتی ہے۔ اگلی دنیا میں اسی کے ساتھ اعمال کے حقیقی اور باطنی پہلو کے اعتبار سے اس کی امیج بن رہی ہے۔ مثلاً ایک قائد

ایک عالی شان تقریر کرتا ہے یا ایک انقلابی منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے اس عمل کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ قائد کو اخبارات کے صفحہ اول پر جگہ مل جائے۔ اس کو ہر طرح اعزازات اور استقبالیے ملنے لگیں۔ مگر جہاں تک اخروی پہلو کا معاملہ ہے۔ اس کا تعلق آدمی کی نیت سے ہے۔ کوئی شخص اپنی نیت میں جتنا خالص ہوگا، اسی کے بقدر خدا کے یہاں اس کی حیثیت قائم ہوگی اور اس کی اخروی امیج بنے گی۔ دنیوی امیج کا فائدہ دنیا میں مل جاتا ہے، اخروی امیج کا فائدہ مرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

تصورات کی دنیا (آئیڈل ورلڈ) ہماری محسوس دنیا (مٹیریل ورلڈ) سے زیادہ حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے جو عمل مطلوب ہے، وہ بھی اپنی آخری صورت میں تصوراتی ہے۔ ہم اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک تصوراتی (حسیاتی) مخلوق ہیں، اس لیے ہمارا اعلیٰ ترین عمل بھی تصوراتی ہی ہوسکتا ہے۔

خدائی اور بندگی کی دریافت

مومن دراصل وہ ہے جو اس وقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لیے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک ظاہر حیات میں گم رہتا ہے، دوسرا آخر حیات میں اپنے لیے زندگی کا راز پالیتا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (روم۔ 7)

وہ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کی خبر نہیں رکھتے۔

اس کائنات میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں ہے، وہ آخرت ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے۔ حاملہ کے پیٹ میں پورا حمل جس طرح بظاہر دکھائی نہ دینے کے باوجود اس کے پورے وجود سے بول رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت باہر آجائے گا۔ ایسے ہی آخرت ساری کائنات میں اس طرح ابلی پڑ رہی

ہے کہ ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ ظاہری پردہ پھٹ جائے اور آخرت اپنے تمام لوازم کے ساتھ سامنے آجائے۔

ثَقُلَتۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِيۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً (اعراف۔187)

وہ زمین وآسمان میں بوجھل ہورہی ہے۔ وہ اچانک آجائے گی۔

قرآن میں مومن کی جو تصویر دی گئی ہے، وہ آخرت کے اس بظاہر چھپے ہوئے واقعہ کو وہ اپنی کھلی ہوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ آخرت کا خیال اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ ہر طرف اس کو بس آخرت ہی آخرت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر واقعہ اس کو آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اس کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔

دنیا میں ایک شخص سے جو زندگی مطلوب ہے۔ وہ حقیقۃً یہ نہیں ہے کہ آدمی یہاں کچھ خاص طرح کے عملی رسوم ادا کرلے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے سامنے آجائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں زندگی گزارنے لگے۔ وہ آج ہی اس دنیا میں سانس لینے لگے جہاں اس کو کل پہنچنا ہے، آدمی جب ''تصوراتی عبادات'' کے مقام کو پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی پالیتا ہے اور اپنے خدا کو بھی۔ اسلام اس کے لیے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کی یافت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

خدا اپنی پوری شان کمال کے ساتھ کائنات میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کی بے پایاں وسعتیں اس کی عظمت کا حال بیان کررہی ہیں۔ سورج کی تابانیاں اس کے نور کو ہر طرف بکھیر رہی ہیں۔ زمین کا سرسبز وشاداب کرہ اس کی رحمتوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ ستاروں کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے ہولناک عذاب کی چتاونی دے رہی ہے۔ غرض ذرہ سے لے کر کہکشانی نظاموں تک ہر چیز خدا کی بے پایاں ہستی کا تعارف ہے۔ اسلام کو پانے کا مطلب خدا کو اس کی کائنات میں دیکھ لینا ہے۔ جب آدمی حقیقی طور پر مومن بن جائے تو زمین وآسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا یہ عالم اس کے لیے خدا کے جلال وجمال کا آئینہ بن جاتا ہے۔

مخلوقات کے پردہ میں وہ خالق کو اس طرح پالیتا ہے کہ بقیہ تمام چیزیں اس کے لیے

سایہ کی مانند ہوجاتی ہیں۔خدا سب سے زیادہ حقیقی وجود کی حیثیت سے اس کے قلب ونظر کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف یہی یافت اس کو یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کس قدر حقیر اور کمزور ہے۔وہ دیکھنے لگتا ہے کہ اس کائنات میں جو تقسیم ہے وہ عجز اور اختیار کی ہے نہ کہ خود اختیار کی۔یہاں سارا اختیار ایک طرف ہے اور سارا عجز دوسری طرف۔اختیار واقتدار کی تمام قسمیں خدا کی طرف ہیں۔اور عجز وناداری کی تمام صورتیں انسان کی طرف۔یہ دریافت اس کے اندر عاجزی کا احساس پیدا کرتی ہے۔وہ اس کو اس حقیقت واقعہ سے باخبر کرتی ہے کہ وہ ایک حقیر وجود ہے حدیث کے الفاظ میں وہ پکار اٹھتا ہے۔خدایا تمام انسان بھوکے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کھانا کھلائے،تمام انسان ننگے ہیں الا یہ کہ تو انھیں کپڑا پہنائے۔تمام انسان پیاسے ہیں الا یہ کہ تو انھیں پانی پلائے۔تمام انسان بے سایہ ہیں الا یہ کہ تو انھیں سایہ میں جگہ دے۔

عجز کا یہ مقام دراصل انسانیت کی پہچان کا مقام ہے۔جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس عظیم کائنات میں اب تک وہ بے جگہ تھا۔اب اس نے اپنی جگہ پالی۔وہ وہاں پہنچ گیا جہاں دراصل اس کو ہونا چاہئے۔

آخرت پسندانہ ذہن:

اسلام نے زندگی کا جو تصور دیا ہے،وہ چند لفظوں میں مختصر طور پر یہ ہے۔الدنیا مزرعة الآخرة۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی دنیا ہی کو اپنی کھیتی، بالفاظ دیگر' اپنی کوششوں کا حاصل پانے کی جگہ سمجھتا ہو۔اس کی سرگرمیوں کا رخ موجودہ دنیا کی طرف ہوجائے____ وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔اس کو اپنے مادی مفادات سے دل چسپی ہو۔وہ انھیں چیزوں کے لیے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو جس میں اس کی ''انا'' کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life)

ہوتی ہے۔مومن کی دلچسپیوں کا مرکز وہ دائمی زندگی ہوتی ہے جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں باعزت زندگی بنانے کا۔اس کی توجہ ،اس کی تمنا ئیں اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔مختصر یہ ہے کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔غیر مومن مرنے کے بعد آخرت کے عالم کو جانے گا۔ اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

میڈیکل سائنس کا ایک طالب علم اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں تعلیم وتربیت کے ایک نظام میں داخل ہوکر اپنے آپ کو تیار کرتا ہے تاکہ اپنی عمر کے بقیہ حصہ میں کامیاب ڈاکٹر بن کر زندگی گزار سکے۔اسی طرح موجودہ دنیا میں خدا پرستانہ زندگی اختیار کرکے ہمیں اپنے اندر وہ ''انسان'' تعمیر کرنا ہے جو موت کے بعد آنے والے مرحلہ حیات میں عمدہ زندگی پانے کا اہل ثابت ہو۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ج (نحل 97)

تم میں سے جو کوئی اچھا کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والا ہو، تو ہم اس کو جلائیں گے اچھا جینا۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے غلط روش اختیار کی۔وہ آخرت میں اپنے آپ کو ایک پُرعذاب زندگی میں گھرا ہوا پائیں گے جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے پاس نہ ہوگی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ ۱۲۴)

اور جس نے میری یاددہانی سے منھ پھیرا تو اس کو ملے گی ایک تنگ گزران۔

آخرت کی انھیں دونوں زندگیوں کو جنت اور جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔جنت اور جہنم نہ کوئی طلسماتی چیزیں ہیں اور نہ محض روحانی چیزیں۔وہ زندگی بھی دنیا ہی کی قسم کی ایک زندگی ہوگی۔دونوں اسی آرام اور تکلیف کے زیادہ کامل مقامات ہیں جن کا ایک ابتدائی نمونہ ہم کو

آج کی دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔قرآن میں جنت کے لذیذ پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ہم شکل بتایا گیا ہے۔بقرہ۔25)اسی طرح جہنم کی زندگی کی تشبیہ اس شخص کی زندگی سے دی گئی ہے جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ ہو اور وہ اس کے بڑھاپے کے وقت جل کر تباہ ہو جائے۔(بقرہ۔266)موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص اپنی عمر کے ابتدائی مرحلہ میں اپنے اندر تعمیری اہلیت پیدا کرتا ہے وہ بعد کو زندگی کے میدان میں اس کی قیمت پاتا ہے۔اس کے برعکس جو شخص اپنے ابتدائی اوقات کو کھیل تماشوں میں میں گنوا دیتا ہے۔وہ بعد کو اس حادثہ سے دوچار ہوتا ہے کہ دنیا کے مواقع سے اپنا حصہ وصول کرنے کی استعداد اس کے اندر نہیں ہوتی۔ٹھیک یہی حال زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس:9۔10)

آخرت میں وہ شخص کامیاب رہے گا جس نے اپنے جی کو سنوارا اور وہ شخص نامراد ہوگا جس نے اس کو بگاڑا۔

دنیا میں عمل کے دوران ہر آدمی اپنے آپ کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے تیار کر رہا ہے۔کچھ لوگ وہ ہیں جو حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا طریقہ اپناتے ہیں۔ایسے لوگ اپنے اندر ایک ایسی شخصیت تعمیر کر رہے ہیں جو ایسے ماحول میں خوب ترقی کرے جہاں اخلاقی شعور ہو،حق پرستی ہو،احساس ذمہ داری ہو،ظواہر کے مقابلہ میں جواہر کی قدر ہو،سطحی باتوں کے بجائے اعلیٰ حقائق کی اہمیت ہو،خود غرضی کے بجائے اصول پسندی آدمی کی ترقی کا زینہ بنتا ہو۔عصبیت کے بجائے حقیقت کی بنیادوں پر فیصلے ہوتے ہوں،لفظی جدال کے بجائے علمی استدلال اپنے اندر وزن رکھتا ہو۔ایسے لوگ ممکن ہے دنیا کے اندر ناکام ہو جائیں۔ کیونکہ یہاں انسانی اقتدار اکثر فساد برپا کئے ہوئے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس قسم کی صلاحیت والے لوگ اس دنیا میں بے جگہ ہو جاتے ہیں حتی کہ ان کو ناگزیر معاش حاصل کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے،مگر جیسے ہی یہ زمین و آسمان بدلے جائیں گے۔(ابراہیم۔48)اور براہ راست خدائی اقتدار کے تحت معیاری دنیا کی تشکیل ہوگی،یہی لوگ دنیا کے سردار بن جائیں گے۔جو صلاحیتیں انھوں نے پچھلے پُرمشقت حالات میں پیدا کی تھیں وہی اس نئی دنیا

میں عزت اور آرام کے مواقع پر قبضہ کرنے کی یقینی ضمانت ہوں گی۔

اس کے برعکس جس خدا کے بتائے ہوئے راستہ کو نہیں اپنایا، جس کا حال یہ رہا کہ وہ برتر تقاضوں کے بجائے وقتی محرکات کے پیچھے دوڑتا رہا جس نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ ابن الوقتی، جوڑ توڑ، خوشامد، سطحیت، استحصال، عصبیت اور مفادات کی پرستش کے ذریعہ اپنا کام بنائے، جس نے اس فن میں مہارت حاصل کی وہ اپنی ہر غلطی اور بے ہودگی کو خوب صورت لفظوں میں چھپا سکتا ہے، ایسا شخص دنیا میں ہوسکتا ہے خوب نمایاں ہو جائے۔ کیونکہ یہاں اکثر اوقات ایسا ماحول چھایا رہتا ہے جس میں اس قسم کی صلاحیتوں کو بہت جلد اپنی قیمت مل جاتی ہے۔ مگر جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچے گا تو یکایک وہ محسوس کرے گا کہ یہاں اس کے لیے مواقع حیات بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ یہاں ان صلاحیتوں کی کوئی قیمت نہیں جو اس نے دنیا میں اپنے اندر پیدا کی تھی۔

اپنے خول سے باہر آنا

قرآن مجید میں کہا گیا کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں۔ مگر لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے (اسراء: 44) اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو حقیقت لفظوں میں بیان کی گئی ہے اسی کی آواز ساری کائنات میں غیر ملفوظ شکل میں بلند ہو رہی ہے۔ پھول اسی کی خوشبو اور رنگینی بکھر رہے ہیں۔ ہوا اسی پیغام کو لے کر چل رہی ہے۔ ستارے اسی خبر رسانی کے لیے روشن ہیں۔ آسمان اسی کے اعلان کے لیے کھڑا ہوا ہے۔ درخت اور پہاڑ اور سمندر، تمام چیزیں اسی کے ابدی نغمے ہر آن نشر کر رہے ہیں مگر یہ سب چیزیں خاموش زبان میں ہیں۔ انسان اپنے آپ میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ چپ کی زبان کو سن نہیں پاتا۔ اس لیے خدا کو نطق کی زبان میں اپنا کلام اتارنا پڑا۔

مگر قرآن حقیقۃً غیر ملفوظ نشریات الٰہی کو سننے کے لیے ایک ملفوظ رہنما ہے۔ خدا کو کوئی شخص اسی وقت پاتا ہے جب کہ وہ خاموش وحی کو سننے لگے۔ جب چھپی ہوئی کائنات میں وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ جب غیر محسوس دنیا میں وہ اپنے لیے زندگی کا سامان پالے۔ یہ مقام آدمی کو

اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ مادیات سے اوپر اٹھ جائے۔ جب وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ کر سانس لینے لگے۔

یہ معرفت کی وہ سطح ہے جہاں اپنی سطح پر جینے کا نام کفر اور خدا کی سطح پر جینے کا نام اسلام ہوتا ہے۔ جب آدمی اپنے اوپر اس حد تک قابو پالے کہ اپنے آپ کو لاشعور سے جدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہ لاشعور کے زیر اثر زندگی گزارنے کے بجائے شعور کے تحت زندگی گزارنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے باہر آ کر اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے گزر کر خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، بہت جلد اس کے گرد افکار اور جذبات کا ایک خودساختہ خول بن جاتا ہے اس قریبی فکری خول سے دھیرے دھیرے وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ حقیقت کے روپ میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی احساس کو خارجی حقیقت کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے کسی آدمی کے لیے سچائی تک پہنچنے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ جب تک وہ اس خول کے اندر ہے، وہ صرف اپنے آپ کو جانتا ہے، اس خول سے نکلنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور برتر ہستی ہے جو اس کی اپنی ذات کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہے۔ وہ زوال کے مقابلہ میں کمال سے آشنا ہوتا ہے، وہ عجز کے مقابلہ میں قدرت کو پالیتا ہے۔

اب آدمی کی سوچ اور چاہت کا مرکز اس کی ذات کے بجائے خالق کی ذات بن جاتی ہے۔ وہ اپنی پرستش کے دائرہ سے نکل کر خدا کی پرستش کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بلند ہو کر اپنے رب کو پالیتا ہے۔ آدمی جب تک اپنی ذات کے خول سے نہ نکلے وہ نہ اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنے خدا کو۔

نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان:

خدا کا وہ بندہ جس سے خدا خوش ہوگا اور اس کو اپنی جنت میں داخل کرے گا، اس کو قرآن میں نفس مطمئن (فجر 27) کہا گیا ہے۔ نفس مطمئن سے مراد پیچیدگیوں سے آزاد روح

(Complex-free Soul) ہے۔ آدمی اس دنیا میں جو رویہ ظاہر کرتا ہے وہ کچھ نفسیاتی پیچیدگیوں کے تحت ہوتا ہے۔ کچھ دنیوی کامرانی حاصل ہوجائے تو وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ دنیوی محرومی لاحق ہوتو احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔ کسی سے دل چسپی ہوتو آدمی کو اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ کسی سے ان بن ہوجائے تو اس کی ہر بات آدمی کو الٹی دکھائی دیتی ہے۔ جس سے کوئی امید وابستہ ہو، اس کے آگے آدمی جھکتا ہے جس سے کسی نفع کی امید نہ ہو، اس سے بے نیازی برتتا ہے۔ جس محفل میں آدمی کی ''انا'' کو تسکین ملے، وہاں وہ خوب اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ جہاں انا کو تسکین ملنے والی نہ ہو وہاں جانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ سب زیادہ تر لاشعور کے تحت ہوتا ہے مختلف عوامل کے اثر سے آدمی کا جو ایک ذہن بن جاتا ہے، اس کے تحت وہ تمام کام کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کے ہالہ سے باہر آکر خالص بے آمیز شکل میں رائے قائم نہیں کر پاتا۔ اس کا ہر رویہ متاثر ذہن کے تحت نکلا ہوا رویہ ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً آزاد رویہ۔

ایمان لانا گویا اپنے آپ کو ہر قسم کے اضافی محرکات اور مصنوعی رجحانات سے اوپر اٹھانا ہے۔ جب آدمی حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرتا ہے تو وہ نفسیاتی گرہوں سے آزاد انسان بن جاتا ہے۔ وہ خالص فطری حالت میں اشیاء کو دیکھنے لگتا ہے وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن میں نفس مطمئن کہا گیا ہے۔ یہ مقام کسی کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ دنیوی علائق اور مادی محرکات سے اوپر نہ اٹھ جائے۔ حتی کہ وہ ان داعیات کو بھی دیکھنے لگے جو لاشعور کے تحت عمل کرتے ہیں۔ اور عام حالات میں خود متعلقہ شخص کو بھی ان کی خبر نہیں ہوتی۔ جب تک ایسا نہ ہو، خدا کے ساتھ آدمی کا ملن نہیں ہو سکتا۔ خدا کی شان صمدیت ہے۔ وہ ہر قسم کی پیچیدگیوں سے ماورا ہے۔ وہ واقعات کو ان کی بے آمیز صورت میں دیکھتا ہے۔ اس لیے خدا کی معیت اسی بندے کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے اندر اس اخلاق خداوندی کو پیدا کرے۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے لاشعور کی گرہوں میں پھنسا ہوا ہو، جو اپنی ذات کے مدار سے باہر نہ نکل سکے، وہ خدا کو نہیں پا سکتا، وہ ''خدا کے

ساتھ چلنے والا‘‘ نہیں بن سکتا۔

نفس مطمئن کے مقام پر پہنچنے کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق دینوی معاملات سے ہے۔ نفس مطمئن کے مقام پر ہونا گویا دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں پہنچ جانا ہے۔ ایسا انسان فکری محدودیتوں اور نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ اور جب آدمی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہوجائے تو وہ فطری حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکمل طور پر بے آمیز رائے قائم کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ وہ محبت اور نفرت، خوف اور امید، عزت اور بے عزتی، فائدہ اور نقصان کے احساسات کے تحت نہیں سوچتا۔ وہ ان تمام محرکات سے اوپر اٹھ جاتا ہے جو آدمی کے گرد ہالہ بن کر اس کی عقل کو گھیر لیتے ہیں اور اس کو صحیح رائے تک پہنچنے نہیں دیتے۔ ایسا شخص معاملات میں مکمل طور پر غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ رائے قائم کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں تمام مصنوعی دیواروں کو توڑ کر حقائق کو دیکھ لیتی ہیں۔ وہ واقعات کا مشاہدہ اس سطح سے کرنے لگتا ہے جہاں سے خدا کامل اور ابدی شکل میں ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اس مقام پر پہنچ جائے، اس کی رائے لازماً صحیح ہوگی۔ اور جو شخص صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرلے، اس کی طاقت کا کون مقابلہ کرسکتا ہے۔

رزقِ رب:

ایمان زندگی کی حالت ہے اور کفر موت کی حالت (انعام۔122) ہر ایک آدمی حقیۃً ایک مردہ آدمی ہے، وہ زندہ آدمی اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ ہدایت کی روشنی کو پالے۔ جب خدا کی طرف سے اس کو رزق رب پہنچنے لگے۔ (طہٰ۔131)

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رزق کے دو دستر خوان کھولے ہیں۔ ایک مادی دستر خوان جس میں غلہ اور سبزی اور پھل اور گوشت جیسی چیزیں ہیں۔ یہ حیوانی رزق ہے۔ اس رزق میں حصہ پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی جانور کو ایک اچھی چراگاہ مل جائے یا کسی بھیڑئے کو اپنے ناشتہ کے لیے عمدہ گوشت حاصل ہوجائے۔ اگر کسی نے اپنے لیے ہر قسم کے رزق مادی جمع کر لیے ہوں تو یہ زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے حیوانی سطح کو پالیا ہے۔ مگر اعلیٰ

انسانی سطح کا درجہ اس سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو خدا سے رزق ملنے لگے۔ جب مخلوق کے بجائے خود خالق اس کے لیے رزق کا سرچشمہ بن جائے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا۔

ان ربی یطعمنی ویسقینی میرا رب مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی رزق پر جی رہا ہے۔ رزق کے بغیر زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایمان اور کفر کی تعریف، اپنی حقیقت کے اعتبار سے کی جائے تو وہ یہ ہوگی۔ کفر ــــــــ کی حالت یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا کے مادی رزق پر جی رہا ہو۔ اور اسلام کی حالت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو اتنا اونچا اٹھائے کہ خود خالق کائنات سے اس کو رزق پہنچنے لگے۔ فیضان الٰہی کی ابدی دنیا میں وہ اپنے لیے زندگی کا سامان پالے۔

خارجہ ذمہ داری:

دوسرے بندگان خدا کے سلسلے میں ایک مومن سے جو چیز مطلوب ہے، وہ نُصح (خیر خواہی) ہے۔ دنیوی معاملات میں اس خیر خواہی کا اظہار قسط (انصاف) کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اخروی معاملہ میں شہادت حق کی صورت میں۔ (نساء:135)

قسط یہ ہے ہم اپنے دوسرے بھائی کے لیے وہی چاہیں جو ہم خود اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ ہم جب دوسرے کے بارے میں بولیں یا دوسرے کے ساتھ کوئی معاملہ کریں تو ہماری کاروائی ضد، عصبیت، انانیت یا انتقامی نفسیات کے زیر اثر نہ ہو بلکہ بے لاگ انصاف کے مطابق ہو۔ قرآن میں کہا گیا ہے: کسی کی دشمنی تمھیں ایسا نہ کردے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔ بلکہ انصاف کرو۔ یہی روش تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے۔ (مائدہ۔8) یہ بہترین جانچ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی قسط پر قائم ہے یا نہیں۔ جب کوئی شخص آپ کے اوپر تنقید کرے، جب کسی سے آپ کا اختلاف ہوجائے جب کسی سے آپ کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچے، وہی وقت دراصل اس بات کی جانچ کا ہوتا ہے کہ آپ مقام قسط پر ہیں یا مقام ظلم پر۔ مگر انسان اکثر ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہوجاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔

خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ لوگوں تک حق کا پیغام پہنچائیں۔

رسول کی حیثیت داعی الی اللہ کی ہے۔ امت مسلمہ بھی آپ کی طبیعت میں ذمہ داری کے اسی مقام پر کھڑی کی گئی ہے۔ (یوسف۔108) دنیا میں رسول اور آپ کے متبعین کا رشتہ، دوسرے انسانوں سے داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ آخرت میں یہ رشتہ شاہد اور مشہود کی صورت میں ظاہر ہوگا جب کہ رسول اور آپؐ کے پیرو خدا کی عدالت میں کھڑے ہو کر لوگوں کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے دعوت الی اللہ کا جواب کس طرح دیا تھا۔ اللہ کے ان گواہوں کو آخرت میں سب سے اونچے مقام پر کھڑا کیا جائے گا جہاں سے وہ تمام اقوام کو دیکھیں اور ان کے بارے میں اپنا بیان دیں۔ اسی لیے قران میں ان کو بلندیوں والے (اصحاب اعراف) کہا گیا ہے۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں اور میری امت والے اونچے ٹیلوں پر ہوں گے اور اوپر سے مخلوق کو دیکھ رہے ہوں گے۔ پیغمبر اسلام پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا۔ اس لیے آپؐ اپنی امت پر گواہ بنائے گئے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ قیامت تک تمام انسانوں کے اوپر گواہ بنے۔ (حج۔آخر)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اس ذمہ داری کا اتنا زیادہ احساس رہتا تھا کہ ہر وقت اس کے لیے دکھی رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس غم میں آپؐ اپنے کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ (شعراء:3) شاید تم اس غم میں اپنے کو ہلاک کر ڈالو گے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

مکہ کے آخری دور میں جب کہ حالات انتہائی سخت ہو چکے تھے ایک طرف مخالفین کا غصہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک بار جب کہ ابوبکر صدیقؓ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، مخالفین نے گھیر کر آپ کو مارنا شروع کیا۔ کسی دیکھنے والے نے پوچھا یہ کون ہے۔ مارنے والوں میں سے ایک شخص غصہ میں کہا۔ مجنون بن ابی قحافہ (ابوقحافہ کا پاگل لڑکا)۔ ایک طرف یہ تھا دوسری طرف مسلمانوں کی معاشیات مکمل طور پر برباد کر دی گئی تھیں۔ زندگی کے تمام راستے ان کے

لیے بند ہو چکے تھے۔اس کے باوجود صبر و برداشت کے سوا کسی اور چیز کی اجازت نہ تھی۔اسی زمانہ میں وہ آیت اتری جو سورہ ہود میں شامل ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ (سورہ ہود۔112،113)

تم اور تمھارے ساتھی حکم کے مطابق قائم رہو۔اور حد سے نہ بڑھو خدا دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔اور ظالموں کی طرف مت جھکو ورنہ آگ تم کو پکڑے گی۔

ان حالات میں یہ حکم کتنا سخت تھا،اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا شیبتنی هود وا خوا تها سورہود اور اس کی ساتھ کی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اسلام کے ماننے والوں کو اسلام کے مخالفین کے اوپر غالب کرے گا۔یہ وعدہ جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔شہادت کے معاملہ ہی کا ایک پہلو ہے۔دنیا میں اہل اسلام پر غلبہ دراصل آخرت میں ان کے اصحاب اعراف (بلندیوں والے) ہونے کا ایک دنیوی اظہار ہے۔جب بھی خدا پرستوں کا کوئی گروہ اپنے دعوتی عمل سے شاہد آخرت بننے کا استحقاق حاصل کرتا ہے،وہ خدا کی سنت کے مطابق ''فوقیت'' کا درجہ پالیتا ہے۔دوسری قوموں کے اوپر اس کی یہ فوقیت آخرت میں یقینی طور پر ظاہر ہوگی۔اور جب خدا چاہتا ہے تو دنیا میں بھی اس کے لیے فوقیت کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔(بقرہ۔212)

اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ اسلام کا راستہ دعوت اسلام کی سمت سے ہو کر جاتا ہے۔دعوتی عمل کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ اسلام کو غالب کرنے کی کوشش ایک ایسا منصوبہ ہے جو خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اسلام اور سیاست

سیاست اسلامی تحریک کا اشو نہیں،اسلامی تحریک کا ایک مرحلہ ہے جو کبھی پیش آتا ہے اور کبھی پیش نہیں آتا۔اسلام کا خطاب ''انسان'' سے ہوتا ہے نہ کہ کسی سیاسی ادارہ سے،اس کا نشانہ ''قلب'' کو بدلنا ہوتا ہے نہ کہ نظام کو بدلنا۔اسلام کا ایک علم بردار آخرت کی نجات کا

پیغام لے کر اٹھتا ہے نہ کہ اقتصادی اور سیاسی نجات کا پیغام۔ یہ کہنا کہ "اسلام کا ایک مقصد فرد سے لے کر سماج تک کی اصلاح ہے۔" اسی طرح ایک بے معنی جملہ ہے جیسے کوئی باغبان یہ کہے کہ "میرا مقصد بیج سے لے کر پتی تک کو وجود میں لانا ہے"۔ اس قسم کا کوئی جملہ باغبانی کی "مکمل تشریح" نہیں ہے، بلکہ باغبانی کی صرف ناقص تشریح ہے۔ کیوں کہ باغ دراصل بیج کے تحقق کا دوسرا نام ہے نہ کہ بیج سے لے کر پتی تک کی کسی "مکمل" جدوجہد کا۔ اس قسم کے مکمل منصوبے اینٹ پتھروں کی تعمیر کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ زندہ ہستیوں کی تعمیر کے لیے۔

ایک بندہ مومن کو جو چیز بے چین کرتی ہے، وہ یہ احساس ہے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یہ احساس، عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ذاتی احساس ہے۔ وہ شخصی انقلاب کا پروگرام ہے۔ مگر زندگی کی سرگرمیاں یا تمام انسانی تعلقات اشخاص ہی کے عمل کا دوسرا نام ہیں۔ اس لیے کسی معاشرہ میں جب اشخاص کی قابل لحاظ تعداد آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے لگے تو جگہ جگہ ان کا سابقہ دوسرے انسانوں سے پیش آتا ہے۔ یہ سابقہ کبھی اعتقادی بحثوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم کی مثال میں ہوا۔ کبھی وقت کے حکمراں اور داعی کے درمیان جزوی مصالحت ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت یوسف کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ کبھی مدعو کی ضد داعی اور مدعو کے درمیان سیاسی ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ نبی آخر الزماں کی مثال میں نظر آتا ہے۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ داعی سیاسی انقلاب یا حکومتی تغیر کو اپنی دعوت کا عنوان بنائے۔ سیاست اور حکومت کا انقلاب بطور ایک امکانی نتیجہ کے اسلامی تحریک کا جزو بن سکتا ہے۔ مگر وہ تحریک کا ابتدائی اور بنیادی پروگرام کبھی نہیں ہوتا۔

ایک باغبان کبھی ایسا نہیں کرتا کہ یہ اعلان کر کے فضاؤں اور بادلوں سے لڑنے لگے کہ "میرا مقصد ایک مکمل درخت کو وجود میں لانا ہے"۔ وہ زمین کو درست کرتا ہے اور بیج کی جڑ جمانے پر ساری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا داعی اگر ایسا کرے کہ وہ "مکمل انقلاب" کا نعرہ لگا کر وقت کے حکمرانوں سے لڑنا شروع کر دے کیونکہ "معاملات زندگی کی باگیں حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں"۔ تو یہ ایک نادانی کا فعل ہوگا۔ اسلام کے

نقطۂ نظر سے معاملات کی باگیں دنیا طلبی اور نفس پرستی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں نہ کہ کسی سیاسی ادارہ کے ہاتھ میں۔ اسلام کی کامیابی یہ ہے کہ لوگ دنیا طلبی کو چھوڑ کر آخرت پسند بن جائیں، وہ نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کو اپنا دین بنالیں۔ یہی اسلام کی سیاست بھی ہے اور غیر سیاست بھی۔ اگر یہ بات حاصل ہوجائے تو گویا سب کچھ حاصل ہوگیا۔ اگر یہ حاصل نہ ہوتو ''مکمل انقلاب'' کا پروگرام لے کر سیاست کی چٹان سے سر ٹکرانا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا ''مکمل درخت'' کا منصوبہ لے کر فضاؤں میں اچھل کود کرنا۔

مقصدِ بعثت:

پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد بھی ٹھیک وہی تھا۔ جو دوسرے پیغمبروں کا تھا۔ سب کو ایک ہی دین دیا گیا۔ ان میں سے کسی کا مقصد نہ تو دوسرے سے مختلف تھا اور نہ ایسا ہوا کہ کسی کو ناقص اور کسی کو کامل دین دیا گیا ہو۔ تاہم ان میں بعض اضافی فروق تھے۔ اصل مشن کے ساتھ ہر ایک کو کوئی منفرد وظیفہ بھی عطا گیا اور اس کے لحاظ سے اس کو ضروری اسباب دیئے گئے ______ حضرت ابراہیم، توحید و آخرت کے اعلان کے ساتھ اس پر بھی مامور تھے کہ صحرائے عرب میں پہنچ کر خدا کا پہلا گھر تعمیر کریں۔ حضرت موسیٰ کے ذمہ یہ کام تھا کہ اپنے اصل فریضہ (اعلان حق) کے ساتھ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باہر لے جائیں۔ حضرت مسیح اپنی پیغمبرانہ ذمہ داری کے ساتھ نبی آخرالزماں کے مبشر بنا کر بھیجے گئے، وغیرہ

پیغمبر اسلام کے معاملہ کی نوعیت بھی ٹھیک یہی ہے آپؐ سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب تھی، وہ تو یہ تھی کہ وہ دنیا کے لیے منذر و مبشر بنیں۔ اسی کے ساتھ آپؐ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا منصوبہ یہ بھی تھا کہ خصوصی غیبی مدد کے ذریعہ زمین پر اہل اسلام کی حکومت قائم کردے تاکہ آخری کتاب کی حفاظت کا انتظام ہوسکے۔

اسلام کی جو تاریخ بنی، وہ پیغمبرانہ مشن کا اضافی جزو ہونے کے باوجود کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ وہ بجائے خود مطلوب بھی تھا۔ مگر یہ مطلوبیت باعتبار وسیلہ تھی نہ کہ باعتبار مقصد۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی آخری کتاب کو محفوظ کرنا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ قرآن کے ساتھ اقتدار کو

جمع کیا جائے۔ اگر پچھلی آسمانی کتابوں کی طرح قرآن کے ساتھ اقتدار کو جمع نہ کیا گیا ہوتا تو ہزاروں برس کی پیغمبرانہ تاریخ کا تجربہ بتارہا تھا کہ اس کا انجام بھی بالآخر وہی ہوگا جو پچھلی آسمانی کتابوں کا ہوا، اس مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ نے خصوصی فیصلہ کیا کہ وہ آخری شریعت کے ساتھ لازماً اقتدار کو بھی جمع کرے گا۔ (الدین والسلطان توامان) خواہ یہ اجتماع شرک وکفر کے علم برداروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ (صف۔ 9)

عرب میں جب اسلام کا غلبہ قائم ہوگیا تو 10ھ یہ آیت اتری۔

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ (مائدہ:3) آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کردیا اور تمھارے اوپر اپنی نعمت تمام کردی۔

یہاں اکمال دین اور اتمام نعمت سے مراد اصلاً قانون اسلامی کی دفعات کی تکمیل نہیں ہے۔ بلکہ آخری شریعت کے ساتھ اقتدار کو جمع کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت میں اسی کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ اب عرب کی تسخیر کے بعد کافر اس سے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ تمھارے دین کو مغلوب کرسکیں (الیوم یئس الذین کفروا من دینکم)[1] دوسرے مقامات سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے جہاں غلبہ اسلامی کو اتمام نور (صف۔ 8) سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اتمام کلام الہیٰ کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اب اس کلام کو کوئی نہیں بدل سکے گا (انعام۔ 115) اللہ تعالیٰ نے قرآن کے نزول کے بعد اس کی پشت پر وقت کی عظیم ترین سلطنت قائم کردی۔ یہ سلطنت قرآن کو اپنے زیر حفاظت لیے ہوئے نسل در نسل چلتی رہی تا آنکہ صنعتی انقلاب ہوا

---

[1] (اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ) ئیسوا منه ان یبطلوه اویئسوامن دینکم ان یغلبوا لان الله تعالیٰ وفی بوعده من اظهاره علی الدین کله(فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ) بعد اظهار الدین وزوال الخوف من الکفار وانقلابهم مغلوبین بعد ما کانوا غالبین (اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ) بان کفیتم خوف عدو کم واظهرتکم علیهم کما یقول الملوك :الیوم کمل لنا الملك ای کفینا من کنا نخافه (وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ) بفتح مکة ودخولها آمنین ظاهرین وهدم منا رالجاهلیة ومناسکهم۔ تفسیر نسفی، جلد اول، صفحہ 270

اور پریس کا دور آ گیا اور سرے سے اس کا امکان ختم ہو گیا کہ کوئی شخص یا گروہ قرآن میں تحریف کر سکے یا اس کو مٹا سکے۔

اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اور تاریخ کے فرق کو سمجھنا اور دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم قتال اور سیاست کے معرکے گرم کرتے رہیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم پیغمبرانہ مشن کو زندہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ہم دین کو ذبح کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ خدا کا آخری رسول، دوسرے تمام رسولوں کی طرح، لوگوں کو آخرت کی چیتاؤنی دینے آیا تھا نہ کہ لوگوں سے سیاسی لڑائیاں لڑنے کے لیے۔ مزید یہ کہ اس قسم کا سیاسی جہاد، خود اصل مقصد (اسلام کا غلبہ) تک پہنچانے کے لیے بھی قطعاً بے سود ہے۔ کیونکہ اسلام کا غلبہ خدا کی نصرت سے حاصل ہوتا ہے۔ (وما النصر الا من عند الله) اور خدا کی مقرر کردہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر پہلے ہی ہم اس کی نصرت کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ یہی نہیں، عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ سیاسی جہاد ہمارے لیے دنیا و آخرت میں رسوائی کا سبب بن جائے۔ کیونکہ دین خداوندی کو آخرت کا سوال بنانے کے بجائے سیاست کا سوال بنانا، دین کی الٹی شہادت دینا ہے۔ یہ آنے والی دنیا کے مسئلہ کو موجودہ دنیا کے مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی شہادت آدمی کو سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔

نجات کا راستہ

ایک شخص ہمہ تن اپنے ذاتی کاروبار میں لگا ہوا ہوتو اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف رسمی آداب رہ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ خدا سے تعلق کا بھی ہے۔ دینوی ترقی حاصل کرنا، اپنے بچوں کی خواہشات پوری کرنا، دنیا میں اپنے کو عزت اور سربلندی کے مقام پر دیکھنا، انسان کو اتنا زیادہ مرغوب ہیں کہ اس کا سارا وقت اور توجہ انھیں چیزوں میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد رب العالمین کے لیے اس کے پاس جو چیز بچتی ہے، وہ صرف رسمیات ہیں۔ وہ بطور خود کچھ رسمی اعمال وضع کر لیتا ہے۔ یا خدا کی بتائی ہوئی عبادات کو بے روح کر کے ان کو ایک قسم کے رسمی ضمیمہ کے طور پر اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔ اور پھر وقتی طور پر ان رسوم کی تعمیل کر کے اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ خدا کا حق بھی ادا کر رہا ہے۔

قرآن اس لیے اتارا گیا کہ خدا پرستی کے طریقوں میں لوگوں نے جو فرق ڈال رکھا ہے اس کو واضح کرے اور صحیح طریقہ کی نشان دہی کر دے (نحل۔64) قرآن جس زمانہ میں آیا ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا مذہب کو۔ انہوں نے ایسی شکل دے دی تھی جو ان کی دنیا پرستانہ مصروفیات کے ساتھ جمع ہو سکے، جو ان کی زندگی کے بنے بنائے ڈھانچہ کو کھنڈت کرنے والا نہ ہو۔

لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنے دنیوی کاروبار میں لگائے رہتے اور اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ بس اتنی بات خدا کو راضی کرنے کے لیے کافی ہے۔ (انفال۔35) کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو ''دیگیں'' کھلا کر اپنے خدا کو خوش کر لیں گے۔ (توبہ۔19) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لیے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کر لی جائے۔ (حدید۔27) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جن افکار و

خیالات کا رواج ہو جائے، انھیں کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کر دیا جائے (توبہ۔30) حتیٰ کہ عرب میں ملت ابرہیمی کی باقیات کے طور پر روزہ، نماز، حج اور قربانی وغیرہ بھی کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی تھیں۔ مگر یہ تمام چیزیں بالکل بے روح شکل میں تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں جیسے کسی کے پورے ہاتھ میں ایک چھنگلیا لٹک رہی ہو، جس کا آدمی کی اصل ہستی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے نوازے (بقرہ۔177) اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو ''کبیر'' مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو ''صغیر'' بنالیں۔ یہ اصلاً ایک قلبی کیفیت ہے۔ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اس لیے اس سے جو آخری عمل مطلوب ہوسکتا ہے۔ وہ بھی نفسیاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف، دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کو پیش کرتا ہے۔ اللہ کو تمھاری قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا ہے، بلکہ اس کو تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (حج:37)

تاہم انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو، وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی خارجی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے سے پیار ہو تو اس کے عمل سے بھی اس پیار کا اظہار ہوگا۔ کوئی شخص سانپ سے ڈر رہا ہو تو اس کی حرکات بھی ضرور اس کی کیفیت کی گواہی دیں گی۔ اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو صغیر (چھوٹا) بنانا اگرچہ باعتبار حقیقت ایک قلبی حالت ہے، لیکن جب وہ کسی دل کے اندر واقعی معنوں میں پیدا ہوجائے تو اس کے اعضاوجوارح اور اس کے حرکات واعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوگا۔ نتیجۃً پوری زندگی اس کے دائرہ میں آتی چلی جائے گی۔

حقیقی خداپرستی، جو آدمی کے لیے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب ومجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملہ میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل ودماغ میں اس کی بڑائی کے احساس کو جگہ

دے۔اس کا اندرونی وجود،اس کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشاراور اسی کی طاقت وقوت کے خوف سے کانپتا رہے۔پھراس کا ہاتھ،اس کا پاؤں،اس کی آنکھ،اس کی زبان اور اس کے تمام اعضاو جوارح اسی دائرہ کے اندراپنے وظائف ادا کریں جوخدا نے اپنی شریعت میں ان کے لیے مقرر کیا ہے۔اس کی پوری ہستی اس دعا کی عملی تفسیر بن جائے جورکوع اور سجدہ میں پڑھنے کے لیے ہمیں تلقین کی گئی ہے۔

اللّٰهم خشع لك سمعي وبصري ومخي وعظمي وعصبي۔

خدایا تیرے لیے جھک گیا میرا کان،میری آنکھ،میرا مغز،میری ہڈی اور میرے اعصاب۔

اسی طرح انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جوخدا نے بتایا ہے۔اوراس رویہ سے پوری طرح بچتا رہے جس سے خدا نے منع کیا ہے۔دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے اپنی پوری زندگی لگا دے۔اسی طرح آخرت کی نجات کا حق دار بھی وہی ہوگا جس نے اپنی زندگی کو اس راہ میں پوری طرح کھپا دیا ہو۔

پچھلے مذاہب میں بگاڑ کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر غلطی کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔یہاں ایک غلطی کرنے کے بعد اس کے انجام سے بچنا ممکن نہیں۔کوئی شخص غصہ میں آکر اپنے بیٹے کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو وہ ہمیشہ کے لیے بے ہاتھ ہو جائے گا۔اس کے بعد باپ کا کوئی بھی عمل اس کے بیٹے کو دوبارہ ہاتھ والا نہیں بنا سکتا۔اس پر قیاس کر کے سمجھ لیا گیا کہ اعمال کے اخروی نتائج بھی لازمی ہیں۔ان سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

اس ذہن نے مذاہب میں دو بڑے مدارس فکر پیدا کئے۔ایک وہ جس کو تناسخ ارواح کہا جاتا ہے۔اس فکر کے ماننے والوں نے یہ گمان کرلیا کہ آدمی بار بار جنم لے کر اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتا رہتا ہے۔انسان کی حالت میں اگر وہ غلطی کرے تو دوسرے جنم میں وہ کسی نچلی مخلوق کی شکل میں اٹھتا ہے۔اس طرح بے شمار جنموں میں اپنے اعمال کی پاداش بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں پہنچتا ہے۔

دوسرا ذہن جو اتنی لمبی سزا کو بھگتنے کے لیے تیار نہ تھا۔اس نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا۔ اس عقیدہ کے مطابق انسان کے گناہوں کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔گناہ ایک ایسا عمل ہے

جو ایک مرتبہ سرزد ہوجائے تو اس کے نتائج سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ انسان کو اس لازمی عذاب سے بچانے کے لیے خدا نے یہ کیا کہ اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا۔ خدا کے بیٹے نے انسان کی صورت میں مجسم ہوکر تمام نوع انسانی کے گناہوں کو اپنے سر پر لے لیا اور اس کی تلافی کے لیے خود سولی پر چڑھ گیا۔ اس طرح گویا خدا خود قربان ہوکر نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔

قرآن نے انسان کو اس عظیم الشان گمراہی سے نکالا اور صاف لفظوں میں اعلان کیا ''کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ سارے گناہوں کو معاف کردیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (زمر۔53) اسلام نے بتایا کہ انسان اور اس کے عمل کے درمیان ایک اور ہستی ہے۔ یہ خدا ہے جو ساری قوتوں کا مالک ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ جو چیز چاہے باقی رکھے، جو چیز چاہے مٹادے۔ آدمی گناہ کرنے کے بعد اگر پلٹ آئے۔ وہ اپنی روش کی اصلاح کرکے خدا سے معافی مانگے تو وہ دوبارہ پاک صاف ہوجاتا ہے۔ حتی کہ ایسا ہوجاتا ہے گویا آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا۔ (کیوم ولدته امه)

اسلام کے ذریعہ اللہ نے اپنی جن رحمتوں کا اعلان کیا ہے، وہ یہیں تک محدود نہیں ــــــ ان کا سلسلہ اس سے بہت آگے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی رحمتیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ کبھی خود تمھارے گناہوں کو نیکیوں کے خانہ میں لکھ دیتا ہے۔ اس کی قدرت کا ملہ تمھاری غلطیوں کے اندر سے تمھارے لیے نئی کامرانی کے مواقع کھول دیتی ہے۔ یہ نہ صرف رحمت خداوندی کا انتہائی اعلیٰ تصور ہے۔ بلکہ یہ اصول خود انسانی نفسیات کو سمجھنے کا نیا دروازہ کھولتا ہے۔ اور انسان کو ان بے پایاں امکانات سے باخبر کرتا ہے جو اس کے خدا نے اس کے لیے اس کائنات میں رکھ دیئے ہیں۔

برائی بھی نیکی بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کے لیے جن انعامات کا وعدہ کیا ہے، ان میں سے

ایک خصوصی وعدہ وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (فرقان۔70) اللہ ان کی برائیوں کو بدل دیتا ہے بھلائیوں سے

اس خدائی انعام کا تعلق اصلاً اس انفرادی یافت سے ہے جو ایک بندہ مومن کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔تاہم اس کا ایک اجتماعی پہلو بھی ہے۔ یہاں ہم دونوں پہلوؤں کے بارے میں مختصراً عرض کریں گے۔

انسان کو کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں رہ سکتا۔حتیٰ کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطلوب بھی ہے کہ انسان غلطی کرے۔ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ نسان اگر گناہ نہ کرتا تو اللہ دوسری مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرے اور پھر اللہ سے معافی مانگے۔اس کی حکمت یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ عجز ہے۔ یہ احساس کہ ''میں نے غلطی کی'' آدمی کے اندر عجز کا جذبہ زیادہ ابھارتا ہے بہ نسبت اس احساس کہ ''میری زندگی گناہوں سے پاک'' مومنانہ قلب رکھنے والے ایک آدمی سے جب کوئی لغزش ہوجاتی ہے تو وہ فوراً تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بیتاب ہوجاتا ہے کہ شیطانی ترغیبات اور نفسانی محرکات کے مقابلہ میں وہ کتنا کمزور ثابت ہوا۔ بے چارگی اور شرمندگی کے جذبہ کے تحت وہ دوبارہ خدا کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔وہ اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو پالیتا ہے کہ خدا اگر میری مدد نہ کرے تو میں اپنے کو سنبھال نہیں سکتا۔ میرے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔انسان اگر غلطی نہ کرے تو اندیشہ ہے کہ اس کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پیدا ہوجائے اور نتیجۃً وہی چیز (عجز) اس سے چھن جائے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کا اصل زیور ہے۔

والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لخشیت علیکم ما ھو اشد منہ وھو العجب (رزین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرو تو تمھارے بارے میں مجھے اس سے زیادہ سخت چیز کا اندیشہ ہے، اور وہ عُجب ہے۔

اللہ کے یہاں ''نیکیوں'' کی گنتی اور کارناموں کے انبار کی قیمت نہیں۔ اس کو توٹوٹے ہوئے دل درکار ہیں۔ (انا عند المنکسرۃ قلوبھم) وہ ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جن کا کلمہ یہ ہو کہ میرے رب! میں تو کچھ بھی نہ کرسکا۔ میری زندگی تو غفلتوں میں گزر گئی۔ یہ محض مصنوعی طور پر نہ ہو بلکہ یہی آدمی کا واقعی احساس بن جائے حتیٰ کہ اس کا احساس عجز اتنا بڑھ جائے کہ یہ کلمہ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو، وہ آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اگر آدمی کی لغزش اُس کے اندر اس احساس عبدیت کو ابھارنے کا سبب بن جائے تو وہ خدا کی نظر میں اتنا محبوب ہو جاتی ہے کہ وہ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کی اس لغزش کو اس کے اعمال نامہ میں حسنات کے خانہ میں لکھ دو۔ کیونکہ وہ میرے بندے کو مجھ سے قریب لے آئی ہے۔ اس کے برعکس جو نیکی آدمی کے اندر فخر کا احساس پیدا کرے، اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ سیئات کے خانہ میں نہ لکھ دی جائے۔ کیونکہ وہ بندے کو خدا سے دور کرنے کا سبب بنی۔

غلطیاں ہر ایک سے سرزد ہوتی ہیں۔ مومن سے بھی اور غیر مومن سے بھی۔ مگر جس کو حقیقی معنوں میں عبدیت کا مقام حاصل ہوتا ہے، اس سے جب کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو وہ فوراً چونک اٹھتا ہے۔ اس کا احساس گناہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دگنی شدت کے ساتھ اپنے رب کی طرف دوڑے۔ اس کی غلطی اس کو نئی اعلیٰ تر قسم کی ایمانی کیفیات سے لبریز کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اللہ سے خوف ومحبت کا نیا طوفان اس کے اندر امنڈ آتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع، جو تمام عبادات کی روح ہے۔ اس کے اندر پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ کہ وہ گناہ جو اپنے بعد خشیت اور تضرع کے آنسو لے آئے، وہ نہ صرف گناہ کی سیاہی کو دھو دیتا ہے، بلکہ خود گناہ کو نیکی کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ نتیجۃً اس نے جو چیز پیش کی، وہ وہی تھی جو تمام نیکیوں کا اصل مقصود ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جن کے اندر عبدیت کا احساس بیدار نہ ہوا ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ گناہ کرنے کے بعد بھی شرمندگی اور گنہ گاری کا جذبہ ان کے اندر نہ اُبھرے۔ ایسے لوگ غلطیوں کے اندھیرے میں گم رہتے ہیں۔ ان کی لغزش ان کو عجز اور

انابت کی خوراک نہیں دیتیں بلکہ ان کی قساوت کو بڑھاتی رہتی ہیں وہ ہر گناہ کے بعد اگلے گناہ کے لیے کچھ اور جری ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھوں نے اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور وہ جدھر چاہتا ہے، انھیں کھینچے لیے پھرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝۲۰۱ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۝۲۰۲ (الاعراف 202)

جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، جب شیطان کا کوئی گروہ انھیں چھوتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو گمراہی میں کھینچتے رہتے ہیں، پھر کمی نہیں کرتے۔

مومن کی سیئات کو حسنات سے بدل دینے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو اجتماعیات سے متعلق ہے۔ یہ اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا وہ خاص معاملہ ہے جب وہ ان کے ناموافق (disadvantage) کو موافق حالات (Advantage) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ مدد چونکہ ایک اعتبار سے دنیوی ہے، اس لیے پہلی قسم کی مدد کے برعکس وہ بعض اوقات غیر اہل ایمان کے حصہ میں بھی آجاتی ہے۔ تاہم دونوں گروہوں میں ایک فرق ہے۔ جہاں تک خدا کے مومن بندوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اس قسم کی مدد کی یقینی ضمانت ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب یہ مدد انھیں مخالفین اسلام کے مقابلہ میں درکار ہو۔ جب کہ غیر اہل ایمان کے لیے اس طرح کی کوئی ضمانت نہیں۔

اسلام کی تاریخ اس قسم کی مدد کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

1۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں، مکہ میں مسلمانوں کے حالت اتنے سخت ہو گئے کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہی کہ اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ انھوں نے حبش کا انتخاب کیا جو عرب کی سرحد پر تھا اور اس وقت وہاں ایک عیسائی بادشاہ تھا (نجاشی) حکومت کر رہا تھا جس کی نیک نفسی مشہور تھی۔ 615ء میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں سے سفر کر کے حبش کے ساحل پر اتر گئے۔ دوسری بار 617ء میں ایک سو مسلمان مرد اور عورتوں کا قافلہ حبش پہنچ گیا۔

گھر بار جائداد، اعزاء اقرباء کو چھوڑ کر دوسرے ملک جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خیر کی صورت پیدا کردی۔مسلمانوں کا حبش پہنچنا۔سمندر پار کے ایک ملک میں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپؐ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔قریش کے ایک مخالفانہ وفد کی آمد کی وجہ سے مسلمانوں کے سردار جعفر بن ابی طالب کو موقع ملا کہ وہ شاہی دربار میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کرسکیں۔ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے 20 عیسائی علماء کا وفد تحقیق حال کے لیے مکہ آیا۔اور اسلام قبول کر کے اپنے ملک واپس ہوا (قصص 55-52) اس طرح وہ تحریک جو ہجرت حبش سے پہلے مکہ کی ایک قصباتی تحریک کی حیثیت رکھتی تھی، ہجرت حبش کے بعد اس نے بین اقوامی تحریک کی حیثیت حاصل کرلی۔

2 اسلام جب عرب میں ظاہر ہوا، اس وقت عرب کے شمال اور جنوب کے تمام علاقے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہتیوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کے ماتحت تھے۔یہ سلطنتیں اس کو برادشت نہ کرسکتی تھیں کہ قلب عرب میں کوئی آزاد اقتدار قائم ہو۔اور ترقی کرے۔ان کے اس جذبہ کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا تھا۔اسی کی ایک مثال 8ھ کا وہ واقعہ ہے جب کہ بُصری کے گورنر شرجیل بن عمرو غسانی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو شام کے سرحدی قصبہ موتہ میں قتل کردیا۔یہ حارث بن عمیر ازدی تھے جو آپ کی طرف سے دعوت اسلام کا مکتوب لے کر حاکم بصریٰ کے پاس گئے تھے۔

بین الاقوامی روایت کے مطابق یہ وقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنیٰ تھا۔یہ خبر بھی آنے لگیں کہ شام کی طرف سے رومی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔پیغمبر اسلام نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔آپؐ نے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور زید بن حارثہ کو اس کا سردار مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کیا۔موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔مگر مسلمانوں کے تین ہزار فوجیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی ایک لاکھ سے بھی زیادہ فوج اکھٹا ہوگئی۔حضرت زید سمیت تقریبا دو ہزار مسلمان شہید ہوگئے اور بقیہ فوج اس حال میں واپس ہوئی کہ مدینہ والوں نے ان کا استقبال یافُرّار (اے بھاگنے والو) کہہ کر کیا۔

پیغمبرؐ اسلام کی پوری 22 سالہ نبوی زندگی میں یہ سب سے بڑا نقصان کا واقعہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر اس کے اندر سے ایک عظیم الشان خیر کا پہلو پیدا کر دیا۔ عرب کے مسلمان جن قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ صدیوں سے آپس میں لڑتے چلے آ رہے تھے۔ جنگ ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا کوئی میدان نہ پا کر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں۔ غزوہ موتہ کے حادثہ نے اس کا بہترین حل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کی جارحیت کا جواب دینے کے لیے دوبارہ ایک عظیم تر فوج ترتیب دی اور اس کا سردار اسامہ بن زید کو بنایا جن کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھرا ہوا تھا، کیونکہ انھوں نے آپ کے والد زید بن حارثہ کو غزوہ موتہ میں قتل کر دیا تھا۔

اس طرح پیغمبرؐ اسلام کو موقع ملا کہ اپنے آخری ایام میں عربوں کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کر کے ان کی جنگجو فطرت کے لیے عمل کا ایک میدان فراہم کر دیں۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے، انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا میں اسلام کا اقتدار قائم کر دیا۔

3۔ اسی قسم کی ایک مثال تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر مغلوں اور تاتاریوں کا حملہ بھی ہے۔ ان وحشی قبائل نے مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصہ کو تاراج کر ڈالا۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو مکمل شکست ہوئی۔۔ یہ سب سے بڑی سیاسی آفت تھی جو مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان کے اوپر نازل ہوئی۔ مگر اس کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان پیدا ہو گیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طو پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب و عقائد پر بے لاگ رائے قائم کر سکیں۔ مسلمانوں سے اختلاط نے ان کو ایک صحیح آسمانی مذہب سے واقف کرایا جواب تک مذہب کے نام سے جاہلانہ اوہام پرستی کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے۔ اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تمام تاتاری مسلمان ہو گئے۔

اس فتح کا یہی فائدہ نہیں ہوا کہ وہ تمام مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک

اپنے راستہ میں تباہ کی تھیں۔ اس کے پوتوں نے دوبارہ ان کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب اور ایرانی قومیں جواب تک اسلام کی علم برداری کر رہی تھیں، عیش اور حکمرانی نے انھیں کمزور کر دیا تھا۔ اب ایک تازہ دم گروہ کی ضرورت تھی جو اسلام کی پاسبان بنے۔ مغل اور تاتاری، جو دراصل وحشی قبائل تھے، ان صلاحیتوں سے بھرپور تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے اسلام کا علم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد چھ سو برس تک اسلام کے طاقتور محافظ بنے۔

جنت کی زندگی

جنت کی زندگی خدائی اہتمام کے تحت بننے والی مثالی زندگی کا نام ہے۔ موجود دنیا پُر مشقت سرگرمیوں (بلد:4) کی دنیا ہے، آنے والی دنیا لطیف تر اور لذیذ سرگرمیوں (یٰسں 55) کی ایک ابدی دنیا ہوگی موجودہ دنیا گویا ایک قسم کا ''رکروٹنگ سنٹر'' ہے جہاں آنے والی خدائی دنیا کے لیے موزوں افراد (ملک 2) چنے جا رہے ہیں۔

اگلی دنیا میں عزت و مسرت کے لازوال مناصب دینے کے لیے وہ لوگ مطلوب ہیں جو تخلقوا باخلاق اللہ کا مصداق ہوں۔ اخلاق الٰہی سے کیا مراد ہے، اس کے نمونے موجودہ دنیا میں ہر طرف بکھیر دئے گئے ہیں_____وہ لوگ جو اپنے قلب و دماغ میں پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندروں کی وسعتیں لیے ہوئے ہوں۔ جو ہواوں کی مانند لوگوں سے ٹکرائے بغیر ان کے درمیان سے گزر جانے والے ہوں۔ جو ستاروں اور سیاروں کی طرح خاموش سفر کرنا جانتے ہوں۔ جو سورج کی طرح اپنوں اور غیروں کے اوپر یکساں چمکنے والے ہوں۔ جو پھول کی طرح شہرت اور عزت سے بے نیاز ہو کر کھلنا جانتے ہوں۔ جو دریا کی مانند حسد اور نفرت سے خالی ہو کر زمین کے سینے پر بہہ رہے ہوں۔ جو درخت کی طرح ساری کائنات کو اپنا غذائی دسترخواں بنا چکے ہوں۔ جو زمین پر پڑے ہوئے سایہ کی طرح کبر و غرور سے خالی ہو کر اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینے والے ہوں۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں ان صلاحیتوں کا ثبوت دیں گے۔ وہی آنے والی جنتی دنیا کے مالک ہوں گے۔ (انبیاء۔ 105)

عقیدہ اور تاریخ کا فرق

نبیوں کی دعوت ایک تھی۔ مگر ان کی تاریخیں مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کیا ہو، اس کا تعلق صرف داعی سے ہے۔ جب کہ تاریخ کا تعلق داعی اور مدعو دونوں سے ہو جاتا ہے۔ تمام انبیاء کو خدا کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کو لے کر ہمیشہ اپنی مخاطب قوموں کے سامنے کھڑے ہوتے رہے۔ مگر مدعو اقوام کا ردعمل مختلف رہا، اس لیے ان کے تعلق سے جو تاریخ بنی، وہ یکساں نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابرہیمؑ کو اپنے وطن عراق میں ساتھی نہ ملے تو آنجناب اپنے بھتیجے اور اپنی اہلیہ کو لے کر غیر آباد جگہ چلے گئے کہ وہاں توحید کا ایک عبادت خانہ بنائیں۔ حضرت یوسفؑ کی شخصیت اور تعبیر رویاء سے مصر کا بادشاہ متاثر ہو گیا۔ اس طرح آپ کو موقع ملا کہ اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت انتظام ملکی کا عہدہ سنبھال سکیں۔ حضرت موسیٰؑ کو مصر سے نکلنے کے بعد ایک پوری قوم بنی اسرائیل کی سیادت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ آپ نے صحرائے سینا کی آزاد فضا میں احکام الٰہی کی بنیاد پر ایک معاشرہ قائم کیا۔ حضرت مسیحؑ نے دعوتی مرحلہ میں فلسطین کے رومی اقتدار سے کش مکش پیدا کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا، اس لیے اپنے شاگردوں کو تلقین کی کہ ـــــــ جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔ (مرقس۔ 12۔ 17)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی اسی دین کی طرف تھی جو دوسرے انبیاء لے کر آئے۔ مگر آپؐ کی قوم نے جہاں آپؐ کی شدید مخالفت کی، قوم کے اندر سے ہزاروں کی تعداد میں آپؐ کو اعلیٰ درجہ کے ساتھی بھی مل گئے۔ آپؐ نے قوم کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنے ساتھیوں کو منظم کیا۔ مقابلہ میں اللہ کی مدد سے آپؐ کو فتح حاصل ہوئی اور اسلام کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اسلامی غزوات میں دشمنان خدا کا قتل کیا جانا اسی طرح اسلامی تاریخ کا ایک اضافی جزو تھا جس طرح اس سے پہلے حضرت یحییٰ اور اصحاب الاخدود کا قتل ہو جانا۔ مگر بعد کے دور میں جب اسلام کی تاریخیں لکھی گئیں تو جنگ و مقابلہ کا پہلو اس کے اوپر چھا گیا۔ کیونکہ قدیم

ذوق کے مطابق اسلامی تحریک کے غیر سیاسی پہلو بہت کم قلم بند ہو سکے۔ البتہ قتال اور سیاسی معرکہ آرائیوں کے واقعات کو خوب نمایاں کر کے بیان کیا گیا۔ اس طرح اسلام کی مدون تاریخ عملاً مغازی اور فتوحات کی داستان بن کر رہ گئی۔

اگر ایسا ہوتا کہ عرب کے سردار، حضرت یوسفؑ کے ہم عصر مصری حکمراں کی طرح، آغاز ہی میں اسلام سے متاثر ہو جاتے یا ملکہ سبا کی طرح رومی حکمراں اسلام قبول کر لیتا تو اسلام کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ سے عقیدہ اخذ کرنا کیوں صحیح نہیں ہے۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت یوسفؑ کو ماننے والے کہیں گے کہ پیغمبرانہ طریق کار یہ ہے کہ وقت کے حکمراں سے صاف لفظوں میں مطالبہ کیا جائے کہ **اجعل لی علی خزائن الارض** (ملک کے خزانوں پر مجھ کو مقرر کر دو۔) حضرت مسیح کو ماننے والے کہیں گے کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومت سے تعرض نہ کرتے ہوئے خدا کے حقوق ادا کئے جاتے رہیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے اسوہ لینے والوں کو اصل کام یہ نظر آئے گا کہ جب لوگ دعوت حق کو نہ مانیں تو داعی کو چاہئے کہ وہ بستی کو چھوڑ کر دور کسی صحرا میں چلا جائے اور وہاں خدا کا گھر بنا کر عبادت کرے۔ نبی آخرالزماں کو ماننے والے کہیں گے کہ بدر واحد اور حنین واحزاب کے معرکے گرم کرنے کا نام اسلام ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمام پیغمبروں کو اللہ نے ہدایت دی (انعام۔74) تو تم انھیں کے راستہ پر چلو انعام۔(90) اب اگر تاریخ سے عقیدہ اخذ کیا جائے تو وہ کون سا واحد راستہ ہوگا جس پر چلنا تمام نبیوں کے راستے پر چلنے کے ہم معنی ہو۔

خدا کا دین عقیدہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ مگر ہم عقیدہ کو عقیدہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ عقیدہ کو تاریخ سے اخذ نہیں کر سکتے۔

قرآن کی مکی سورتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی دس سالہ زندگی سے ثابت ہے کہ مکہ میں اسلام کی دعوت بالکل غیر سیاسی انداز میں شروع ہوئی تھی۔ توحید، آخرت اور مواسات بنی آدم کی طرف آپؐ لوگوں کو متوجہ کرتے اور ایک خدا کی عبادت کی طرف بلاتے۔ آپؐ نے یا آپؐ کے ساتھیوں نے کبھی کسی کے خلاف تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ کسی قسم کی

سیاسی منازعت کی۔ اس کے باوجود مکہ کے سردار بالکل یک طرفہ طور پر آپؐ کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے آپؐ پر اور مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم ڈھانا شروع کئے۔ سب وشتم سے لے کر سماجی اور معاشی بائیکاٹ تک ہر چیز کو آپؐ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے طے کیا کہ سب مل کر آپؐ کو قتل کر ڈالیں۔ اس وقت آپؐ مکہ سے ہجرت کر کے عرب کے دوسرے شہر یثرب چلے گئے۔

سرداران عرب نے اب بھی آپؐ کو نہ چھوڑا۔ وہ فوج لے کر آئے تا کہ اسلام کے مرکز کو تباہ کر ڈالیں۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلے۔ یہ جنگ آپؐ کی طرف سے تمام تر دفاعی تھی۔ (بقرہ۔190) بدر کے مقام پر دونوں گروہوں میں مقابلہ ہوا۔ خدا کی مدد آپؐ کے شامل حال رہی اور سرداران عرب کو زبردست شکست ہوئی۔ اس شکست نے ان کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ اب محاذ جنگ اور وسیع ہو گیا۔ مکہ کے قریش اور مدینہ اور خیبر کے یہود اسلام کو مٹانے کے لیے متحد ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں احد (3ھ) سے لے کر حنین 8ھ تک مسلسل جھڑپوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور مشرکین اور یہود دونوں کا زور ٹوٹ گیا۔

عرب کے مشرکین اور یہود نے مل کر اسلام کو فنا کرنے کے لیے جو جارحانہ اقدام کیا تھا، اس میں انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ تاہم ان کے بچے کچے افراد نے اب ایک اور منصوبہ بنایا۔ انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ بیرونی حکومتوں (ایران وروم) کو اسلام کے خلاف ابھارا جائے اور ان کے ذریعہ اس کو کچلنے کی کوسش کی جائے۔ یہ حکومتیں پہلے ہی سے عرب میں ایک نئی طاقت کے ابھرنے کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اب خود عربوں ہی کے ایک طبقہ کی حمایت ملی تو وہ اور زیادہ جری ہو گئیں۔ تاہم یہ واقعہ اسلام کے حق میں ایک عظیم تائید غیبی ثابت ہوا، کیونکہ اس وقت کی آبادی دنیا پر عملاً انھیں دونوں سلطنتوں کا غلبہ قائم تھا۔ ان کی طرف سے قتال کے آغاز نے مسلمانوں کو موقع دے دیا کہ وہ افغانستان سے لے کر اسپین تک فتح کرتے چلے جائیں بغیر اس کے ان پر جارحیت کا الزام عائد ہوتا ہو۔

عرب کے پڑوس میں اس زمانہ کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قایم تھیں۔ یورپ میں

خلیج فارس کے دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی جس کے قبضہ میں موجودہ ایران کے علاوہ اطراف کے ملکوں (پاکستان، افغانستان، ترکی، عراق) کے حصے بھی شامل تھے۔ پچھّم کی طرف بحر احمر کے دوسری جانب رومی سلطنت تھی جو شام و فلسطین سے شروع ہو کر بحر روم کے کنارے کنارے افریقہ کے تمام شمالی ملکوں پر قابض تھی۔ اس کے آگے اس کی سرحدیں یورپ میں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔

ان دو شہنشاہیتوں نے قلب عرب کے خشک بیابان کو چھوڑ کر اس کے سرحدی علاقوں میں چاروں طرف اپنی ماتحت عرب ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ اپنے زیر اثر علاقوں میں انھوں نے اپنے مذہب کو بھی پھیلا رکھا تھا۔ عرب کو اپنی سلطنت کا براہ راست حصہ نہ بنا کر بھی وہ اس کو اپنا ماتحت سمجھتے تھے۔ ابو طالب کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے موسمی بازاروں میں گئے اور مختلف قبائل کے سامنے اپنے کو پیش کیا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں خدا کا پیغام پہنچانے کا کام کر سکوں۔ اس سلسلہ میں ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ کے سرداروں سے آپؐ کی گفتگو تاریخ میں نقل ہوئی ہے۔ گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا۔

قال المثنیٰ بن حارثه۔ انما نزلنا بین صیرین احدهما الیمامه والاخریٰ السمامة. فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم وما هذان الصیران فقال له: اما احدهما فطفوف البر وارض العرب واما الآخر فارض فارس وانها کسریٰ وانما نزلنا علی عهد اخذ علینا کسریٰ ان لا نحدث حدثا، ولا نووی محدثا، ولعل هذا الامر الذی تدعوا الیه تکرهه الملوك۔ فاما ما کان یلی بلاد العرب فذنب صاحبه مغفور وعذره مقبول واما ما کان یلی بلاد فارس فذنب صاحبه غیر مغفور، وعذره غیر مقبول فان اردت ان ننصرك مما یلی العرب فعلنا فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما اساتم الرد اذا فصحتم بالصدق۔ (البدایه والنهایه۔)

مثنی بن حارثہ نے کہا ہمارا قیام دو سرحدوں کے درمیان ہے۔ ایک یمامہ دوسرے سمامہ۔ آپؐ نے پوچھا یہ دو سرحدیں کیا ہیں۔ سردار قبیلہ نے کہا، ایک طرف عرب کی

زمین اور اس کی پہاڑیاں ہیں۔ دوسری طرف ایران کی زمین اور اس کی ندیاں ہیں اور ہم وہاں ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور یہ بات جس کی طرف آپؐ بلاتے ہیں، شاید بادشاہوں کو ناگوار ہو، بلاد عرب کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ خطا کار کو معاف کر دیتے ہیں اور عذر کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر بلاد فارس میں خطا کار کی معافی نہیں ہوتی اور اس کا عذر قبول نہیں کیا جاتا۔ پس اگر آپؐ عرب علاقہ میں ہماری امداد چاہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا، تم نے جواب دینے میں کوئی برا نہیں کی اگر تم سچے ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیرونی سلطنتوں نے کس طرح عرب کو اپنے سیاسی مفادات کے تابع بنا رکھا تھا۔

نبوت کے پانچویں سال جب اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر کچھ مسلمان حبش چلے گئے تو قریش کا ایک وفد وہاں پہنچا تھا اور حبش کے بادشاہ اصحمہ نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس میں وہ ناکام رہے۔ اب انھوں نے ایران وروم کی شہنشاہیتوں کا رخ کیا۔ یہود اور مشرکین کے وفود رومی حکمرانوں اور ایرانی بادشاہوں سے ملے اور ان کو اسلام کے سیاسی خطرات سے آگاہ کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک طرف باہر سے کوئی حکومت اسلام کے مرکز (مدینہ) پر حملہ کرے، دوسری طرف عرب قبائل میں اندر سے بغاوت پیدا کر دی جائی اس طرح مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ ایران وروم قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنتیں تھیں۔ ان کو قدیم آباد دنیا کے تقریباً تمام حصہ پر سیادت حاصل تھی۔ اس لیے انھیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ آسانی سے عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی قوت کو کچلنے کے لے آمادہ ہو گئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ ان خطوط کا اصل مقصد اسلام کی دعوت کو وقت کے حکمرانوں تک پہنچانا تھا۔ تاہم اس کا ایک متوقع فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ حکمراں اسلام کو اس کی اصل حیثیت میں سمجھ سکیں اور غلط پروپگنڈہ کی وجہ سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ نیز یہ بھی توقع تھی کہ اگر

حکمرانوں میں سے کچھ لوگ اسلام کی دعوت فطرت سے متاثر ہو گئے تو یہودیوں اور مشرکوں کی سازشیں خود بخود کم زور پڑ جائیں گی۔مکتوبات کی روانگی کے بعد یہ توقع جزوی طور پر بھی ہوئی۔بعض حکمرانوں (مثلاً عمان کے جلندی برادران) مسلمان ہو گئے۔بعض (مثلاً مقوقس حاکم مصر) اسلام کے ہمدرد بن گئے۔

مگر دونوں بڑی سلطنتوں (ایران وروم) نے اس سے مختلف معاملہ کیا۔اس کا پہلا شدید مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ عبداللہ بن حذافہ سہمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب لے کر ساسانی حکمراں خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔یہ خط بالکل سادہ مضمون پر مشتمل تھا۔اس میں کوئی سیاسی بات نہ تھی۔پورا خط صرف یہ تھا۔

> ''محمدؐ رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ شاہ فارس کے نام۔سلام اس شخص پر جو ہدایت قبول کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔میں تجھ کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔میں تمام انسانوں کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں تاکہ اللہ کے عذاب سے ڈراؤں اور جو لوگ انکار کریں،ان کے لیے عذر باقی نہ رہے۔اسلام قبول کرو تمھارے لیے سلامتی ہوگی اور اگر انکار کروگے تو اپنی قوم مجوس کے انکار کا وبال بھی تمھارے اوپر ہوگا۔''

اس خط کو کسریٰ نے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور غصہ میں بولا: میرا غلام ہو کر مجھ کو خطاب کرتا ہے۔(یکتب الی وھو عبدی) اس نے آپؐ کے مکتوب کو پھاڑ کر پھینک دیا۔یہی نہیں۔بلکہ بین اقوامی روایات کے تمام اصولوں کو توڑتے ہوئے آپؐ کے قاصد کو قتل کرڈالا۔اس وقت یمن اس کے ماتحت تھا۔اس کے بعد اس نے اپنے یمنی گورنر باذان کو لکھا کہ محمدؐ کے پاس دو آدمی بھیجو جو ان کو گرفتار کر کے لائیں اور میرے دربار مین حاضر کریں'' اس حکم کی تعمیل میں باذان نے اپنے دو سپاہی مدینہ روانہ کئے جو ناکام واپس گئے۔اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی حکمراں کتنے متکبر تھے اور عربوں اور مسلمانوں کو کتنا حقیر سمجھتے تھے۔

مدینہ کے یہود جن کو ان کی سازشوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے تورات کے قانون کے مطابق،مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔انھوں نے اپنے چالاک اور زبان آور ایلچیوں کو

ایرانی دارالسلطنت مدائن بھیجا۔ انھوں نے ایرانیوں کو مدینہ پر چڑھائی کرنے لیے خوب ابھارا۔ چنانچہ ایرانی حکومت نے جدید عربی طاقت کو ختم کرنے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ خلیفہ اول کے زمانے میں باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہوا۔ مگر نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور خلیفہ ثانی کے زمانے میں تقریباً پوری ساسانی سلطنت اسلام کے جھنڈے کے نیچے آ گئی۔ تاہم ساسانی سلطنت کا آخری وارث یزدگرد ابھی زندہ تھا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار ایرانیوں کی جمعیت تھی۔ ان کی مدد سے وہ ایک قسم کی گوریلا وار حکومت اسلامی کے خلاف جاری کئے ہوئے تھا۔ بالآخر خلیفہ سوم کے زمانہ میں ایک پن چکی والے نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ مرو کے پاس مرغاب میں 23 / اگست 651ء کو پیش آیا۔ اس کے بعد ایرانی سلطنت کا کوئی دعوے دار باقی نہ رہا۔

رومی شہنشاہ ہرقل کو بھی آپ نے اسی قسم کا خط بھیجا، جیسا کسریٰ کو بھیجا تھا۔ اس نے اگرچہ آپؐ کے مکتوب کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ تاہم شام میں ہرقل کی ماتحت جو غسانی ریاست قائم تھی۔ اس کے پاس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر ازدی آپؐ کا مکتوب لے کر گئے تو بصریٰ کے حاکم شرجیل بن عمرو غسانی نے شام کی سرحد پر قاصد نبوی کو قتل کرا دیا۔ یہ صریح طور پر ایک حکومت کی دوسری حکومت پر جارحیت تھی۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے جواب میں تین ہزار کی ایک جمعیت کو سرحد شام کی طرف راوانہ کیا۔ ہرقل نے اپنے غسانی حاکم کو تنبیہ کرنے کے بجائے اس مقابلہ میں اس کا پورا ساتھ دیا اور اس کی مختصر فوج کے ساتھ ایک لاکھ رومی فوج میدان میں اتار دی۔ عربوں اور رومیوں کے درمیان وہ پہلی جنگ پیش آئی جو تاریخ اسلام میں غزوہ موتہ (جمادی الاول 8ھ) کے نام سے مشہور ہے۔

پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ قیصر روم براہ راست میدان میں آ گیا۔ عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو ابتدا ہی میں ختم کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ تیاری شروع کر دی۔ سرحد شام کے سردار اور شاہ غسان، جو قیصر کے باج گذار تھے، ان کے تعاون سے اس نے بڑا لشکر تیار کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ پر حملہ کر کے عرب کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو شروع ہی میں کچل دیا جائے۔ یہ رومی لشکر اسلامی دارالسلطنت کی طرف بڑھنا شروع ہوا اور بلقاء تک پہنچ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں ملیں تو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود

آپؐ نے مسلمانوں کو تیار ہونے کا حکم دے دیا اور رجب 9ھ میں 30 ہزار لشکر لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شام کی سرحد کو عبور کر کے آپؐ تبوک تک کو پہنچے تھے کہ معلوم ہوا کہ شاہ روم نے اس وقت مقابلہ کا ارادہ ترک کر کے اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا ہے۔

خلیفہ اول کے زمانے میں رومیوں سے باقاعدہ جنگ کا آغاز ٹھیک اسی مقام موتہ پر ہوا جہاں اس سے پہلے رومیوں نے مسلمانوں کی دو ہزار فوج کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بعد کے مقابلوں میں مسلمانوں کی کامیابی نے رومیوں کے مخالفانہ جذبات کو اور بڑھا دیا اور وہ پوری طاقت سے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مگر اللہ کی مدد سے فیصلہ مسلمانوں کے موافق ہوتا چلا گیا۔ شام و فلسطین سے گزر کر یہ جنگ شمالی افریقہ کے رومی مقبوضات تک پہنچی اور مسلمان ایک کے بعد ایک رومی ملکوں کو فتح کرتے ہوئے مراکش تک پہنچ گئے۔ اور بالآخر رمضان 91ھ میں ابنائے جبرالٹر کو پار کر کے اسپین میں داخل ہو گئے۔ یہ سارا علاقہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، وہ قدیم رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ رومی حکمرانوں کی جارحیت خود ان کے خلاف پڑی اور آخر کار رومی حکمراں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے تمام مشرقی مقبوضات کو مسلمانوں کے لیے چھوڑ کر اپنے مغربی دارالسلطنت قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہو جائے۔

صدر اول میں مسلمانوں کی جتنی جنگیں ہوئیں، وہ سب دیگر قوموں کے جارحانہ اقدامات کے جواب میں ہوئیں۔ عرب کے اندر قریش اور یہود سے، اور عرب کے باہر ایران و روم سے۔ یہ خدا کا خصوصی فضل تھا کہ جارحیت خود ان قوموں کے خلاف پڑی اور مسلمان ہر جگہ ان کو مغلوب کرتے چلے گئے۔

عرب کے پڑوس میں حبش کی، نسبتاً کمزور سلطنت تھی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔ اس لیے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی۔ اگرچہ اس کی یہ قیمت دینی پڑی کہ حبش (ایتھوپیا) آج شمالی افریقہ کا واحد ملک ہے جہاں مسلم آبادی سب سے کم ہے اور اس کی وجہ سے مسلم دنیا کے خلاف اس کا رویہ ہمیشہ معاندانہ رہتا ہے۔

ایرانیوں اور رومیوں کی طرف سے جارحانہ اقدام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے

مسلمانوں کے لیے ایک ایسا قیمتی موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے گزر کر یورپ کو اس کی آخری سرحدوں تک فتح کرسکتے تھے۔ کیونکہ یہ سب انھیں جارح شہنشاہیتوں کے علاقے تھے۔ اور ان کی جارحیت نے مسلمانوں کو ان کے اندر داخل ہونے کا پورا جواز فراہم کردیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے باہمی اختلاف، خاص طور پر صفین وجمل کی خانہ جنگیوں میں 80 ہزار بہادر مسلمانوں کا کٹ جانا۔ وہ واحد حادثہ ہے جس نے اس امکان کو اپنی پوری شکل میں واقعہ بننے نہیں دیا۔

پچھلے ادیان کی مثال

پچھلی شریعتوں میں دین کی حقیقت گم ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے یہاں مقصد پر واقعات کا غلبہ ہوگیا وہ دین کی مقصدی حیثیت کو اس کے واقعاتی پہلوؤں سے الگ کرکے نہ دیکھ سکے۔ وہ بھول گئے کہ واقعات کی حیثیت نظریات کے مقابلہ میں ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ واقعات سے بظاہر دین کی جو تصویر بن رہی تھی اسی کو انھوں نے اصل دین سمجھ لیا۔ اور پھر دین کی ایسی تشریح کرڈالی جس کا اصل آسمانی دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس بگاڑ کی ایک جزوی مثال وہ ہے جو قرآن میں سورہ آل عمران (93) سورہ انعام (146) میں بیان کی گئی ہے۔ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (1853۔200 ق م) جن کا دوسرا معروف نام اسرائیل ہے یہود کے پیغمبر تھے۔ آپ نے طبّی ضرورت کے تحت بعض جائز غذائیں چھوڑ دی تھیں۔ اسرائیلی روات کے مطابق آپ کو عرق النساء کی شکایت تھی۔ اس لیے علاج آپؑ نے بعض چیزوں مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کردیا تھا۔ آپؑ کے بعد آپؑ کی اولاد نے بھی اپنے بزرگ کی تقلید میں ان کو چھوڑے رکھا۔ حتیٰ کہ یہ ذہن بن گیا کہ یہ چیزیں بجائے خود حرام ہیں اور بالآخر یہودی فقیہوں نے اپنی مقدس کتاب (تورات) میں ان کی حرمت درج کردی۔ ''چوپایوں میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں، تم ان کو یعنی اونٹ اوخرگوش اور سافان کو نہ کھانا، کیونکہ یہ جگالی کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں۔ سو یہ تمھارے

لیے ناپاک ہیں۔'' استثنا 7:14 (احبار 11:4-6)

یہود کے ایک بزرگ پیغمبر کا بعض غذاؤں کو نہ کھانا، آپؑ کی زندگی کا محض ایک اتفاقی جزء تھا، اس کا آپؑ کے پیغمبرانہ مشن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر یہود اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ جو چیز محض ایک اتفاقی واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس سے وہ حرام وحلال کے قوانین اخذ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دین خداوندی کی ایسی تصوری بنا ڈالی جو بظاہر درست ہونے کے باوجود سراسر غلط تھی۔

بگاڑ کی اس قسم کی کلی مثال بھی یہود ہی کے یہاں ملتی ہے اور وہ ان کی آخرت فراموشی اور دنیا پرستی ہے۔ یہود، پیغمبر آخرالزماں کی بعثت سے قبل، دین خداوندی کے نمائندے تھے۔ اپنی اس تاریخ کے تقریبا دو ہزار سال کے دوران انھوں نے عروج وزوال کے زبردست واقعات دیکھے۔ ایک طرف داؤدؑ (962-1024 ق م) اور سلیمانؑ (962-1024 ق م) جیسے بڑے بڑے بادشاہ ان کی قوم میں اٹھے۔ اور یوسفؑ (1816-1906 ق م) جیسی عظیم شخصیت ان میں پیدا ہوئی جس کو اس وقت کے شاہ مصر نے ملک کا پورا انتظام سونپ دیا اور اس کے بعد یہود کو موقع ملا کہ مصر کے انتہائی زرخیز علاقہ میں اپنی آبادیاں قائم کرسکیں۔ فرعون کی غرقابی کے بعد وہ شام وفلسطین کے سرسبز اور زرخیز علاقہ کے وارث بنا دیئے گئے۔ (اعراف۔137)

دوسری طرف یہود کی تاریخ میں بار بار وہ ہولناک لمحے بھی آئے ہیں جب کہ انھوں نے اپنی بدی سے ''خداوند کو غصہ دلایا۔ اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کو غارت گروں کے ہاتھ میں کر دیا جو ان کو لوٹنے لگے' اور اس نے ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ جو آس پاس تھے بیچا۔ سو وہ پھر اپنے دشمنوں کے سامنے کھڑے نہ ہو سکے۔ اور وہ جہاں کہیں جاتے، خداوند کا ہاتھ ان کی اذیت ہی پر تلا رہتا تھا۔ سو وہ تنگ آ گئے۔ (قضاۃ 2:11-17)

مصر سے نکلنے کے بعد 1440 اور 1400 ق م کے درمیان تقریبا چالیس سال تک ان کا یہ حال رہا کہ اپنے ''گناہ اور عہد شکنی'' کے جرم میں وہ صحرائے سینا (دشت فاران سے شرق اردن تک) بھٹکتے رہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں خداوند نے کہہ دیا تھا کہ ''میں اس سارے

خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہے، ایسا ہی کروں گا۔ اس دشت میں وہ برباد ہو جائیں گے۔ اور یہیں ہلاک ہوں گے (گنتی 14:34۔35) 721 ق م میں اشور کے سخت گیر فرماں رواسارگون نے سامریہ کو فتح کر کے مملکت اسرائیل کا خاتمہ کیا اور ہزاروں یہودی مار ڈالے۔ 27 ہزار سے زیادہ یہودیوں کو ان کے ملک سے نکال کر تتر بتر کر دیا۔ اور دوبارہ آباد ہوئے تو۔ 598 ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے یہودیہ کے بادشاہ کو اپنا قیدی بنالیا۔ دوسری بار 587 قم میں بخت نصر نے شدید تر حملہ کیا اور یہودیہ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کو ویران کر ڈالا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔ بعد کو ان کے حالات بدلے اور انھوں نے دوبارہ اپنے ہیکل کی اور اپنے شہروں کی تعمیر کی۔ مگر 70 ق م میں پھر ٹیٹس رومی نے تلوار کے زور پر یروشلم کو فتح کر لیا اور بائبل کے بیان کے مطابق ان کے ایک لاکھ 33 ہزار آدمی مار ڈالے۔ 27 ہزار آدمیوں کو پکڑ کر لے گیا تا کہ ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوائے اور شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کرے۔ یروشلم اور مقدس ہیکل کو بھی اس نے دوبارہ ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔

یہود کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ میں اس کے اتار چڑھاؤ کے واقعات بار بار پیش آئے۔ کبھی انھوں نے دنیوی عیش واقتدار کا لطف اٹھایا، کبھی دنیوی ذلت اور بربادی کا دکھ جھیلا ـــــــ ان کے انبیاء بار بار ان واقعات کو یاد دلا کر انھیں نصیحت کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ خدا کا انعام اور سزا دونوں اسی دنیا میں ملتے ہیں۔ انھوں جنت اور جہنم کی دنیوی تعبیر کر ڈالی۔ اوراس کے بعد اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کتاب مقدس کی ترتیب میں ان کے یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب آسمانی کتاب کے نام سے جو کتاب (تورات) ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس میں دنیوی جنت اور دنیوی جہنم کی تفصیلات سے تو باب کے باب بھرے ہوئے ہیں مگر آخرت کی جنت اور جہنم کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ اگر ملتا ہے تو محض اشاراتی شکل میں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کا ذہن انتہائی دنیا پرستانہ ہو گیا۔ جب انھوں نے دنیا ہی کو انعامات خداوندی کا مقام سمجھ لیا تو بالکل فطری تھا کہ وہ دنیا کی زندگی کے انتہائی حد تک عاشق

ہوجائیں۔قرآن کے الفاظ میں ان کا یہ حال ہوا۔ ’’تم ان یہودیوں کوسب سے زیادہ حیات دنیا کا حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔ان میں سے ہرایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار ہزار برس تک جیتا رہے۔(بقرہ۔96) مال کی محبت میں ان کی اکثریت کا یہ حال ہوا: ’’اگرتم ایک دینار بھی ان کے پاس امانت رکھ دوتو وہ اس کو واپس نہ کریں گے۔الا یہ کہ تم ان کے سر پر سوار ہوجاؤ(آل عمران 75)۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دنیا پرستی خالص ’’نظریاتی‘‘نوعیت کی حامل تھی۔دنیا کی تمام برائیاں دراصل نفس پرستی کی برائیاں ہیں نہ کہ حقیقۃً نظریاتی برائیاں۔مگر نفس پرستی کی ہر قسم کی ابتداء سادہ اور معصوم نظریات کی زمین پر اگتی ہے۔نظریاتی بنیاد کا سہارا لیے بغیر کوئی برائی اس زمین پر جڑ نہیں پکڑ سکتی۔

قرآن نے پہلی بار انسانیت کو اس گمراہی سے نکالا۔اس نے نظریہ اور تاریخ کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔اور اصل دین کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا کہ کسی بندہ خدا کو حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

قران میں حکم دیا گیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ
(شوریٰ 13)

راہ ڈال دی تم کو دین میں وہی جو کہہ دی تھی نوح کو اور جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔(ترجمہ شاہ عبدالقادر)

اس آیت کے سلسلے میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس میں الدین سے مراد دین کی اصولی اور اساسی تعلیمات ہیں۔تفصیلی شریعت یہاں مراد نہیں ہے۔اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں یہ حکم ہے کہ اس متفق علیہ دین پر قائم ہوجاؤ جو تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔اب چونکہ، قرآن کی تصریح کے مطابق، مختلف انبیاء کی شریعت اور منہاج میں اختلاف تھا(مائدہ:48) اس لیے شریعتوں پر اتفاق کے ساتھ عمل نہیں ہوسکتا۔صرف اساسات دین کے سلسلہ میں یہ

ممکن ہے کہ متفقہ طور پر ان کے اوپر عمل کیا جا سکے۔ کیونکہ اساسی تعلیمات سب کے یہاں ایک تھیں۔

اس حکم کے ذریعہ انبیاء کی دعوت اور انبیاء کی تاریخ کے درمیان نوعی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مشن خواہ ایک ہو، مگر تاریخیں ہمیشہ جدا جدا بنتی ہیں۔ مختلف انبیاء کے گرد جو الگ الگ تاریخی نظائر بنے یا وقتی حالات کے اثر سے ان کی زندگی میں جو اتفاقی اجزاء شامل ہوئے، ان کو قرآن نے ان کے اصل مشن سے الگ کر دیا اور غیر متبدل اور ابدی تعلیمات کو "الدین" قرار دے کر حکم دیا کہ اصل اور مستقل اہمیت اس کو دو اور اس کی تعمیل میں پوری طرح لگ جاؤ۔

ہر نبی اپنے حالات کی رعایت سے کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل ایک وقتی نظیر تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ دائمی حجت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر حضرت سلیمان نے یمن کی مشرک ملکہ کو جنگ کی دھمکی دی۔ حضرت یوسفؑ نے مصر کے مشرک بادشاہ کے ساتھ تعاون کا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت مسیحؑ نے فلسطین کے مشرک حکمرانوں سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ یہی عمل فرق انفرادی امور میں بھی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ نے مدین کے ایک صالح خاندان میں شادی کی تو آپ کا مہر آٹھ سالہ خدمت قرار پائی۔ حضرت علیؓ کا نکاح پیغمبرؐ کی لڑکی سے مدینہ میں ہوا تو آپ نے مہر میں ایک زرہ ادا کی، وغیرہ۔ اصولی تعلیمات اور عملی تفصیلات میں اس قسم کا فرق لازمی ہے۔ اور اکثر بگاڑ اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ کسی عملی نظیر کو وہی اہمیت دے دی جاتی ہے جو کہ ایک اصولی حکم کو دینا چاہئے۔

اساسات دین اور متعلقات دین کا یہ فرق ذہن میں ہو تو سچی خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ بندی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ دینی کوششیں اپنے صحیح مقام پر لگنے لگتی ہیں۔ آدمی اس فتنہ سے بچ جاتا ہے کہ دین کے نام پر ایک ایسی چیز کے لیے معرکہ آرائی شروع کر دے جو حقیقتاً اس کے لیے دینی فریضہ کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔

اس فرق کی ایک حکمت یہ ہے کہ اصل دین اور بقیہ تفصیلات کی حیثیت کسی مجموعی

فہرست کی نہیں ہے۔ بلکہ عملی تفصیلات، اصل دین کے لیے لوازم ونتائج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل دین اگر بیج ہے تو عملی تفصیلات اس کی شاخیں ہیں۔ اصل دین جب قائم ہوجاتا ہے تو بقیہ تفصیلات بھی، حسب حالات، وجود میں آتی ہے چلی جاتی ہیں۔ اصل دین مطلق طور پر ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے۔ جب کہ عملی تفصیلات ان واقعی حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتی ہیں جن میں کوئی شخص اپنے آپ کو پا رہا ہو۔

ایک وضاحت

کچھ لوگ اسلام کو سیاسی اصطلاحوں میں بیان کرنا پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگ اقتصادی اصطلاحوں میں۔ بلاشبہ اس قسم کے لٹریچر کی ایک کلامی اہمیت ہے۔ مگر یہ اسلام اور انسان دونوں کا بے حد کمتر اندازہ ہے۔ ظاہری ہنگاموں کے پیچھے جو ''انسان'' ہے اگر ہم اس کو دیکھ سکیں تو معلوم ہوگا کہ اصل انسان کی مانگ اس سے کہیں زیادہ گہری ہے جو اس قسم کے اقتصادی اور سیاسی قصیدے اس کو فراہم کرتے ہیں۔ انسان اپنی نفسیات کی سطح پر اپنی فطرت کا جواب پانا چاہتا ہے نہ کہ سماجی ڈھانچہ کی سطح پر۔ اسی طرح خدا کے دین کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے رب سے ملائے۔ وہ اس کی روح میں ربانی ہلچل پیدا کرے۔

انسانی فطرت کی سب سے بڑی مانگ یہ ہے کہ حقیقت اعلیٰ (بالفاظ دیگر خدا) کے ساتھ اپنی نسبت کو معلوم کر سکے۔ فلسفیانہ تلاش کی تمام صورتیں اسی کی مختلف مثالیں ہیں۔ ان کوششوں کے ذریعہ انسانوں نے اپنے اس سوال کا جواب معلوم کیا وہ ایک جملہ میں یہ تھا کہ انسان حقیقت اعلیٰ کی توسیع یا اس کا ایک انش ہے۔ وہ بحر حقیقت کا ایک قطرہ ہے جو وقتی طور پر نکل کر دوبارہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام کا جواب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے نزدیک انسان خدا کی مخلوق ہے۔ قدرت کامل کے مقابلہ میں وہ عجز کامل کا آخری نقطہ ہے۔

یہ دونوں جواب مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پہلے جواب سے انسان

مرکزی (Man.Centered) فکر ابھرتا ہے، اور دوسرے جواب سے خدامرکزی God centered فکر۔ نیز اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق انسان کے ارادہ واختیار کی توجیہہ یہ بنتی ہے کہ انسان خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہ اپنے عمل کے مطابق بالآخر جنت یا جہنم میں پہنچادیا جاتا ہے۔ اسلام میں انسانی زندگی کا اعلیٰ تصور یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو۔ اس کے برعکس دوسری توجیہہ عین اپنی فطرت کے تحت دنیا رخی زندگی بن جاتی ہے۔

اسلام کے سوا جو دوسرے جوابات ہیں، ان کے مطابق موت کے بعد انسان کی خود شعوری ختم ہوجاتی ہے۔ اسی لیے ان جوابات کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں سب کچھ حاصل کرنا چاہے۔ مگر تجربہ بتا تا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ''امتحان'' کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ مستقل ''جزا'' کے لیے۔ اس لیے موجودہ دنیا میں جزا ڈھونڈنے والا بہت جلد اپنے مقصود کو ناممکن الحصول سمجھ کر غیر مطمئن ہوجاتا ہے۔ اسلام میں اس قسم کے عدم اطمینان کا سوال نہیں۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ دنیا صرف دارالعمل ہے نہ کہ دار الجزاء۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی معنوں میں مطمئن زندگی اسلام ہی کی بنیاد پر بن سکتی ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت واقعہ کے اعتراف پر مبنی ہے۔ جب کہ دوسرے نظریات موجودہ محدود دنیا میں ایک ایسی چیز ڈھونڈ رہے ہیں جس کا انتظام صرف اگلی وسیع تر دنیا میں کیا گیا ہے۔

انسان حقیقۃً اسی وقت اپنے آپ کو پاتا ہے جب کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت کو دریافت کرلے۔ اس سے پہلے وہ اس کائنات میں بے جگہ ہے، عجز کے سوا کوئی مقام نہیں جہاں وہ اپنے آپ کو ٹھہرا سکے۔ عجز کی دریافت خدا کے مقابلہ میں اپنی نسبت کی دریافت ہے۔ مقام عجز پر پہنچنا اگرچہ مشکل ترین کام ہے۔ مگر یہی انسانی شعور کا سب سے اونچا درجہ بھی ہے۔ اس سے پہلے انسان خدا کی زد میں نہیں آتا۔ اس لیے اس سے پہلے وہ خدا کی رحمتوں کا تجربہ نہیں کرتا۔

باب چہارم

قرآن: ایک دائمی معجزہ

جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں قرآن ایک حیرت انگیز استثناء ہے، تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہو چکی ہیں۔ مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی بدستور زندہ ہے آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو لکھتے اور بولتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے قرآن اتارا گیا تھا ______ یہ واقعہ قرآن کے معجزاتی کتاب ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کے سوا ساری انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس نے اپنی اصل زبان کو اس طرح بعد کے زبانوں میں باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قریب العہد مقدس کتاب ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاساً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان غالبا آرامی تھی۔ تاہم انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ آج ہمارے پاس ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے، گویا حضرت مسیح کے خیالات صرف ترجمہ شدہ حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان میں بھی قدیم وجدید یونانی سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے عہد نامہ میں کم از کم 550 الفاظ (کل متن کا 12 فی صد) ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ انیسویں صدی میں جرمن عالم اڈولف ڈیزمن (Adolf Deismann) نے مصر میں بعض قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اس نے قیاس کیا کہ ''ببلیکل گریک'' دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں رائج تھی۔ اس نے مذکورہ نامعلوم الفاظ کے کچھ معانی متعین کئے۔ تاہم اب بھی یونانی انجیل میں 50 الفاظ (کل متن کا ایک فی صد) ایسے ہیں جن کے معانی ابھی تک نامعلوم ہیں۔ (حوالہ مضمون کے آخر میں)

ارنسٹ ریناں (1892-1823) نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اللغات السامیہ میں لکھا ہے:

انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ عربی زبان ہے۔ یہ زبان قدیم تاریخ میں ایک غیر معروف زبان تھی۔ پھر اچانک وہ ایک کامل زبان کی حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہوسکی حتیٰ کہ اس کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے اول دن جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔

قرآن کی زبان کے بارے میں فرانسیسی مستشرق کا یہ اعتراف دراصل اعجاز قرآن کا اعتراف ہے۔ کیونکہ حقیقۃً یہ قرآن کا معجزاتی ادب ہی ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ رکھا جس سے دوسری تمام زبانیں متاثر ہوئی ہیں۔ مسیحی عالم جرجی زیدان (1914-1861) نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

وبالجملة فان للقرآن تاثیرا فی آداب اللغة العربیة لیس للکتاب دینی مثله فی اللغات الاخریٰ (آداب اللغات العربیہ)

مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا ہے جس کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں تبدیلی کا شکار رہی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی زبان کا آج کا ایک عالم اس زبان کی چند سو برس پہلے کی کتاب کو لغت اور شرح کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کے اسباب عام طور پر دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب، دوسرے ادبی ارتقاء۔ عربی زبان کے ساتھ پچھلی صدیوں میں یہ دونوں واقعات اسی شدت کے ساتھ پیش آئے جس طرح کسی دوسری زبان کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ مگر وہ اس زبان کے لسانی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ کرسکے۔ عرب زبان اب بھی وہی زبان ہے جو چودہ سو برس پہلے نزول قرآن کے وقت مکہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہومر (م 850ق م) کی الیڈ، تلسی داس (م 1623ء) کی رامائن اور شیکسپیئر (1616-1564) کے ڈرامے انسانی ادب کا شاہکار

سمجھے جاتے ہیں اور زمانۂ تالیف سے لے کر اب تک مسلسل پڑھے جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ان زبانوں کو اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے جن میں وہ لکھے گئے تھے۔ ان کی زبانیں اب کلاسیکس کی زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں۔ زبانوں کی تاریخ میں قرآن واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے علمی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت پر باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی سماج کی کوئی بھی تبدیلی اُس میں تبدیلی کا باعث نہ بن سکی۔ یہ واقعہ قرآن کے ایک برتر کلام ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے، اس کے بعد اعجاز قرآن کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی انقلابات

اجتماعی انقلابات کس طرح زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے لاطینی کی مثال لیجئے۔ لاطینی کا مرکز بعد کے دور میں اگر چہ اٹلی بنا، مگر اصلاً یہ زبان اٹلی کی پیداوار نہ تھی۔ تقریباً 12 سو قبل مسیح لوہے کا زمانہ آنے کے بعد، جب یورپ کے قبائل اطراف کے علاقوں میں پھیلے تو ان کی ایک تعداد، خاص طور پر کوہ الپ کے قبائل، اٹلی میں داخل ہوئے اور روم ااور اس کے آس پاس آباد ہوئے۔ ان کی بولی اور مقامی بولی کے ملنے سے جو زبان بنی، وہی ابتدائی لاطینی زبان تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لیوس اینڈ تونیکس نے یونانی زبان کے کچھ ڈراموں اور کہانیوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس طرح لاطینی زبان ادبی زبان کے دور میں داخل ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے لاطینی کو اپنی سرکاری زبان بنایا مسیحیت کے پھیلاؤ سے بھی اس کو تقویت ملی۔ اس طرح مذہب اور سیاست نیز سماجی اور اقتصادی زور پر اس کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ قدیم یورپ کے تقریباً پورے علاقہ میں پھیل گئی۔ سینٹ آگسٹین (430-354) کے زمانے میں لاطینی اپنے عروج پر تھی۔ قرون وسطیٰ میں لاطینی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین اقوامی زبان سمجی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی میں مسلم قومیں ابھریں اور انھوں نے رومی سلطنت کو توڑ کر اس کو

قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ 1453 میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے وہاں سے بھی اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہزار برس قبل جب رومی شہنشاہیت ٹوٹی تو مختلف علاقائی بولیوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ یہی بولیاں، لاطینی کی آمیزش کے ساتھ بعد کو وہ زبانیں بنیں جن کو آج فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، رومانوی، زبانیں کہتے ہیں۔ اب لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادتی زبان ہے اور سائنس اور قانون کی اصطلاحات میں استعمال ہوتی ہے۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن (1727-1642) کی پرنسپیا کوئی اصل زبان میں پڑھنا چاہے تو اس کو قدیم لاطینی زبان سیکھنی پڑے گی۔

یہی معاملہ تمام قدیم زبانوں کے ساتھ ہوا۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زبان ختم ہو گئی اور اس کی جگہ دوسری بدلی ہوئی زبان نے لے لی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی، انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آئے ہیں تو وہ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ یہی تمام حالات پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس تغیر پذیر لسانی دنیا میں عربی کا غیر تغیر پذیر رہنا تمام تر قرآن کا معجزہ ہے۔

70ء میں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب (مدینہ) آئے یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی۔ عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہو گئی۔ تاہم ان کی عربی عام عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عبری اور عربی کا ایک مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن عرب سے نکلے اور ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں داخل ہوئے جہاں کی زبانیں دوسری تھیں۔ مگر اس اختلاط کا کوئی اثر ان کی زبان پر نہیں پڑا۔ عربی بدستور اپنی اصل حالت پر محفوظ رہی۔

نزول قرآن کے بعد عربی زبان کے لیے اس قسم کا پہلا موقع خود صدر اول میں پیش آیا۔ اسلام عرب کے مختلف قبائل میں پھیلا۔ وہ لوگ اسلامی شہروں میں یک جا ہونے

لگے۔مختلف قبائل کی زبانیں تلفظ،لب ولہجہ وغیرہ کے اعتبار سے کافی مختلف تھیں۔ابوعمر بن العلاء کوکہنا پڑا تھا۔ما لسان حمیر بلساننا ولا لغتھم بلغتنا (قبیلہ حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے۔) حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک اعرابی کوقرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو پکڑ کر آنحضورؐ کے پاس لائے۔کیونکہ وہ الفاظ قرآن کو اتنے مختلف ڈھنگ سے ادا کررہا تھا کہ حضرت عمر یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کا کون سا حصہ پڑھ رہا ہے۔اسی طرح آنحضورؐ نے ایک بار عرب قبیلہ کے وفد سے اس کی اپنی بولی میں گفتگو کی تو حضرت علی کو ایسا محوس ہوا جیسے آپؐ کوئی اور زبان بول رہے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ لہجوں کا اختلاف تھا۔مثلاً بنوتمیم جومشرقی نجد میں رہتے تھے،وہ جیم کا تلفظ یاء سے کرتے تھے،وہ مسجد کومسید اور شجرات کوسرات کہتے تھے۔اسی طرح بنوتمیم ق کو جیم بولتے تھے۔مثلا طریق کوطریج،صدیق کوصدیج،قدر کو جدر اور قاسم کو جاسم غیرہ۔اس طرح مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام قانون کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہیئے تھا جو بالآخر ایک نئی زبان کی تشکیل پر منتہی ہوتا۔مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہوسکا۔اس کے برعکس وہ وقعہ پیش آیا جس کو ڈاکٹر احمد حسین زیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ما کانت لغۃ مُضَرَ بعد الاسلام لغۃ امۃ واحدۃ عانما کانت لغۃ لجمیع الشوب التی دخلت فی دین اللہ۔اسلام کے بعد عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں رہی۔بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

پھر یہ عرب مسلمان اپنے ملک سے باہر نکلے۔انھوں نے ایک طرف جبل الطارق تک اور دوسری طرف کاشغر تک فتح کرڈلا۔ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں،وہ فارسی،قبطی،بربری،عبرانی،سریانی،یونانی،لاطینی،آرامی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور تمدن میں عربوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ان کا ایران سے اختلاط ہوا جو اس وقت کی دو عظیم شہنشاہیتوں میں سے

ایک تھا۔ان کا تصادم رومی تہذیب اورعیسائی مذہب سے ہوا جو زبردست ترقی کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ان کا سابقہ شام سے پیش آیا جہاں فینیقی، کنعانی،مصری، یونانی،غسانی قوموں نے اپنے آداب واطوار کے نمایاں اثرات چھوڑے تھے۔ان کا مقابلہ مصر سے ہوا۔جہاں مشرق ومغرب کے فلسفے آکر ملے تھے۔یہ اسباب بالکل کافی تھے کہ عربی میں ایک نیا عمل شروع ہوا اور ابتدائی زبان کے ساتھ ان نئے عوامل کے اثر سے ایک زبان وجود میں آجائے جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہو۔ اگر اتنے بڑے لسانی بھونچال کے باوجود قرآن اس زبان کے لیے ایک ایسا برتر معیار بنا رہا جس نے تمام دوسرے عوامل کو اس کے لیے بے حقیقت بنا دیا۔

اسلام کی فتوحات کے بعد عربی زبان صرف ایک ملک کی زبانی نہ رہی بلکہ کئی درجن ملکوں اور قوموں کی زبان بن گئی۔ایشیا اور افریقہ کی عجمی اقوام نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی زبان بھی دھیرے دھیرے عربی بن گئی۔فطری طور رپر ان کی غیرملکی اقوام میں عربی زبان بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی۔ان کی زبان میں اپنی غیر زبانوں کے اثر سے بہت سی خامیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ خود عربوں میں جو لوگ زیادہ باشعور نہ تھے۔دھیرے دھیرے وہ ان قوموں سے اثر لینے لگے۔یہاں تک کہ خود ان کی زبان بدلنا شروع ہو گئی۔بڑے بڑے شہروں میں یہ غلطیاں سب سے زیادہ تھیں۔کیونکہ یہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔بڑھتے بڑھتے یہ خرابی خواص تک پہنچ گئی۔زیاد بن امیہ کے دربار میں ایک بار ایک شخص آیا اور بولا **توفی اباناو ترك بنون**۔(ہمارا باپ مر گیا اور اولاد چھوڑ گیا۔)اس جملہ میں ابانا کی جگہ ابونا ہونا چاہئے تھا اور بنون کی جگہ بنین۔اس طرح بے شمار فروق پیدا ہو گئے۔دیگر تاریخی زبانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔وہی عربی زبان کے ساتھ بھی لازماً ہوتا۔مگر یہاں بھی قرآن کی ادبی عظمت عربی کے لیے ڈھال بن گئی اور عربی زبان کی صورت پھر بھی وہی باقی رہی جو قرآن نے اس کے لیے مقرر کر دی تھی۔

اس طرح کے واقعات جو عربی زبان کی پچھلی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بار بار پیش آئے قرآن کے معجزہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔کیونکہ یہ تمام تر قرآن کی عظمت ہی کا نتیجہ

تھا جس نے عربی کو کسی تغیری عمل کا معمول بننے نہ دیا

دوسری صدی ہجری میں اموی سلطنت کا خاتمہ اور عباسی سلطنت کا قیام عربی زبان کے لیے زبردست فتنہ تھا۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکمراں عرب قومیت اور عربی زبان وادب کی حمایت میں جانب داری اور تعصب کی حد تک سخت تھے۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دمشق کو بنایا تھا جو عرب دیہات کی سرحد پر واقع تھا۔ ان کی فوج، دفتری عملہ اور افسران سب عرب ہوا کرتے تھے۔ مگر عباسی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہوگیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد سے بنی امیہ کا خاتمہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے نظم ونسق میں ایرانی اعاجم کا عمل دخل ہوجانا لازمی تھا، حتیٰ کہ عباسیوں نے دار الخلافہ بغداد کو قرار دیا جو ایران سے بہت قریب تھا۔ انھوں نے ایرانیوں کو اتنی چھوٹ دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزدانہ کاروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالقصد کمزور کرنے کی تدبیر کرنے لگے۔ عربی عصبیت کے کمزور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت اور سماج کے تمام معاملات پر چھا گئے۔ عربوں اور غیر عربوں میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ آریائی تہذیب اور سامی تہذیب کے ملنے سے زبان اور تہذیب میں نیا انقلاب آگیا۔ اکاسرہ کے پوتے اور قدیم جاگیرداروں کے بیٹے پھر سے ابھر آئے۔ انھوں نے اپنے آباواجداد کی تہذیب کو ازسرنو زندہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔

ان واقعات کا عربی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ متنبی (965-915ء) کے زمانہ میں عربی کی جو حالت ہوچکی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے چند اشعار سے ہوتا ہے۔

مَغانی الشِعب طِیباً فی المغانی   بِمنزِلَۃِ الربیعِ مِنَ الزَمانِ
ولٰکنّ الفتیَ العربیَّ فیھا   عزیب الوجہ والید واللسانِ
مَلاعِبُ جِنَۃ لوسَار فیھا   سلیمان لسار بترجمان۔

شرح دیوان المتنبیٰ (بیروت 1938) صفحہ 384

''شعب بوان (ایران) کے مکانات عمدگی میں تمام مکانوں سے اسی طرح بڑھے

ہوئے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں بہار کی فصل۔مگر اس بستی میں ایک عرب جوان (میں) اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہے۔سلیمان جن کے تابع جنات تھے۔(جو جانوروں تک کی بولیاں سمجھتے تھے) اگر اس علاقہ میں آئیں تو انھیں اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا۔'' ______ ترکوں اور کردوں نے بھی اس سلسلے میں ایرانیوں کی تقلید کی۔مگر قرآن کی ادبی عظمت عربی زبان کے لیے ڈھال بنی رہی۔اس قسم کی کوششوں سے وقتی ہل چل تو ضرور پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ دب کر رہ گئی اور عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔

خلیفہ متوکل (247-207ھ) کے بعد عجمی اقوام، ایرانی اور ترک، عرب علاقہ میں بہت زیادہ دخیل ہوگئے 256ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کی سلطنت کو برباد کردیا۔ 898ھ میں اندلس کی عرب حکومت کو یورپی اقوام نے ختم کردیا۔ 923ھ میں مصروشام سے فاطمیوں کا خاتمہ ہوگیا اور ان عرب علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے قبضہ میں چلی گئی۔اسلامی حکومت کا دارالسلطنت قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ ہوگیا۔سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی قرار پائی۔عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ اور اسالیب کثرت سے آنے لگے۔

عالم عرب پر ساڑھے پانچ سوسال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام عرب دنیا عجمی بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے رہی، حتیٰ کہ مغل، ترک اور ایرانی حکمراں عرب آثار تک کو مٹانے پر تلے رہے۔عربی کے کتب خانے جلائے گئے۔مدرسے اجاڑے گئے، علماء کو ذلیل کیا گیا۔عثمانی سلطنت نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ عربوں کو ترک بنانے کی وہ مہم چلائی جس کو جمال الدین افغانی نے بجا طور پر ''تتریک العرب'' کہا ہے۔مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی کو پیدا نہ کرسکا۔بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی قوموں نے عربی زبان وادب اور عرب تہذیب کو جو نقصانات پہنچائے وہ عربی زبان کا نام ونشان مٹانے کے لیے بالکل کافی تھے۔اس کے بعد، دوسری زبانوں کی تاریخ کے مطابق، یہ ہونا چاہئے تھا کہ عربی زبان اپنی دیگر سامی زبانوں سے مل جاتی۔یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوا ہوتا تو

عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔ تاہم جہاں تک عرب علاقہ کا تعلق ہے، وہاں اس کا بدستور اپنی سابقہ شان میں باقی رہ جانا تمام تر قرآن ہی کا معجزہ تھا۔ قرآن کی عظمت نے اس مدت میں لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ زبان سے اپنا تعلق حکومت واقتدار کے علی الرغم باقی رکھیں یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی بے شمار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان وادب کی خدمت کی مثال کے طور پر ابن منظور (711-630ھ) ابن خلدون (808-732ھ) وغیرہ۔

نپولین کے قاہرہ میں داخلہ 1798ء کے بعد جب مصر میں پریس آیا اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو عربی زبان کو نئی زندگی ملی تاہم پچھلے سیکڑوں برس کے حالات نے یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کی مصر وشام کے دفاتر کی زبان ترکی وعربی کا ایک مرکب تھا۔

1882 میں مصر پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پھر صورت حال بدلی۔ انھوں نے عربی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی۔ تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کر دی گئی۔ مختلف زبانیں سکھانے کے ادارے ختم کر دیئے گئے اسی طرح جن عرب علاقوں پر فرانسیسیوں کا غلبہ ہوا، وہاں انھوں نے فرانسیسی کو رواج دیا۔ مگر تقریباً سو سال تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے غلبہ کے باوجود عربی زبان بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ اس میں الفاظ کی وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ مثل کے طور پر ٹینک کے لیے دبابہ کا لفظ رائج ہوا۔ جو پہلے معمولی منجنیق کے لیے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح طرز بیان میں وسعت پیدا ہوئی مثلاً نومسلموں کے حالات پر آج ایک کتاب شائع ہو تو اس کا نام رکھا جاتا ہے **لماذا سلمنا** جب کہ اس سے پہلے مسجع و مقفی ناموں کا رواج تھا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ معرب ہو کر رائج ہوئے مثلاً دکتور (ڈاکٹر) مگر اس سے اصل زبان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل زبان بدستور وہی آج بھی ہے جو قرآن کے نزول کے وقت مکہ میں رائج تھی۔

ادبی ارتقاء

زبانوں میں تبدیلی کا دوسرا سبب ادیبوں اور مصنفوں کے کارنامے ہیں۔ جب بھی

کوئی غیر معمولی ادیب یا مصنف پیدا ہوتا ہے، وہ زبان کو کھینچ کر نئے لسانی اسلوب کی طرف لے جاتا ہے۔اس طرح زبان تبدیلی اور ارتقاء کے مراحل طے کرتی رہتی ہے۔اور بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔عربی زبان میں،اس کے برعکس،ایسا ہوا کہ قرآن نے اول روز ہی ایسا برتر معیار سامنے رکھ دیا کہ کسی انسانی ادیب کے لیے ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اس سے اوپر جاسکے۔اس لیے عربی زبان اسی اسلوب پر باقی رہی جو قرآن نے اس کے لیے مقرر کردیا تھا۔دوسرے لفظوں میں،عربی زبان میں،قرآن کے بعد کوئی دوسرا ''قرآن'' نہ لکھا جا سکا۔اس لیے زبان بھی قرآن کے سوا کوئی زبان نہ بن سکی۔

انگریزی زبان کی مثال لیجئے۔ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں کسی علمی خیال کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔پانچ سو برس سے بھی زیادہ عرصہ تک یہی حال رہا۔انگریزی زبان کا معمار اول جافرے چاسر(1400۔134) پیدا ہوا تو انگلستان کی دربای زبان فرانسیسی تھی۔چاسر جو لاطینی،فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتا تھا،اس نے انگریزی میں اشعار کہے اور نظمیں لکھیں۔اپنی غیر معمولی ذہانت اور دیگر زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہوسکا کہ انگریزی بولی کو آگے لے جائے اور اس کو ایک علمی زبان کا روپ دے۔ہاسر(Erenst Hauser) کے الفاظ میں اس نے اپنی کامیاب نظموں کے ذریعہ انگریزی کو ایک مضبوط بڑھاوا(Firm boost) دیا اس نے ایک بولی کو ایسی طاقت ور زبان بنادیا جس میں ترقی کے نئے امکانات چھپے ہوئے تھے۔
(ریڈرز ڈائجسٹ۔جون 1975)

دوسو برس تک چاسر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا رہنمار ہا۔یہاں تک کہ ولیم شکسپیر(1625۔1558) کا ظہور ہوا جس نے چاسر سے زیادہ برتر ادب کا نمونہ پیش کیا۔اپنے اشعار اور ڈراموں کے ذریعہ اس نے انگریزی کو دوبارہ ایک نیا معیار عطا کیا۔اب انگریزی زبان ایک قدم اور آگے بڑھی اور ترقی کی نئی شاہراہ پر سفر کرنے لگی۔یہ دور تقریباً ایک سو برس تک رہا۔یہاں تک کہ سائنس کے ظہور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی،دوبارہ نئے معیار قائم کرنے شروع کئے۔اب شعر کے بجائے،نثر،اور افسانہ

نویس کے بجائے واقعہ نگاری کو اہمیت ملنے لگی۔اس کے اثر سے انگریزی میں سائنٹفک اسلوب وجود میں آیا۔سویفٹ (1745_1667) سے لے کر ٹی۔ایس۔ایلٹ (1888-1965) تک درجنوں ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے زبان کو وہ معیار عطا کیا جس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔

یہی عمل تمام زبانوں میں ہوا ہے ایک کے بعد دوسرا زیادہ بہتر لکھنے والا ادیب یا ادیبوں کا گروہ اٹھتا ہے اور وہ زبان کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے۔اس طرح زبان بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد اتنا فرق ہوجاتا ہے کہ اگلے لوگ پچھلی زبان کو لغات اور شرح کے بغیر سمجھ ہی نہ سکیں۔

اس کلیہ سے صرف ایک زبان مستثنیٰ ہے اور وہ عربی زبان ہے۔یہی واقعہ قرآن کے اس دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ کوئی شخص قران جیسی کتاب وضع نہیں کرسکتا۔بلاشبہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پچھلی صدیوں میں متعدد لوگوں نے قرآن کے جواب میں دوسرا قرآن لکھنے کی کوشش کی،مگر سب کے سب ناکام رہے۔مثال کے طور پر مسیلمہ بن حبیب،طلیحہ بن خویلد،نضر بن الحارث،ابن الراوندی،ابوالعلا المعری۔ابن المقفع۔متنبیٰ وغیرہ۔اس سلسلے میں ان کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں،وہ اتنی سطحی ہیں کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کو رکھنا بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔مثلاً مسیلمہ کے ''قرآن'' کا ایک حصہ یہ تھا:

یاضفدع نقّی ما تنقین فلا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین۔

اے منڈکی جتنا ٹرا سکے ٹرالے،تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والوں کو روکے گی۔

اسی طرح مسیلمہ کا ایک اور ''الہام'' یہ تھا:

لقد انعم الله علی الجبلی،اخرج منها نسمة تسعی،من بین صفاق حشا تہذیب سیرۃ ابن ہشام،جلد دوم،صفحہ 121

اللہ نے حاملہ عورت پر بڑا انعام کیا ہے،اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی جان نکالی،جھلی اور پیٹ کے اندر سے

تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا ثبوت وہ مسلسل واقعہ ہے جس کو ارنسٹ ریناں نے ایک

لسانی عجوبہ قرار دیا ہے جس طرح دوسری زبانوں میں زبان آور پیدا ہوئے، اسی طرح عربی میں بھی شعراء اور ادباء اور مصنفین پیدا ہوئے اور پیدا ہورہے ہیں، مگر اس پوری مدت میں کوئی ایسا زباں داں نہ اٹھا جو قرآن سے برتر ادب پیش کر کے عربی میں نیا لسانی معیار قائم کرتا اور زبان کو نئے مرحلہ کی طرف لے جاتا۔ اس لیے زبان اسی مرحلہ ترقی پر قائم رہی جو قرآن نے اس کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ اگر دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے جو قرآن کے مقابلہ میں زیادہ اعلیٰ ادب کا نمونہ پیش کرتے تو ناممکن تھا کہ زبان ایک مقام پر رکی رہے۔

قرآن کی مثال عربی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے کسی زبان میں آخری اعلیٰ ترین ادیب اول روز ہی پیدا ہو جائے ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی ایسا ادیب نہیں ابھرے گا جو زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں جو زبان عرب میں رائج تھی، اس کو ترقی دے کر قرآن نے اعلیٰ ترین ادب کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہ تھا۔

قرآن نے عربی کے روایتی اسالیب پر اضافے کر کے اس میں توسیع کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر سورہ اخلاص میں ''احد'' کا استعمال۔ عربی زبان میں اس سے پہلے یہ لفظ مضاف مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا آیا تھا۔ جیسے یوم الاحد (ہفتے کا دن) یا نفی عام کے لیے جیسے ماجاءنی احد (میرے پاس کوئی نہیں آیا) وغیرہ مگر قرآن نے یہاں لفظ احد کو ہستی باری تعالیٰ کے لیے وصف کے طور پر استعمال کیا جو عربی زبان میں غیر معمولی تھا۔ عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کئے۔ مثلا استبرق (فارسی) قسورہ (حبشی) صراط (یونانی) یم (سریانی) غساق (ترکی) قسطاس (رومی) ملکوت (آرامی) کافور (ہندی) وغیرہ۔ مکہ کے مشرکین نے جب کہا تھا کہ وما الرحمن (فرقان۔60) تو اس کا لسانی پس منظر یہ تھا کہ رحمان کا لفظ عربی نہیں یہ سبائی اور حمیری زبان سے آیا ہے۔ یمن اور حبشہ کے نصرانی اللہ کو رحمٰن کہتے تھے۔ قرآن نے اس لفظ کی تعریب کر کے اس کو اللہ کے لئے استعمال کیا تو مکہ والوں کو وہ اجنبی محسوس ہوا۔ انھوں نے کہا ''رحمان کیا'' قرآن میں غیر عربی

الاصل الفاظ ایک سو سے زیادہ شمار کئے گئے ہیں جو فارسی ، رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی قبطی وغیرہ زبانوں سے لیے گئے ہیں۔

قرآن اگرچہ قریش کی زبان میں اترا۔ مگر دوسرے قبائل عرب کی زبان بھی اس میں شامل کی گئی۔ مثلاً قرآن میں ''فاطر'' کا لفظ آیا ہے، عبداللہ بن عباسؓ جو ایک قریشی مسلمان تھے، کہتے ہیں:

ما کنت ادری معنی فاطر السماوات والارض حتی سمعت اعرابیا یقول لبئر ابتدأ حفرھا: انا فطرتھا

میں فاطر السماوات والارض کے معنی نہیں سمجھتا تھا یہاں تک ایک اعرابی جس نے ایک کنواں کھودنا شروع کیا تھا، کہا کہ، انا فَطرتُھا تب میں اس کو سمجھا۔

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:

ماسمعت السکین الا فی قول تعالیٰ (یوسف۔31) ما کنا نقول الا المدیۃ میں نے سکین (چھری) کا لفظ پہلی بار قرآن کی آیت سے جانا اس سے پہلے ہم اس کو مدیہّ کہا کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ایسے تھے جن کے مختلف لہجے عرب میں عرب قبائل میں رائج تھے۔ قرآن نے ان میں سے فصیح تر لفظ کا انتخاب کر کے اس کو اپنے ادب میں استعمال کیا۔ مثلاً قریش کے یہاں جس مفہوم کے لیے اعطیٰ کا لفظ تھا۔ اس کے لیے حمیرین کے یہاں انطی بولا جاتا تھا۔ قرآن نے انطیٰ کو چھوڑ کر اعطیٰ کا انتخاب کیا۔ اسی طرح شناتر کی جگہ اصابع کتع کی جگہ ذئب وغیرہ۔ قرآن اصلاً قریش کی زبان میں اترا ہے۔ مگر بعض مقامات پر قریش کی زبان کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر **لایلتکم من اعمالکم** بنی عبس کی زبان ہے۔ (الاتقان)

اس طرح قرآن نے الفاظ اور اسالیب کو نئی وسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ قائم کر دیا۔ یہ نمونہ اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد کوئی ادیب اس سے برتر معیار پیش نہ کر سکا اس لیے عربی زبان ہمیشہ کے لیے قرآن کی زبان ہو کر رہ گئی۔

عربوں میں جو امثال اور تعبیرات قدیم زمانہ سے رائج تھیں، ان کو قرآن نے زیادہ بہتر پیرایہ میں ادا کیا۔ مثلا زندگی کی بے ثباتی کو قدیم عربی شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

کل ابن انثیٰ وان طالت سلامتہ   یوما علیٰ آلۃ حدباء محمول

ہر آدمی خواہ وہ کتنے ہی عرصہ تک صحیح وسالم رہے، ایک دن بہرحال وہ تابوت کے اوپر اٹھایا جائے گا۔ قرآن نے اس تصویر کو ان لفظوں میں ادا کیا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران۔185)

قدیم عرب میں قتل وغارت گری سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس صورت حال نے چند فقرے پیدا کئے تھے جو اس زمانہ میں فصاحت کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا کا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے حسب ذیل مختلف الفاظ میں موزوں کیا تھا۔

قُتُلُ الْبَعْضِ اِحْيَآءٌ لِلْجَمْعِ   بعض لوگوں کا قتل سب کی زندگی ہے

اَكْثِرُوا الْقَتْلَ لِيُقَلِّلَ الْقَتْلُ   قتل کی زیادتی کرو تا کہ قتل کم ہو جائے

اَلْقَتْلُ اَنْفیٰ لِلْقَتْلَ۔   قتل کو سب سے زیادہ روکنے والی چیز قتل ہے۔

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (بقرۃ۔179)

قرآن سب سے پہلے عربی میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں شعر کو بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ شعر کے اسلوب میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا کمال سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس عام روش کو چھوڑ کر نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ ساتوں صدی کی دنیا میں صرف خدائے لم یزل ہی اس بات کو جان سکتا تھا کہ انسانیت کے نام ابدی کتاب بھیجنے کے لیے اسے نثر کا اسلوب اختیار کرنا چاہئے نہ کہ شعر کا، جو مستقبل میں غیر اہم ہو جانے والا ہے۔ اسی طرح پہلے کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ کہنا ادب کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا۔ پہلے جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، سائنس، نفسیات، اقتصادیات، سیاست، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ پہلے قصہ کہانی میں بات کہی

جاتی تھی۔قرآن نے براہ راست اسلوب کو اختیار کیا۔ پہلے قیاسی منطق کو ثبوت کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا،قرآن نے علمی استدلا کی حقیقت سے دنیا کو باخبر کیا ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ساری چیزیں قرآن میں اتنے بلند اسلوب کلام میں بیان ہوئیں کہ اس کے مثل کوئی کلام پیش کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔

قدیم عرب میں یہ مقولہ تھا کہ ان اعذاب الشعر اکذبہ سب سے زیادہ میٹھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو۔مگر قرآن نے ایک نیا طرز بیان (رحمٰن۔4) پیدا کیا جس میں فرضی مبالغوں کے بجائے واقعیت تھی۔اس نے حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کیا۔قرآن عربی زبان وادب کا حاکم بن گیا۔ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے،وہ سب قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے اوراس کو سمجھنے کے لیے جمع کیا گیا۔اسی طرح صرف ونحو،معانی وبیان،لغت وتفسیر،حدیث وفقہ،علم کلام،سب قرآن کے معانی ومطالب کو حل کرنے اوراس کے اوامر ونواہی کی شرح کرنے کے لیے وجود میں آئے۔حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ وجغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن کے احکام وہدایت کو سمجھنے اوران پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی۔قرآن کے سوا تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں کہ کسی ایک کتاب نے کسی قوم کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہو۔

قرآن نے عربی زبان میں تصرف کر کے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا،وہ اتنا ممتاز اور بدیہی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کر کے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔قرآن کا الٰہی ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم مثال کے لیے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

”13رجون 1932 کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی۔ انھوں نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔انھوں نے کہا، میں امریکی مستشرق فنتکل کے ساتھ تھا۔ میرے اوران کے درمیان ادبی رشتہ سے گہرے تعلقات تھے۔ایک دن انھوں نے

میرے کان میں چپکے سے کہا ''کیا تم بھی انھیں لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عقیدہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جارہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کا کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کر سکتے ہیں۔ تجربہ کر کے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ویسا کلام تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے استاد فتکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں۔ وہ تصور یہ کہ ''جہنم بہت وسیع ہے۔'' انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر ''تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جملے یہ تھے۔

ان جهنم واسعة جدا

ان جهنم لاوسع مما تظنون

ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان

ان جهنم لتسع الدنيا كلها

ان الجن والانس اذا دخلو جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم

كل وصف فى سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئى من حقيقتها

ان سعة جهم لتصغر اما مها سعة السماوات والارض

كل ما خطر ببالك فى سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع

سترون من سعة جهنم مالم تكونو التحملوبه او تتصوروه

مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصور لن تصل الى شىء من حقيقتها

ان البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز واشد العجز عن وصف سعة جهنم

ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين

متی امسکت بالقلم وتصدیت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك
ان سعة جهنم لا یصفها وصف ولا یتخیلها وهم ولا تدور بحسبان
كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذیان

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کر چکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لیے الفاظ نہ رہے تو میں نے پروفیسر فتکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا" اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی۔" میں نے کہا۔" جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کر کے اس مفہوم کے لیے اپنی عبارتیں تیار کر چکے ہیں۔ پروفیسر فتکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا، قرآن میں کیا ہے۔ میں نے سورۂ ق کی یہ آیت پڑھی: يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (سورۂ ق آیت 30) یہ سن کر ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران رہ گئے، انھوں نے کہا:

صدقت نعم صدقت وانا اقر لك ذلك مغتبطا من كل قلبی
آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں۔

میں نے کہا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کرلیا۔ کیوں کہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو پورا پورا اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ لٹریچر کے مطالعہ میں اس نے اپنی عمر صرف کر دی تھی۔"

الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر 1351ھ، جزء 32، صفحات 12-111

Xavier Leon .Dufour S.J. The Gospels and the jesus of History
Desclee Co.Inc.New York 1970 ,pp 79.80

ختم نبوت: انسانیت پر عظیم احسان

بعثت کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ کسی عرب قبیلہ کا ایک شخص کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آیا۔ وہ جب واپس گیا تو اس کے قبیلہ والوں نے پوچھا، مکہ کی کوئی خبر بتاؤ۔ اس نے جواب دیا:

محمد تنبأ وتبعه ابن ابی قحافة

محمدؐ نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور ابوقحافہ کا لڑکا ان کا ساتھ دے رہا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 610 ء میں جب آپؐ نے نبوت کا اعلان فرمایا، اس وقت لوگوں کے ذہن میں آپ کی تصویر کیا تھی۔ آپؐ کے مخالفین اس زمانہ میں آپ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔ کوئی زیادہ شریف زبان بولنا چاہتا تو کہتا: فتی من قریش، یعنی قبیلہ قریش کا ایک جوان۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال اپنے زمانہ میں تھا۔ مگر صدیاں گزرنے کے بعد اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیوں کہ اب آپ کی نبوت کوئی نزاعی مسئلہ نہیں۔ اب وہ ایک تسلیم شدہ واقعہ (Established Fact) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آج جب ایک شخص کہتا ہے ''محمد رسول اللہ'' تو اس کے ذہن میں ایک ایسے پیغمبر کا تصور ہوتا ہے جس کے گرد ایک عظیم الشان تاریخ بن چکی ہے، جس کی پشت پر ڈیڑھ ہزار برس کی تصدیقی عظمتیں قائم ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ یہ تاریخ مکمل طور پر آپؐ سے الگ کر دی جائے اور نبی عربی دوبارہ ''ابن ابی کبشہ'' کی صورت میں ظاہر ہوں تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آپؐ پر ایمان لانے والوں کی تعداد جو آج کروڑوں میں گنی جاتی ہے، صرف درجنوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی ـــــــ ''ابن ابی کبشہ'' کے حلیہ میں رسول خدا کو پہچان لینا انتہائی مشکل کام ہے۔ جب کہ یہی کام اس وقت انتہائی آسان ہو جاتا ہے جب رسول ایک مسلّمہ تاریخی حیثیت یا قرآن کے لفظوں میں مقامِ محمود (اسراء۔79) کا درجہ حاصل کر چکا ہو۔

پچھلے ادوار میں نبیوں کے ہم زمانہ لوگوں کے لیے نبی کا انکار کرنے کی سب سے بڑی

نفسیاتی وجہ یہی تھی ـــــ ''یہ تو وہی معمولی شخص ہے جس کو اب تک ہم فلاں بن فلاں کے نام سے جانتے تھے، وہ اچانک خدا کا پیغمبر کیسے ہوگیا۔'' جب بھی کوئی نبی اٹھتا، یہ خیال ایک قسم کا شک اور تردد بن کر ان کے اوپر چھا جاتا، اور نبی کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے معاملہ کو اس کے معاصرین کے لیے مشکل بنا دیتا۔

یہ صورت حال، خاتم النبین کے ظہور سے پہلے، انسانیت کو مسلسل ایک کڑی آزمائش میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔ ہر بار ان کے اندر سے ایک نیا شخص خدا کے رسول کی حیثیت سے اٹھتا۔ مخاطب قوم کی اکثریت مذکورہ نفسیاتی رکاوٹ کی وجہ سے، اپنے ہم عصر نبی کے بارے میں شک اور تردد میں پڑ کر انکار کر دیتی اور بالآخر سنت اللہ کے مطابق ہلاک کر دی جاتی۔

اب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسا نبی بھیجے جو ساری دنیا کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اس کی ذات پچھلے پیغمبروں کی طرح لوگوں کو اس آزمائش میں نہ ڈالے کہ ''معلوم نہیں یہ واقعی پیغمبر ہے یا شخصی حوصلہ مندی نے اس کو اس قسم کے دعوے پر آمادہ کر دیا ہے۔'' اس کی نبوت ہر دور کے لوگوں کے لیے ایک مسلّمہ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ لوگ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی ''محمودیت'' کی وجہ سے اس کو پہچان لیں اور اس پر ایمان لا کر خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنیں۔

متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے افراد تمام دوسرے انبیاء کی امتوں سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا تعلق بھی اسی مسئلہ سے ہے۔ آپؐ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لیے آپؐ کی امت میں آپؐ کے بعد دوبارہ کفر و اسلام کا مسئلہ کھڑا ہونے والا نہیں ہے۔ آپؐ کی امت بدستور بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

اس معاملہ کو بنی اسرائیل کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں جو یہود تھے، وہ سب خدا کی شریعت پر ایمان رکھتے تھے، وہ حضرت موسیٰؑ کے امتی تھے۔ مگر ابن مریم کی صورت میں جب ان کے اندر ایک نیا نبی اٹھا تو اس کو ماننا یہود کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ حضرت موسیٰ کو وہ اب بھی مانتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی کا انکار کر رہے تھے۔ اس

کی وجہ سے، ایک درجن مومنینِ مسیح کو چھوڑ کر سارے کے سارے یہودی کافر قرار پا گئے۔
حضرت مسیح کے چھ سو برس بعد جب نبی عربی کی بعثت ہوئی تو مسلمانوں کی اس نئی جماعت (عیسائیوں) کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ مگر دوبارہ وہی ہوا کہ نئے ''اسماعیلی نبی'' کو ماننے کے لیے وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکے۔ وہ تاریخی نبی (حضرت مسیحؑ) پر بدستور ایمان رکھتے تھے۔ مگر اپنے ہم عصر نبی (حضرت محمدؐ) کے منکر تھے۔ اس کی وجہ سے دوبارہ ایسا ہوا کہ نبوت محمدی پر ایمان لانے والے چند عیسائیوں کو چھوڑ کر پوری عیسائی قوم کو کافر قرار دے دیا گیا۔

ختم نوبت کی وجہ سے امت محمدی میں اس قسم کی چھٹنی، کم از کم موجودہ دنیا میں، دوبارہ ہونے والی نہیں۔ اس لیے آپؐ کے امتیوں کی تعداد بھی دوسرے انبیاء کے پیرووں سے زیادہ رہے گی ـــــ یہ بھی ایک پہلو ہے آپؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا جو اس لیے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مقام محمود پر کھڑا کیا۔ مقام محمود نبوی اعتبار سے یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت کو ساری دنیا کے لیے ایک تاریخی مسلّمہ بنا دیا گیا۔ یہی تعریفی حیثیت قیامت کے دن خصوصی خداوندی اعزاز کی صورت میں ظاہر ہوگی جو اولین و آخرین میں آپؐ کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوگی۔

مگر کسی نبی کو مقام محمود پر کھڑا کرنا سادہ طور پر محض نامزدگی کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ایک طرف ایسی معیاری شخصیت درکار تھی جیسی کوئی دوسری شخصیت بنی آدم میں پیدا نہ ہوئی ہو دوسری طرف ایسی قربانی اور حوالگی درکار تھی جیسی قربانی و حوالگی کا ثبوت کسی دوسرے انسان نے نہ دیا ہو۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا جب کہ خدا نے اپنے ایک بندے کو پکار کر کہا: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ⑦ (سورہ المدثر) اور کمبل میں لپٹی ہوئی اس عظیم روح نے لبیک کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن خدائی منصوبہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد طویل عمل کے نتیجہ میں بالآخر وہ نبوت ظہور میں آئی جو سارے عالم کے لیے رحمت بن گئی۔ جس نے انسانی تاریخ میں بار بار نئے نبیوں کی آمد کے آزمائشی دور کو ختم کیا اور ایک مسلّمہ نبوت کے دور کا آغاز کر کے لوگوں کے لیے خدا کی

رحمتوں میں فوج درفوج داخل ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

نبوت کو تاریخی مسلّمہ بنانے کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آئندہ کے لیے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند ہوجائے۔ مگر یہ بھی محض اعلان کا معاملہ نہ تھا۔ ختم نبوت سے پہلے ضروری تھا کہ چند شرائط لازمی طور پر پوری ہوچکی ہوں:

1۔ زندگی کے تمام معاملات کے لیے احکام خداوندی کا نزول (وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا)

2۔ انسانی کردار کے لیے ایک کامل نمونہ سامنے آجانا (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ)

3۔ وحی الٰہی کی دائمی حفاظت کا انتظام (نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ ان تینوں شرائط کی تکمیل کا انتظام فرما دیا۔

پچھلے نبیوں کے لیے اللہ کی سنّت یہ رہی ہے کہ ہر نبی کو کچھ آیات (معجزے) دیئے جاتے تھے۔ نبی اپنی مخاطب قوم میں تبلیغ ودعوت کا فریضہ آخری حد تک ادا کرتا۔ وہ غیر معمولی نشانیوں کے ذریعہ اپنے نمائندہ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرتا۔ اس کے باوجود جب لوگ ایمان نہ لاتے تو نبی کا کام ختم ہوجاتا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فرشتے متحرک ہوتے اور زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ اس قوم کو ہلاک کردیتے۔

نبی آخرالزماں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپؐ کی مخاطب قوم کے لیے اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا۔ بلکہ خود نبی اور آپؐ کے اصحاب کو اُن سے ٹکرا کر انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ دین خداوندی کو قبول کریں (تقاتلونهم اویسلمون) اس کے باوجود ان میں سے جو لوگ اطاعت نہ کریں وہ اہل ایمان کی تلواروں سے قتل کردیئے جائیں (قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس سے پہلے جو کام فرشتے کرتے تھے، اس کو انسانوں کے ذریعہ انجام دیا جائے۔

اسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا کہ ہجرت اور اتمام حجت کے بعد، دیگر انبیاء کی قوموں کے برعکس، اہل عرب پر کوئی جوالامکھی پہاڑ نہیں پھٹا اور نہ آسمان سے آگ برسی۔ بلکہ رسول اور

اصحاب رسول کو ان کے ساتھ ٹکرا دیا گیا۔اس فوجی تصادم میں اللہ کی خصوصی نصرت کے ذریعہ رسول اور آپؐ کے اصحاب کو فتح حاصل ہوئی۔خدا کا دین ایک باقاعدہ اسٹیٹ کی شکل میں جزیرہ نمائے عرب پر قائم ہو گیا۔

اس واقعہ کے مختلف نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ دعوت نبوت کو، انفرادی تقاضوں سے لے کر اجتماعی معاملات تک، زندگی کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے مسلسل احکام اترتے رہے۔ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو اسلامی شریعت میں ہر قسم کے احکام نہیں اتر سکتے تھے۔کیونکہ اللہ کہ یہ سنت ہے کہ وہ حالات کے لحاظ سے اپنے احکام بھیجتا ہے۔ایسا نہیں ہوتا کہ کتابی مجموعہ کی شکل میں بیک وقت سارے احکام لکھ کر نبی کو دے دیئے جائیں۔فرشتوں کے ذریعے منکرین عرب کا استیصال کرنے کے بجائے اہل ایمان کی تلوار کے ذریعہ ان کو زیر کرنے کے فیصلے نے شریعت کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیئے۔

پھر اسی وجہ سے یہ امکان پیدا ہوا کہ پیغمبر کا سابقہ زندگی کی تمام صورتوں سے پیش آئے۔ اور ہر قسم کی سرگرمیوں میں وہ اسلامی کردار کا عملی نمونہ دکھا سکے۔اس کے بعد خود حالات کے ارتقاء کے تحت ایسا ہوا کہ نبی کو مسجد اور مکان سے لے کر میدان جنگ اور تخت حکومت تک ہر جگہ کھڑا ہونا پڑا اور ہر جگہ اس نے معیاری انسانی کردار کا مظاہرہ کر کے قیامت تک کے لوگوں کے لیے نمونہ قائم کر دیا۔

پھر اسی واقعہ نے قرآن کی حفاظت کی صورتیں بھی پیدا کیں۔پچھلی آسمانی کتابیں جو محفوظ نہ رہ سکیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کے بعد ان کتابوں کی پشت پر کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو بزور ان کو ضائع ہونے سے بچاتی۔پیغمبرؐ اسلام اور آپؐ کے اصحاب نے اپنی ہم عصر قوموں سے مقابلہ کر کے اولاً عرب اور اس کے بعد قدیم دنیا کے بڑے حصہ پر اسلام کا غلبہ قائم کر دیا۔اس طرح کتاب الٰہی کو حکومتی اقتدار کا سایہ حاصل ہو گیا جو خدا کی کتاب کو محفوظ رکھنے کی یقینی ضمانت تھا۔یہ انتظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک ہزار برس تک اس میں کوئی فرق نہ آسکا۔ اسلامی اقتدار کے زیر سایہ قرآن ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ صنعتی

انقلاب ہوااور پریس کا دور آ گیا جس کے بعد قرآن کے ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ سب جو ہوا، اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے نہیں ہو گیا جیسے آج ہم اس کو سیرت وتاریخ کی کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں، اس کے لیے نبی اور آپؐ کے ساتھیوں کو نا قابل برداشت طوفان سے گزرنا پڑا______ کفار کے مطالبہ اور نبی کی خواہش کے باوجود ان کو فوق الفطری معجزے نہیں دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے اخلاق وکردار کو معجزاتی واقعات کا بدل بنانا پڑا۔ ان کے مکذبین کے لیے کوئی ارضی وسماوی عذاب نہیں آیا۔ اس طرح انھیں وہ کام کرنا پڑا۔ جس کے لیے پہلے بھونچال آتے تھے اور آتش فشاں پھٹتے تھے۔ ختم نبوت کے فیصلہ کے باوجود کتاب الٰہی کو یکبارگی ان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان کے واسطے ضروری ہو گیا کہ وہ زندگی کے وسیع سمندروں میں کودیں اور ہر قسم کی چٹانوں سے ٹکرائیں تاکہ تمام معاملات زندگی کے بارے میں ان پر احکام الٰہی کا نزول ہو سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس پورے عمل کے دوران نبیؐ اور آپؐ کے اصحاب امتحان کے اس انتہائی کڑے معیار پر تھے جس کو قرآن میں زلزال شدید (احزاب۔ 11) کہا گیا ہے۔ نبیؐ کو سخت ترین حکم تھا کہ ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی مت دکھاؤ (اسراء۔ 75) ورنہ تم کو دگنی سزادی جائے گی۔ حالات خواہ کتنے ہی شدید ہوں، آپؐ کے ساتھیوں کے لیے کسی بھی حال میں تخلف (توبہ۔ 119) کی اجازت نہ تھی۔ آپ کی ازواج اگر دو وقت کی روٹی کا بھی مطالبہ کریں تو ان کے لیے یہ صاف جواب تھا کہ ۔۔۔۔ پیغمبر کی صحبت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرلو۔ (احزاب۔ 28)

حقیقت یہ ہے کہ نبوتِ محمدی کا بروئے کار لانا انسانی تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اور یہ سب کچھ اتنی قیامت خیز سطح پر ہوا کہ خود رسول کی زبان سے نکلا کہ "اس راہ میں مجھ کو اتنا ستا یا گیا جتنا کسی دوسرے نبی کو نہیں ستایا گیا۔" آپ کی رفیقۂ حیات نے شہادت دی کہ لوگوں نے آپؐ کو روند ڈالا تھا (۔۔۔ **حطمه الناس**) خاتم النبین اور آپؐ کے ساتھیوں نے دنیا کا آرام تو درکنار زندگی کی ناگزیر ضرورتوں سے بھی اپنے کو محروم کرلیا، اس کے بعد ہی یہ

ممکن ہوسکا کہ تاریخ میں اس نبوت کا دور شروع ہو جس کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔

نبیؐ عربی کا آپؐ کے بعد آنے والی نسلوں پر یہی وہ احسان عظم ہے جس کی وجہ سے دائمی طور پر آپؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس مشکل ترین مشن میں چونکہ آپؐ کے اہل خاندان نے آپؐ کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور آپؐ کے اصحاب اس صبر آزما جدوجہد میں پوری طرح صادق القول اور صابر العمل ثابت ہوئے، اس لیے رسولؐ کے ساتھ آپؐ کے آل اور آپؐ کے اصحاب کے لیے بھی رحمت اور سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے ۔ درود وسلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعا کی شکل میں اعتراف ہے۔ حدیث میں ہے: البخیلُ مَن ذُکرتُ عندَہ فلم یُصلِّ عَلَیَّ (نسائی، ترمذی)

اللّٰھُمَّ صَلّ علیٰ سَیّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔ ''خدا تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔'' پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں یہ خداوندی اطلاع مکی دور کے آخر سال نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ آپؐ کی مظلومیت اور بے سروسامانی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ حتیٰ کہ آپؐ کے مخالفین آپ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگے تھے۔ آپؐ کو محمدؐ (تعریف کیا ہوا) کے بجائے مذمم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔

اس وقت خبر دی گئی کہ مخالین اسلام اپنے وقتی اقتدار سے خوش نہ ہوں۔ محمدؐ بن عبداللہ کا معاملہ کوئی انسانی معاملہ نہیں۔ یہ تمام تر خدائی معاملہ ہے۔ خدا بہرحال اپنے منصوبہ کو پورا کر کے رہے گا، خواہ منکرین اس کے خلاف کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ نبیؐ عربی کے ساتھ یہ نہیں ہونا ہے کہ وہ گُم نامی کے ساتھ اس دنیا سے چلے جائیں، جیسا کہ اکثر نبیوں کے ساتھ ہوا۔ خدا اپنے نبیؐ کو مکہ سے نکال کر یثرب لے جائے گا اور وہاں اس کے لیے مرکز فراہم کرے گا۔ اس کو اقتدار عطا فرمائے گا جس کے ذریعہ سے وہ

باطل کوشکست دے گا۔مخصوص خدائی مصالح کے تحت ان کو اس حد تک کامیاب بنانا ہے کہ وہ محمود خلائق ہو جائیں۔ان کو مذمم کہنے والے بہت جلد اپنی زندگی ہی میں ان کو حقیقی معنوں میں محمد اور محمود بنتے ہوئے دیکھیں گے ـــــــ نبی عربی کے بارے میں خدا کا یہ منصوبہ مکمل طور پر پورا ہوا۔حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ دین خداوندی کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ وجود میں لاسکیں۔

خدا کے رسول جس طرح دنیا میں لوگوں کے درمیان محمود و ممدوح قرار پائے، اسی طرح میدان حشر میں بھی وہ لوگوں کے درمیان مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ محمودیت کے اس آخری اور کامل اظہار کا نام مقام شفاعت ہے۔ دنیا میں آپؐ کے ذریعہ انسانیت کو ایک عظیم امتحان سے نجات ملی۔آخرت میں بھی اللہ آپؐ کے وسیلہ سے لوگوں کو حشر کی ہولناک آزمائش سے نکالے گا اور بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز ہوگا جو اولین و آخرین میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

اسلامی انقلاب: تاریخ انسانی کے لیے نیا موڑ

خدائی پیغام رسانی کا کام، انسانیت کے آغاز سے لے کر ساتویں صدی عیسوی تک ،پیغمبروں کے ذریعہ ہوا ہے۔ نبوت کی سطح پر اس کام کی انجام دہی کا یہ فائدہ تھا کہ اس کو معجزاتی تائید کی قوت حاصل رہتی تھی۔ نبی جب اپنی مدعو قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا تو اس کے ساتھ وہ ایسے معجزات پیش کرنے پر قادر ہوتا جو اس کی دعوت کی صداقت پر غیر معمولی برہان بن سکیں۔

ختم نبوت کے بعد یہ صورت حال ہوگئی کہ دعوت کی ذمہ داری تو بدستور اپنی پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ مگر دعوت کے حق میں معجزاتی تائید کا وعدہ باقی نہیں رہا۔ ایک حکومت جب کسی کو فارسٹ افسر مقرر کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کو ضروری اسلحہ بھی دیتی ہے تاکہ جنگل میں درندوں کے متوقع حملہ کے وقت وہ اپنا دفاع کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ وہ ہستی جو ساری رحمتوں کا خزانہ ہے وہ اس پہلو کو بھول جائے ، وہ ہم کو ذمہ داری سونپ دے مگر ہماری ضرورتوں کا انتظام نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعد کو آنے والے داعیوں کے لیے اللہ نے ایسا انتظام کیا جو پچھلے تمام انتظمات سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ اللہ نے اس مقصد کے لیے خود انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا تاکہ دعوتی مشن کے حق میں وہ تائید ہم کو معمولی حالات میں مل جائے جس کو پچھلے لوگ صرف غیر معمولی حالات میں پانے کی توقع کر سکتے تھے، اگرچہ موجودہ دور میں ہم اس راز کو سمجھ نہ سکے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔

قرآن میں شرک کو ظلم عظیم (13-13) کہا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل توحید کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ وہی کُل صداقت ہے (10-32) قدیم ترین زمانہ سے انسانی زندگی کا نظام شرک کی بنیاد پر قائم چلا آرہا تھا۔ تمام پیغمبر جو خدا کی طرف سے آئے ، وہ اسی لیے آئے کہ انسان کو شرک کی برائیوں سے آگاہ کریں اور توحید کی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کریں تاکہ انسان کے اوپر دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کا دروازہ کھل سکے۔ مگر قوموں نے پیغمبروں کی بات چلنے نہ دی۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پیغمبر ہیں جن کو خدا کی خصوصی نصرت کے تحت

یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ انھوں نے شرک کو مقام اقتدار سے ہٹادیا اور توحید کی بنیاد پر ایک مکمل انقلاب پیدا کردیا (وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ) یہ انقلاب جو ساتویں صدی عیسوی میں ظہور میں آیا، اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس نے تاریخ انسانی میں پہلی بار مظاہر کائنات کے تقدس کو ختم کردیا اور انسانیت کے لیے اُس مادی نعمت کے ظہور کی راہ ہموار کی جس کو جدید سائنس کہا جاتا ہے۔

تہذیب جدید کے مورخین کے سامنے ایک سوال یہ رہا ہے کہ فطرت کے خزانے اول دن سے زمین کے اوپر موجود تھے۔ انسان کے اندر ضروری ذہنی صلاحیت بھی قدیم ترین زمانہ سے پائی جاتی رہی ہے۔ پھر اس خزانہ کو انسانی تمدن کے لیے استعمال کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی۔ انسان لاکھوں برس سے زمین کیا اوپر آباد ہے۔ مگر زمین کے قدرتی خزانوں کو موجودہ شکل میں استعمال کرنے کی تاریخ صرف چند سو برس پیچھے تک جاتی ہے۔ مورخ آرنلڈ ٹائن بی (1975-1889) نے بجا طور پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قدیم زمانہ کا انسان زمین کو دیوتا سمجھتا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لیے خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ان کو دیکھتا تو ان کے بارے میں اس کے اندر تقدس اور پرستش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اس نفسیاتی فضا میں زمینی ذرائع کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنے کا جذبہ نہیں ابھر سکتا تھا۔ ٹائن بی کے الفاظ میں یہ توحید (Monotheism) کا عقیدہ ہے جس نے کائنات کے تقدس کو ختم کیا اور ہر چیز کو ایک خدا کی مخلوق بتایا۔ اس طرح وہ نفسیاتی فضا پیدا ہوئی جس میں انسان اپنے سیارہ کو دیوتا سمجھنے کے بجائے اپنا خادم سمجھے اور اس پر تصرف کا عمل کر سکے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مارچ 1974)

کائنات کو تسخیر و تدبر کا موضوع سمجھنے کا ذہن اولاً اسلام کے اثر سے عربوں میں پیدا ہوا۔ اس فکری انقلاب کا ایک دھارا وہ تھا جس کا مرکز سسلی اور اسپین بنا۔ ان ملکوں میں، غلبۂ توحید کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر، سائنسی کھوج اور زمینی خزانوں کو استعمال کرنے کا ذہن اُبھرا اور بالآخر ایک عظیم الشان تہذیب وجود میں آ گئی۔ یہی عرب تہذیب تیرھویں صدی سے اٹلی کے راستہ یورپ پہنچنا شروع ہوئی اور بڑھتے بڑھتے بالآخر سترھویں اور اٹھارویں

صدی کے انقلاب کا سبب بنی۔ جدید مورخین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب اول (First Cause) نبی عربی کے پیروؤں کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے اسپین کی حکومت (1492-711) کے زمانہ میں دکھائے۔

بریفالٹ (Briffault) نے لکھا ہے ''اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثرات موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یعنی سائنس اور سائنسی طرزِ فکر۔'' اس کے بعد اس کے الفاظ یہ ہیں:

It is highly probable that but for the Arabs.modern induatrial civilization would never have arisen at all

The Making of Humanity . p.202

انتہائی اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر جدید صنعتی تہذیب سرے سے وجود ہی میں نہ آتی۔

کائناتی تقدس ختم ہونے کا یہی نتیجہ نہیں ہوا کہ عالم طبعی کے بارے میں انسان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ انسانی تعلقات کے تمام شعبے بھی اس سے انتہائی گہرائی کے ساتھ متاثر ہوئے۔ مشرکانہ نظام کے تحت جس طرح یہ ہوا تھا کہ طبعی دنیا میں جو چیز زیادہ روشن اور نمایاں نظر آئی اس کو خدا سمجھ لیا، اسی طرح انسانی عظمتوں کے بارے میں بھی فوق الفطری عقیدے قائم ہو گئے۔ بادشاہ دیوتاؤں کی اولاد قرار پائے۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ خدا کا خصوصی رشتہ فرض کر لیا گیا۔ جس انسان کے اندر کوئی بڑائی نظر آئی اس کے متعلق یقین کر لیا گیا کہ اس کو کوئی خاص آسمانی حیثیت حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

اسلامی انقلاب کے بعد جب شرک کا نظام ٹوٹا اور توحید کو غلبہ حاصل ہوا تو انسانی عظمتوں کو فوق الفطری معتقدات سے وابستہ کرنے کا ذہن بھی ختم ہو گیا۔ اب سارے انسان ایک خدائے برتر کی یکساں مخلوق قرار پائے۔ ایک انسان دوسرے انسان میں فرق کرنے کی وہ بنیاد باقی نہ رہی جس کی وجہ سے تاریخ کے نامعلوم زمانوں سے انسانیت اونچ نیچ میں

مبتلا چلی آرہی تھی۔ انسان اپنے حقیقی شرف سے محروم تھا۔پیغمبر اسلام نے توحید کی بنیا پر جو انقلاب برپا کیا، اس نے خدا کی برتری اوراس کے مقابلہ میں سارے انسانوں کی یکسانیت اس طرح ثابت کی کہ قدیم رویتی نظام بالکل ٹوٹ کررہ گیا۔انسانیت ایک نئے راستہ پر چل پڑی۔لوگوں کے عقائد بدل گئے ۔پیشوائی اورسرداری کا سابقہ نظام درہم برہم ہوگیا۔وہ شہنشاہتیں زمین بوس ہوگئیں جوفوق الفطری عظمتوں کا یقین دلاکر لوگوں کے اوپر حکومت کررہی تھیں۔اس طرح تاریخ میں پہلی باراس تبدیلی کا آغاز ہواجوساری دنیا میں ایک نئے انسانی دورکا آغاز بنا۔

روس (1778۔1778) نے اپنی کتاب اس مشہورفقرہ سے شروع کی ہے:

''انسان آزاد پیدا ہواتھا،مگر میں اس کوزنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں۔''

یہ فقرہ درحقیقت خلیفہ ثانی عمرفاروق (644۔581) کے اس فقرہ کی بازگشت ہے جوانھوں نے روسو سے گیارہ سو برس پہلے محض ایک خیالی نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ریاست کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے ماتحت افسر سے کہا تھا: متی تعبدتم الناس وقدولدتهم امهاتهم احرارا ۔تم نے کب سے لوگوں کواپنا غلام بنالیا۔ حالاں کہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا۔

تاریخ انسانی کوپیغمبرؐ اسلام کی اس دین کا اعتراف غیرمسلم محققین نے عام طور پرکیا ہے۔کلکتہ یونیورسٹی کے سابق استاد تاریخ ڈاکٹر پیرالال چوپڑہ (1978۔1905) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

Modern history attributes liberty, equality and fraternity to be the outcome of the French revolution ,but the first person to proclaim it was the founder of Islam fourteen centuries age .

Illustrated Weekly of India ,April 15. 1973

جدید تاریخ آزادی،مساوات اوراخوت کوفرانسیسی انقلاب کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔مگر پہلا شخص جس نے اس کا اعلان کیا وہ اسلام کے بانی تھے جو چودہ سوسال پہلے پیدا ہوئے۔

یہ واقعات جو عالم طبعی اور عالمِ انسانی میں پیش آئے۔ یہ دراصل توحید کے پیدا کردہ انقلاب کے دنیوی نتائج تھے۔ امریکہ سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: من اینڈ ہر گاڈس۔'' اس میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے ان نتائج کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

Its advert changed the course of human history (p.389)

اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا

پیغمبر آخر الزماں اور آپؐ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا، وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت پر مبنی ایک انقلاب تھا۔ مگر اس نے بہت سے دوررس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنھوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بن گیا تھا۔ اب دعوت حق کا وہ کام ایک سادہ اور آسان کام بن چکا ہے جس کے لیے اٹھنے والوں کو قدیم زمانہ میں فرعون کے اس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا تھا:

میں تمھارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ (شعراء۔49) اسی طرح اس انقلاب نے قدیم زمانہ کے اس فکری ڈھانچہ کو بدل دیا جس نے قیاسات اور توہمات کو علم کا درجہ دے رکھا تھا۔ کائنات میں چھپی ہوئی خدا کی تصدیقی نشانیاں لوگوں کے سامنے آگئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کا وہ کام جس کے لیے اس سے پہلے معجزاتی استدلال کی ضرورت ہوتی تھی، اب ممکن ہو گیا ہے کہ خود علم انسانی کے ذریعہ اس کو ثابت اور مدلّل کیا جا سکے۔

تاریخ کا رخ موڑنے کا یہ عمل جو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، موجودہ زمانہ میں وہ اپنی آخری انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ خدا کے دین کی خاطر کام کرنے والوں کے لیے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی ذرائع موجود ہیں۔ قانون اور سماجی انقلابات نے

اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت اسلام کا کام اس طرح کھلے میدان میں کیا جائے جہاں کوئی فرعون اور کوئی نمرود راستہ روکنے کے لیے موجود نہ ہو۔ حقائق کی دنیا جواب انسانی کے علم میں آئی ہے وہ نہ صرف تمام دوسرے ادیان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے بلکہ مثبت طور پر اس نے دین حق کی صداقت پر تمام دلائل جمع کر دئے ہیں۔

یہ ایک نہایت وسیع مضمون ہے۔ تاہم اس خاص پہلو سے یہاں ہم اس انقلاب کے بعض نتائج کا ذکر کریں گے۔

ا۔ سیاسی ادارہ کو فوق الفطری معتقدات سے جدا کرنا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار ہزار برس پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ صرف ایک خدا ہے جو نفع وضرر کا مالک ہے۔ ان باتوں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس لیے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا شدید ردعمل ظاہر کیا کہ آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔ آج بھی ہندستان میں شرک کا عقیدہ بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ یہاں دعوت ابراہیم کو لے کر اٹھیں تو نئی دہلی کے حکمراں آپ کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کریں گے۔

اس کی وجہ زمانی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ نمرود، قدیم زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر ان کے اوپر حکومت کر رہا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لیے اس کو حکمرانی کا فوق الفطری حق حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ اس کے برعکس ہندستان کے موجودہ حکمرانوں کے نزدیک اس قسم کے کسی عقیدہ کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں۔ انھوں نے عوامی ووٹوں ک بنیاد پر حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فوق الفطری عقیدہ کے بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں ان کو اپنے سنگھاسن کے لیے کوئی راست نظریاتی خطرہ نظر نہیں آتا، جب کہ نمرود کو اس قسم کے کسی عقیدہ کے پھیلنے میں

اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی نبی اٹھتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ پہلے ہی مرحلہ میں اقتدار وقت سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی اداروں کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید خالص کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعیٔ حق سے متصادم کر دیتی تھی۔ اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کا فوق الفطری اقتدار صرف خدا کے لیے ہے اور یہ اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب سیاسی حکمرانی صرف سیاسی حکمرانی تھی، وہ مسئلہ توحید سے کوئی براہ راست تعلق نہ رکھتی تھی۔

اسلام کی اس فکر کی بنیا پر عرب میں جو انقلاب آیا، وہ ایشیا اور افریقہ ہوتا ہوا بالآخر یورپ پہنچا۔ اٹھارویں صدی میں فرانس اور امریکہ کے جمہوری انقلابات اسی کی بازگشت تھے۔ اس کے بعد تبدیلی کا یہ عمل آخری طور پر مکمل ہو گیا۔ اب وہ وقت اپنی کامل صورت میں آ گیا کہ ایک داعی توحید کی دعوت لے کر اٹھے اور سیاسی اعتقادیات کی پیچیدگی میں الجھے بغیر بندگان خدا کو حق سے آگاہ کرتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص عوام میں یہ بات مشہور کر کے اپنا طبّی کاروبار چلا رہا ہو کہ وہ ایک جِن ڈاکٹر کا شاگرد ہے جو روزانہ رات کو آ کر اس کو فن طب کے رموز بتاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سیکھا جاتا ہے نہ کہ جناتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ طبیب ایسی تحریک کا سخت مخالف ہو جائے گا۔ جب کہ اس بستی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو اس تحریک سے کوئی عداوت نہ ہو گی۔

۲۔ اظہار رائے کی آزادی

دنیوی عظمتوں کو فوق الطبیعی سمجھنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ قدیم زمانہ میں عام افراد کو رائے

کی آزادی حاصل نہ تھی۔ایک شخص کی زبان قانون ہوتی تھی۔اسلام نے جب غیر اللہ کے لیے فوق الطبیعی عظمتوں کے تصور کو منہدم کیا تو ساری دنیا میں ایک نیا عمل شروع ہوگیا۔ اگرچہ انتہائی خلاف زمانہ تصور ہونے کی وجہ سے اس عمل کی تکمیل میں ایک ہزار برس لگ گئے۔تاہم وہ چیز جو قدیم زمانہ میں ایک مسلّمہ حقیقت سمجھی جاتی تھی آج وہ اتنی بے دلیل ہو چکی ہے کہ ساری دنیا میں کوئی اس کی وکالت کرنے والا نہیں۔

جاپان کی تاریخ اس سلسلے میں بڑی سبق آموز مثال پیش کرتی ہے۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی مذہب پرتگیزیوں کے ذریعہ جاپان میں داخل ہوا اور ملک میں پھیلنے لگا۔ یہ بادشاہت کا زمانہ تھا۔1612 میں ایک شاہی فرمان جاری ہوا جس کے مطابق عیسائیت اور اس کی تبلیغ کو جاپان میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ دو سو برس تک اس فرمان پر انتہائی بے رحمی کے ساتھ عمل ہوتا رہا۔یہاں تک کہ عیسائیت کو جاپان سے بالکل ختم کر دیا گیا۔

مگر اسی مدت میں ایک اور عمل جاری تھا۔اسلام نے تاریخ انسانی کو جو دھکا دیا تھا، وہ یورپ میں داخل ہو کر اٹھارویں صدی میں اپنی آخری سیاسی انتہا کو پہنچ گیا۔فرد کی آزادی اور اظہار رائے مسلّمہ انسانی حق قرار پائے۔یہ افکار جو اولاً فرانس میں مرتب ہوئے انھوں نے ساری دنیا پر اپنے اثرات ڈالنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ جاپان کو 1873 میں خلاف مسیحیت قانون کو منسوخ کرنا پڑا اور ہر ایک کے لیے اظہار رائے کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

اس زمانی تبدیلی نے دین کی دعوت وتبلغ کے تمام راستے کھول دیئے ہیں۔اب ساری دنیا میں دینِ خداوندی کا اعلان کیا جاسکتا ہے اور کہیں بھی داعی کی زبان وقلم پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں ہوگا۔تاہم اس امکان کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے وہی مسائل اسلام کی راہ میں کھڑے کر دیں جن کو خدا نے اسلام کی راہ سے ہٹا دیا تھا۔کوئی بھی انتظام، خواہ کتنا ہی اعلیٰ پیمانہ کا ہو، کسی کے لیے اس قسم کی نادانی کے امکان کو بند نہیں کرتا۔

۳۔مظاہر فطرت کوتسخیر وتدبر کا موضوع بنانا

کائناتی مظاہر پچھلے تمام معلوم زمانوں سے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ اسلام نے پہلی باراس کوتسخیر وتدبر کا موضوع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ جب تک آدمی ان کوخدا سمجھتا تھاوہ ان کے آگے جھکتا رہا۔ جب اس نے جانا کہ یہ سب مجبوراور مخلوق ہیں تو اس نے ان کو سمجھنے کے لیے تحقیق شروع کردی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم فطرت آدمی کے سامنے کھلنے لگے۔خدا نے اپنی تخلیقات میں جوتصدیقی نشانیاں رکھ دی تھیں وہ ایک ایک کرکے ظاہرہونا شروع ہوگئیں ۔یہاں تک کہ بیسویں صدی میں پہنچ کراب وہ وقت آگیا ہے جس کی پیشگی اطلاع قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی تھی: ہم ان کوآفاق وانفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پرواضح ہوجائے گا کہ یہ حق ہے۔'' یہ پیشین گوئی اتنے بڑے پیمانہ پرواقعہ بن چکی ہے کہ جو باتیں ماضی کے انسان کے لیے ایمان بالغیب کی حیثیت رکھتی تھیں،آج وہ اس کے لیے ایمان بالشہود کے درجہ پر پہنچ چکی ہیں۔

قدیم زمانہ کا انسان فطرت کوسادہ واقعات کا مجموعہ سمجھتا تھا،آج معلوم ہوا کہ وہ بے حد پیچیدہ اورانتہائی حکیمانہ اصولوں پرمبنی ہے۔اس کا نظام اتنی محکم بنیادوں پرچل رہا ہے کہ ایک عظیم کارساز کو مانے بغیراس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔قدیم فلاسفہ یہ کہتے تھے کہ خدا جیسے ایک ازلی وجود کو ماننے کے بجائے ہم کیوں نہ اسی کائنات کوازلی مان لیں۔مگر جدید تحقیقات (مثال کے طور پر بگ بینگ نظریہ) نے اس نقطۂ نظر کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ دنیا ایک وقت خاص میں پیدا کی گئی۔گویا اب ایک ازلی و ابدی خالق کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات کے اندر جومختلف طبیعی ، کیمیاوی اورحیاتیاتی مظاہر ہیں، ان کو بہت سی الگ الگ فطری طاقتیں کنٹرول کررہی ہیں۔ نیوٹن کے بعدان طاقتوں کی گنتی تین تک آگئی: تجاذب،مقناطیسیت اور نیوکلیر فورس۔ مگر حال میں ایٹم کے اندر جوجادوئی ذرہ(Charmed Particle)دریافت ہوا ہے،اس کے بعد تعدد کا نظریہ ختم ہوگیا۔اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک ہی متحدہ طاقت ہے جوفطرت کے تمام عملوں کی ذمہ دار ہے۔گویا شرک کے حق میں علمی بنیاد ختم ہوگئی اوراب توحید کے

سوا کوئی راستہ انسان کے لیے باقی نہیں رہا۔ : زندگی بعد موت جس کو پہلے نا قابل ثبوت سمجھا جاتا تھا، اب اس کا سائنسی ثبوت فراہم ہونے لگا ہے۔حتیٰ کہ غیر مذہبی علماء آج ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا ہے: زندگی کے بعد زندگی (Life after Life)

۴۔غیر علمی طرزفکر کا خاتمہ

پچھلے تمام زمانوں میں غیر علمی یا توہماتی طرزفکر دنیا کے اوپر چھایا ہوا تھا۔اس طرزِفکر کا خاصہ ہے کہ وہ کسی بات کی گہری جانچ کئے بغیر اس کو مان لیتا ہے۔قدیم زمانہ میں اس غیر علمی طرزِفکر نے لوگوں کو یہ موقع دے رکھا تھا کہ وہ آسانی سے اپنے لیے کوئی نہ کوئی ذہنی پناہ گاہ تلاش کرلیں جہاں وہ دین حق سے بھاگ کر چھپ سکیں۔فتح مکہ کے بعد جب کعبہ سے بتوں کو نکال کر توڑا جانے لگا تو اسلام کا یہ غلبہ دیکھ کر مکہ کے بت پرستوں کو فوراً توبہ کرلینی چاہئے تھی۔مگر انھوں نے یہ کیا کہ وہ بستی چھوڑ کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ان کا یقین تھا کہ اب ضرور مکہ پر کوئی آفت آئے گی اور مسلمانوں کے استیصال کا جو کام وہ خود نہ کرسکے وہ ان کے بت انجام دے دیں گے۔انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر بتوں کے اندر طاقت ہوتی تو وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہی کیوں ہونے دیتے۔

سائنسی انقلاب دراصل توہماتی طرزفکر کے بجائے واقعاتی غورفکر کا نام تھا۔کائنات کا نظام چونکہ انتہائی اٹل بنیادوں پر چل رہا ہے۔اس لیے فطری طور پر کائناتی علم کی ترقی نے تجزیاتی استدلال اور حقیقت پسندانہ تحقیق کا مزاج پیدا کیا۔قدیم زمانہ میں لوگوں کو اپنی توہم پرستی اور غیر علمی اندازفکر کی وجہ سے ایک غیر واقعی بات کو مان لینے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی تھی۔وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایک بے بنیاد عقیدہ کو اس طرح اپنے ذہن میں جگہ دے سکتے تھے گویا وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہے۔مگر آج کا انسان حقیقت واقعہ سے کم تر سطح پر کسی چیز کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔اس ذہنی فضا نے تاریخ میں پہلی بار تمام دروازے صرف دین حق کے لیے کھول دیئے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی دین نہیں جو واقعاتی تجربہ اور حقیقت پسندانہ جانچ کے معیار پر پورا اتر سکے۔

یہ نئی زمین جو اسلام کے حق میں تیار ہوئی ہے، مسلمان خود تو ابھی بہت کم اس سے فائدہ اٹھا سکے ہیں۔ البتہ اس سے پیدہ شدہ ثمرات ان کو ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی چیز ہے جس نے اسلام کے مطالعہ کے لیے قدیم طرز کے استشراق کا خاتمہ کر دیا۔ صلیبی لڑائیوں کے بعد مسیحی یورپ نے اسلام کی تاریخ اور اس کی تعلیمات کو بالقصد بگاڑنا شروع کیا۔ صدیوں تک یہ کام جاری رہا۔ یہاں تک کہ سارا مغربی لٹریچر اس سے بھر گیا۔ سائنس کے ظہور سے پہلے لوگوں کو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آتی تھی۔ مگر سائنس کے زور پر جو حقیقت پسندانہ طرزِ فکر پیدا ہوا، اس نے اس طرق مطالعہ کو بے معنی بنا دیا۔ قدیم استشراق کے خاتمہ کا یہ عمل ٹامس کارلائل (1881۔1798) کے زمانہ میں شروع ہوا اور اب بیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔

۵۔ افسانوی طرز فکر کے بجائے تاریخی طرز فکر

قدیم زمانہ میں روایت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگ ایک بے اصل افسانہ کو بھی اسی طرح مانتے تھے جس طرح ایک ثابت شدہ تاریخی واقعہ کو ماننا چاہئے۔ سائنسی اور علمی نقطۂ نظر نے جب حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کیا تو اس کے ساتھ فطری طور پر یہ ذہن بھی پیدا ہوا کہ انسانی واقعات کو مورخانہ انداز سے سمجھا جائے۔

تاریخی تحقیق کی یہ مہم مذہب تک بھی پہنچی اور وہ فن پیدا ہوا جس کو تنقید عالیہ (Higher Criticism) کہا جاتا ہے۔ اس شعبۂ تاریخ کے تحت جب مختلف مذاہب کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ دورِ قدیم کے سارے مذاہب تاریخی حیثیت سے غیر معتبر ہیں۔ اسلام کے بعد، تمام مذاہب میں، عیسائیت سب سے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے وجود کا کوئی تاریخی ریکارڈ آپ کی معاصر تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ آنجناب کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ وہ مختصر انجیلیں ہیں جن کا تاریخی استناد خود انتہائی طور پر مشتبہ ہے ______ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ پروفیسر ہٹی کے الفاظ میں وہ تاریخ کی پوری روشنی میں

(Within the full light of history) پیدا ہوا۔اس کی تمام چیزیں تاریخ کے معیار پر مکمل طور پر پوری اترتی ہیں۔ اسلام، پورے معنوں میں، ایک تاریخی واقعہ ہے نہ کہ غیر ثابت شدہ روایات کا مجموعہ۔

قدیم زمانہ میں تاریخی ثبوت کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی تھی ۔مگر آج کا انسان اُس چیز کو قابل غور بھی نہیں سمجھتا جو مورخانہ معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔اس صورت حال نے اسلام کو لوگوں کے لیے پُرکشش بنانے کا اتنا بڑا امیدان کھول دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔

٦۔آسمانی توجیہہ کی تلاش

خدا کو نہ ماننے والوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ زمینی واقعات کی توجیہہ خود زمین کے حالات میں تلاش کریں۔ مثلاً زندگی کو زمینی عناصر کے تعامل کا نتیجہ قرار دینا۔مگر جدید شواہد نے اس قسم کی باتوں کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔اب سائنس داں مجبور ہو رہے ہیں کہ وہ زمینی واقعات کے لیے آسمانی توجیہہ تلاش کریں۔مثلاً قدیم نظریہ ارتقاء کے بجائے اب پینس پرمیا(Panspermia) کا نام لیا جانے لگا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی زمین پر خود بخود پیدا نہیں ہوگئی بلکہ بالائی خلا سے ہمارے اس کرہ پر بالقصد بھیجی گئی ہے۔کہا جاتا ہے کہ بالائی خلا میں کسی مقام پر غالباً ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ''تہذیب'' موجود ہے جس نے زمین پر زندگی کے جراثیم بھیجے ہیں۔

مزید یہ کہ فلکیات کے وسیع تر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ''عالم بالا'' ہم سے غیر متعلق اور بے عقل و بے شعور عالم نہیں ہے۔ایسے قرائن معلوم ہوئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ خلا کے کسی مقام پر ہم سے زیادہ ہستیاں موجود ہیں۔ وہ اپنے اعلیٰ مواصلاتی ذرائع سے مسلسل ہماری زمین سے ربط رکھے ہوئے ہیں۔حال میں ایک نیا شعبہ مطالعہ وجود میں آیا ہے جس کو ریڈیائی فلکیات (Radio Astronomy) کہا جاتا ہے۔علم الافلاک کی اس نئی شاخ کا مقصد بالائی خلا میں سگنل بھیجنا اور اوپر سے آنے والی ریڈیائی لہروں کا مطالعہ کرنا ہے۔

سائنسی حیثیت سے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے بہت سے ادارے وجود میں آئے ہیں جو مختلف تدابیر کے ذریعے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ زمین کے علاوہ کسی دوسرے کائناتی مقام پر جواعلیٰ تر ذہنی ہستیاں پائی جاتی ہیں، ان سے ربط قائم کیا جائے۔ان کوششوں کاانجام خواہ جوبھی ہو، تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید انسان کے لیے خدائی الہام کاتصوراب ایسی مستبعد چیزنہیں رہاجس پر سوچنے کے لیے وہ تیارہی نہ ہوسکتا ہو۔

فطرت کی دریافت اورکائنات کی تسخیر نے موجودہ زمانہ میں عیش وعشرت کے بے شمار نئے دروازے کھول دیئے ۔انسان نے ایسا شاندارتمدن بنایا جومعلوم تاریخ کے مطابق اس زمین پرکبھی نہیں بنا تھااورآرام وراحت کے ایسے سامان فراہم کئے جو پہلے انسان نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

مگرترقیوں کی انتہا پرپہنچ کر بالآخرانسان کومعلوم ہوا کہ موجودہ دنیامیں وہ زندگی نہیں بن سکتی جوخوف وحزن اورلغواورتاثیم سے خالی ہو ____ ترقیات نے فطرت کے حسین توازن کوتوڑ دیا۔ بڑھاپا، بیماری اورموت پرقابو پانا ممکن نہ ہوسکا۔حکومتی نظام اورقانونی ضوابط انسان کونظم وضبط کے دائرہ میں رکھنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئے مشینی تہذیب کی کثافتوں نے خشکی وتری کوفساد سے بھر دیا۔مادی ساز وسامان آدمی کوخوشی اورسکون نہ دے سکے۔وغیرہ

اس تجربہ کے بعدساری دنیامیں ایک نئی حرکت شروع ہوئی ہے۔انسان مادیات سے اکتا کرغیرمادیات میں اپنی تسکین ڈھونڈ رہاہے۔خارجی دنیا سے واپس ہوکروہ اپنی اندرونی دنیامیں داخل ہونے کی کوشش کررہاہے اس کوشش نے مذہب اورنفسیات کےعلم کو بالکل نئی اہمیت دے دی ہے ۔آج کاانسان دوبارہ اس مقام پرواپس آ گیاہے جہاں اس کو خدا اورمذہب کی باتیں بتائی جائیں اوروہ ان کے بارے میں سنجیدگی کےساتھ غورکرے۔قدیم زمانہ میں تھوڑے سے ’’حنیف‘‘ تھے جوسچائی کی تلاش کررہے تھے۔آج دنیا کی دنیاسچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

یہ ذہنی زمین، بالواسطہ طور پر، اسلام ہی کی پیدا کردہ ہے۔مگرعجیب بات ہے کہ اس

صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں اسلام کے پیرو ہی سب سے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔

اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں دین حق کی تبلیغ واشاعت کا بالکل نیا میدان کھول دیا ہے۔ آج سیاسی جبر اور ذہنی رکاوٹ دونوں سے آزاد ہو کر خداوندی پیغام کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ ہم خود اپنی نادانی کی وجہ سے دوبارہ کسی نئے عنوان سے وقت کے حکمراں سے وہی ٹکراؤ شروع کر دیں جس سے خدا نے دعوت اسلامی کی تحریک کو محفوظ کر دیا تھا۔

۸۔ سائنٹفک اسلوب بیان

اس سلسلے میں ایک بات دعوت حق کے اسلوب سے تعلق ہے۔ قرآن میں دعوت حق کو جس زبان میں پیش کیا گیا ہے، وہ فطرت کی سادہ زبان ہے۔ ''افی اللہ شك فاطر السماوات والارض'' کی زبان سے قدیم زمانہ کا تعلیم یافتہ انسان زیادہ مانوس نہ تھا۔ وہ یا تو جادو اور طلسمات سے متاثر ہوتا یا خیالی فلسفوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم صوفیاء کو یوگ اور اشراق سے اس ذوق کے لیے تسکین فراہم کرنی پڑی اور متکلمین کو یونانی فلسفہ سے۔ قُصّاص کے گروہ نے اسی مقصد کے لیے بے شمار تعداد میں عجائب وغرائب قصے گھڑے اور ان کے ذریعہ اسلام کی ایک الف لیلہ تیار کر دی۔

مگر اب صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ اب سائنس کے انقلاب کے بعد، وہی زبان اور اسلوب وقت کا معیاری اسلوب قرار پا گیا ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں اختیار کیا گیا تھا۔ یہ ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ہے۔ اب ہمیں نہ تو بے معنی قسم کی روحانی ورزشوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ قصہ گوئی اور فلسفہ طرازی کا کمال دکھانے کی۔ اب قرآن کی دعوت کو اس کے سادہ فطری اسلوب ہی میں لوگوں کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ قرآن وحدیث کے سادہ ترجمے، سیرت رسول اور حالات صحابہ پر واقعاتی اسلوب میں لکھی ہوئی کتابیں اگر مختلف زبانوں میں مرتب کر کے دنیا بھر میں

پھیلا دی جائیں تو یہی اقوام عالم پر حجت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔

۹۔ وسائل کا خداداد خزانہ

آخری بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی اور پریس کی ایجاد نے دعوتی کام کی انجام دہی کے لیے لامتناہی امکانات کھول دیئے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کی آواز آنجناب کے زمانہ میں فلسطین کے ایک قصبہ سے باہر نہ جاسکی۔ مگر آج آپ کے پیرو بیک وقت دو ہزار سے بھی زیادہ زبانوں میں مسیحی مذہب کو منتقل کر رہے ہیں اور سارے عالم میں مسلسل اس کی آواز پہنچا رہے ہیں۔ کل اور آج کا فرق دراصل زمانہ کا فرق ہے۔ آج ایسے وسیع الاثر مواقع کھل گئے ہیں کہ زمین کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر ساری دنیا میں دعوت کے کام کو منظم کیا جاسکتا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی دریافت نے دعوت کے عمل کو مقامی پیغام رسائی کے دور سے نکال کر عالمی پیغام رسانی کے دور میں پہنچا دیا ہے۔

جدید صنعتی دور میں مسلمان اپنی اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ دعوت حق کی اشاعت کے لیے جدید امکانات کو اعلیٰ سطح پر استعمال کرسکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں میں پٹرول کے خزانے برآمد کر کے ان کی اقتصادی پس ماندگی کی تلافی کردی۔ اور انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائگی کی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی اس کو انتہائی کامل شکل میں جاری رکھ سکیں۔

ہمارے رب نے ہمارے لیے سیاسی اور فکری رکاوٹیں بھی دور کردی ہیں اور اقتصادی رکاوٹیں بھی۔ اس سہ طرفہ نصرت کے بعد بھی مسلمان اگر دعوتی کام کے لیے نہ اٹھیں تو انھیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، خواہ دعوت کی ذمہ داری کو چھوڑ کر وہ کوئی دوسرا کام کتنی ہی بڑی مقدار میں کیوں نہ انجام دے رہے ہوں۔

خاتمہ کلام

قدیم زمانہ میں شرک (غیر اللہ کی فوق الفطری کبریائی) کا عقیدہ غالب عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا جس طرح آج، مثال کے طور پر، انسانی آزادی کے تصور نے ساری دنیا میں غالب عقیدہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس صورت حال نے قدیم زمانہ میں بے شمار مصنوعی مسائل پیدا کر رکھے تھے جن میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے داعیوں کو آگ اور خون کے طوفان سے گزر کر حق کا پیغام دینا پڑتا تھا۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا، اس نے شرک کو غالب عقیدہ کے مقام سے ہٹا دیا اس کے بعد ایک نیا تاریخی عمل شروع ہوا۔ آغاز اسلام کے تقریباً ہزارویں سال اس انقلاب کے دو حصے ہو گئے اس کا مذہبی پہلو اسلامی دنیا میں محفوظ رہا، اور اس کا دنیوی پہلو، اس سے الگ ہو کر مغربی دنیا کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے مزید ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانے میں وہ اپنے آخری کمال تک پہنچ گیا۔ موجودہ زمانہ میں جمہوریت، آزادی رائے، سائنسی نقطۂ نظر، سب اسی کی مثالیں ہیں جو درحقیقت اسلامی انقلاب کے دنیوی پہلو یا اس کے سیکولر نتائج ہیں۔

اسلام کے زیر اثر پیدا شدہ اس انقلاب نے جدید دنیا میں اسلام کی توسیع واشاعت کے نئے دروازے کھول دیئے تھے۔ ایک طرف یہ ممکن ہو گیا تھا کہ توحید کی پیغام رسانی کے کام کو نہایت قوت کے ساتھ بالکل آزادانہ ماحول میں شروع کیا جا سکے۔ دوسری طرف پریس اور جدید ذرائع ابلاغ نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا تھا کہ اسلامی دعوت کی مہم کو عالمی سطح پر منظم کیا جا سکے۔ مگر عین اس وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں نے دعوت کے بجائے سیاست کا رُخ اختیار کر لیا۔ وقت کے حکمرانوں سے ٹکرا کر انھوں نے اپنے لیے نئے عنوان سے دوبارہ وہی مشکلات پیدا کر لیں جن کو اسلام کے ہزار سالہ عمل نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔

اسلام کی تاریخ میں کوئی واقعہ اتنا الم ناک نہیں جتنا الم ناک یہ واقعہ ہے کہ موجودہ

زمانہ میں اٹھنے والی تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے سیاسی مقابلہ آرائی کو کام سمجھا اور غیر ضروری طور پر اسلام کو اقتدار کے مدمقابل کھڑا کر دیا۔ کسی تحریک نے شروع ہی سے میدان سیاست میں چھلانگ لگا دی۔ کوئی بعد کو اس ''مقدس جہاد'' کی طرف مڑ گئی ـــــــ ٹھیک اس وقت جب کہ تاریخ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہنچ کر ہمارے لیے دعوتی کام کا عالی شان میدان کھول رہا تھا، ہم انتہائی نادانی کے ساتھ ایک ایسی سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے جس کا کوئی نتیجہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں تھا، نہ دینی نہ دنیوی۔ اب اس غلطی کی واحد تلافی یہ ہے کہ سیاست بازی کو مکمل طور پر ترک کر کے قرآن وسنت کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کا کام فوراً شروع کر دیا جائے۔

اپریل 1977 میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر 17/اپریل کی نشست میں یہ مقالہ ملخصاً بہ شکل تقریر پیش کیا گیا۔

باب پنجم

اسلام کی ابدیت

اسلامی ریاست ابتداءً مدینہ میں ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں قائم ہوئی۔اس وقت سے لے کر 19 ویں صدی کے اختتام تک شریعت اسلامی زمین کے بڑے حصہ پر بلا اختلاف جاری رہی۔ان تیرہ صدیوں میں اگر چہ سماجی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے،مگر کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ شریعت اسلامی مخصوص وقت کے لیے تھی، وہ ہر زمان ومکان کے لیے موزوں نہیں۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست،ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے اسلامی قانون کو جاری کیا۔خلافت راشدہ کے زمانہ میں شام،مصر،عراق،ایران،فلسطین کے متمدن علاقے اس کے تحت آ گئے۔مگر عمر فاورق اور علی مرتضیٰ کو نئے حالات پر اسلامی شریعت کو منطبق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔دور عباسی میں ایک طرف اسلامی سلطنت کا سیاسی رقبہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ آسمان پر بادل کا ٹکرا دیکھ کر ہارون رشید کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ امطری حیث شئت فسیأتینی خراجك (جہاں چاہے برس، تیرا خراج مجھ کو ہی پہنچے گا) دوسری طرف یونان،مصر،ہند چین کے علوم ازسرنو زندہ ہوئے اور اسلامی معاشرہ علم وفن کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ مگر قاضی ابو یوسف وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے زیادہ متمدن سلطنت کا نظام اسلامی شریعت کی بنیا پر چلانے میں پوری طرح کامیاب رہے۔اس کے بعد مغلوں اور ترکوں کا دور آیا اور ایشیا،افریقہ اور یورپ کے بڑے حصے اسلام کے ماتحت آ گئے۔مگر اول الذکر کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری اور موخر الذکر کے عہد میں المجلۃ العثمانیۃ کا ترتیب پانا بتاتا ہے کہ انھوں نے شریعت کو اپنے بڑھتے ہوئے قانونی مسائل کے لیے عاجز نہیں پایا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ بیسویں صدی ہی میں ہم یہ آواز سنتے ہیں کہ ''شریعت اسلامی ہر زمان ومکان کے لیے موزوں نہیں۔'' اس کی وجہ مستشرقین کا پروپیگنڈا نہیں،جیسا کہ بعض لوگ سادگی

سے سمجھتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ وہ عالمی فکری انقلاب ہے جو جدید سائنس کے زور پر پیدا ہوا ہے۔ ہر دور کا ایک رئیسی طرز فکر ہوتا ہے۔ اس کے تحت آدمی کے خیالات بنتے ہیں، اور ہر معاملہ میں اسی کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں۔ چند سو برس پہلے دنیا کا رئیسی طرز فکر مابعد الطبیعیاتی بنیادوں پر قائم تھا۔ پچھلے تمام معلوم زمانوں سے یہی طرز فکر چلا آ رہا تھا۔ اور اسی بنیاد پر رائیں قائم کی جاتی تھیں۔ سائنس نے تاریخ میں پہلی بار اس طرز فکر کو اس کے، مقام سے ہٹا دیا اور طبیعیاتی انداز فکر کو رئیسی حیثیت دے دی۔ مذہب اور جدید ذہن کے درمیان موجودہ زمانہ کے تمام مسائل درحقیقت اسی تبدیلیٔ فکر کا شاخسانہ ہیں۔

قدیم زمانہ میں فلسفہ کو علوم کی ملکہ (کوئن آف آرٹ) سمجھا جاتا تھا۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد فلسفہ نے اپنا یہ مقام کھو دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کے بیانات میں فنی اتقان (Technical Perfection) ہوتا ہے، جب کہ فلسفہ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ سائنس کی اس خصوصیت نے جدید دنیا میں اس کو تمام علوم پر غالب کر دیا۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ طرز فکر پیدا ہوا جس کو عام طور پر ایجابیت (پازیٹیوزم) کہا جاتا ہے۔ یعنی محسوس و مشہود واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ قدیم مابعد الطبیعیاتی طرز فکر کے لیے اس میں کوئی استبعاد نہ تھا کہ وہ روح کو آسمان سے نازل شدہ ایک غیر مرئی چیز سمجھے، اور اس مفروضہ کی بنیاد پر انسانی حرکات کی توجیہہ کرے۔ مگر جدید ذہن نے چاہا کہ، دوسرے امور کی طرح، وہ اس کو کمیاتی اصطلاحوں میں بیان کرے۔ اس نے کہا کہ روح، طبیعی اور کیمیاوی مادوں کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہونے والی ایک وقتی کیفیت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہوا میں دو شاخوں کی رگڑ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

غیر طبیعی واقعات کی توجیہہ طبیعی اصطلاحوں میں کرنے کا یہ ذہن مذہب تک بھی پہنچا۔ مذہب کے آسمانی رشتہ کا مشاہدہ سائنسی ذرائع سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ مذہب کے وہ خارجی ظاہرہ انسان کے مشاہدہ میں آ رہے تھے جو ہر دور میں انسانی سماج کے اندر مذہب کے نام سے پائے جاتے رہے ہیں۔ اس نے انھیں خارجی مظاہر کو مذہب کے سمجھنے کا مدار قرار دے دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب الٰہیات (تھیالوجی کے بجائے انسانیت

(اینتھر اپالوجی) کے مطالعہ کا موضوع بن گیا۔اب انسان سماج ، مذہب کو جاننے کا ماخذ تھا، جب کہ اس سے پہلے مذہب آسمان سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہ تھی ۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شریعت اسلامی کے موضوع پر ہونے والی موتمر ریاض (ذوقعدہ 1392) کو مورخین کی جماعت 'فرنیچر'' کی تاریخ کے خانہ میں ڈال دے اور آئندہ اس کا مطالعہ فرنیچر کے عنوان کے تحت کیا جانے لگے۔

آج جب ایک شخص کہتا ہے کہ ''مذہب وشریعت زمانی چیزیں ہیں'' تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ مذہب وشریعت سماجی عوامل کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ سماجی عوامل کے تحت پیدا ہونے والی چیزیں زمانی ہوتی ہیں۔لباس اور فرنیچر ہر زمانہ میں یکساں نہیں ہو سکتے ۔اس لیے مذہب وشریعت بھی قدرتی طور پر ایک زمانی ظاہرہ ہے۔اس کے برعکس اگر انسان مذہب کا مطالعہ اس نظر سے کرتا کہ اس کا مصدر وہی لازوال حقیقت اعلیٰ ہے جو نباتات کی روئیدگی، حیوانات کی پیدائش اور ستاروں کی گردش کو کنٹرول کر رہی ہے تو اس کو نظر آتا کہ مذہب ایک ابدی حقیقت ہے جس طرح طبیعیات اور حیاتیات کے قوانین ابدی ہیں۔مگر مذہب کو ''سماجی علوم'' کے مطالعہ کا موضوع بنانے کی وجہ سے سارا معاملہ الٹ گیا۔

تاریخ انسان کا یہ فکری موڑ جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وقوع میں آیا، اسلام کے لیے انتہائی فیصلہ کن تھا۔ضرورت تھی کہ مسلم قومیں اس سیلاب کے مقابلہ میں جوابی سیلاب بن کر اٹھیں اور تاریخ کے دھارے کو اسلام کے مطلوبہ رخ کی طرف موڑ دیں ۔مگر بدقسمتی سے ہمارے مصلحین معاملہ کی اصل نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔انھوں نے اس پورے معاملہ کو استعمار کا پیدا کردہ ایک سیاسی مسئلہ سمجھا اور دوسو برس کی انتہائی قیمتی مدت صرف سیاسی معرکہ آرائیوں میں ضائع کر دی گئی۔ دور جدید کو سمجھ کر اس کے حسب حال احیائے اسلام کی جدوجہد کی منصوبہ بندی ہم نہ کر سکے۔

یہ چیلنج جو موجودہ زمانہ میں اسلام کو پیش آیا، کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اسلام کے ابتدائی دور میں بھی اس کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا مقابلہ

جس دنیا سے ہوا، وہ شرک کی دنیا تھی۔ مختلف ملکوں اور قوموں میں خدا کے رسول آتے رہے۔ انھوں نے متفقہ طور پر لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر عالمی رائے عامہ نے دعوت توحید کو رد کر دیا اور زندگی کے تمام شعبے شرک کی بنیادوں پر قائم ہو گئے۔ اس زمانہ مں شرک اتنا طاقتور تھا کہ توحید کی آواز بلند کرنے والوں کو آرے سے چیر دیا جاتا تھا۔ جس نظام میں اقتصادیات دیوتاؤں کے نام پر لگنے والے بازاروں سے وابستہ ہوگئی ہو، اور جہاں ایک بادشاہ حکومت کرنے کا حق یہ کہہ کر حاصل کرتا ہو کہ وہ فلاں دیوتا کی اولاد ہے، وہاں توحید کے پیغام کو کس طرح برداشت کا جا سکتا تھا۔ اس وقت اللہ نے اپنے آخری رسول کو بھیجا اور اس کو **ليظهره على الدين كله** کی نسبت عطا فرمائی۔ اللہ کی اس نصرت کے بل پر اسلام کے نمائندے توحید کا پیغام لے کر اٹھے اور اس طاقت کے ساتھ اس کو پیش کیا کہ انسانیت کا قافلہ اک نئی راہ پر چل پڑا۔

شرک کو، دنیا کی زندگی میں، انفرادی عقیدہ کی حیثیت سے گوارا کیا گیا ہے (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) مگر اللہ کو یہ پسند نہ تھا کہ شرک، انسانی معاشرہ میں اجتماعی اقتدار کی بنیاد بنا رہے۔ چنانچہ رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا گیا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال 39)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (شرک) باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔

ان احکام کے مطابق پیغمبر اسلام نے اپنے ساتھیوں کو لے کر قدیم مشرکانہ نظام سے مقابلہ کیا۔ یہ مقابلہ جو تمام تر خدا کی نصرتوں کے سایہ میں ہوا، اس کا مقصد یہ تھا کہ شرک (فوق الفطری اختیارات کو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرنا) کے عقیدہ کو مقام اقتدار سے ہٹا دیا جائے۔ یہ کام رسول اور اصحاب رسول نے بے مثال قربانیوں کے ذریعہ مکمل طور پر انجام دیا اور شرک کو ہمیشہ کے لیے اقتدار کے مقام سے ہٹا دیا۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانے کے مسلمان جدید الحاد کے مقابلہ میں وہی رول ادا نہ کر سکے جو ان کے اسلاف نے قدیم شرک کے مقابلہ میں ادا کیا تھا۔ ورنہ آج نہ صرف یہ کہ

ہم دفاع کی پوزیشن میں نہ ہوتے بلکہ خودانسانیت کی تاریخ بھی دوسری ہوتی۔جس طرح ہزار برس پہلے ہمارے اسلاف نے اللہ کی تائید سے دنیا کی تاریخ بدل دی تھی۔

تاہم اللہ ہرامر پر غالب ہے۔وہ عالم انسانی کے واقعات پر مستقل نظر رکھتا ہے، اوراپنے فیصلہ کے تحت حق کا احقاق اور باطل کا ابطال کرتا رہتا ہے۔وہ کام جس کوکرنے میں مسلمان ناکام ثابت ہوئے تھے،اس کواللہ نے ،حیرت انگیزطور پر، خودمغربی اقوام کے ہاتھوں انجام دلا دیا ہے۔مغربی سائنس کی بعد کی تحقیقات نے وہ تمام نظریاتی بنیادیں منہدم کردیں جومذہب وشریعت کو بے اصل یازمانی ثابت کرنے کے لیے علم جدید نے وضع کی تھیں۔

انسان کوغلط راہوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے قرآن نے دوانتہائی بنیادی باتوں کی نشان دہی کی تھی۔ ایک یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقت کا غیبی طور پراقرارکرے، اگراس نے اصرارکیا کہ اس کوحقیقت کا براہ راست مشاہدہ کرایا جائے تو وہ سچائی کونہیں پا سکتا (هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ)

دوسرے یہ کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس امرواقعہ کا اعتراف کرے کہ وہ اپنی زندگی کا قانون خوداپنے علم کے ذریعہ دریافت نہیں کرسکتا۔اگروہ اپنا قانون خودوضع کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ صورت واقعہ کے سراسرخلاف ہوگا۔ (وَلَا تَقُولُوا لِمَا تصف اَلْسِنَتكم الكَذِب هٰذا حَلَال وهٰذا حَرَام)

موجودہ دورمیں ان دونوں باتوں کومذہبی خوش اعتقادی پرمحمول کیا گیا۔کہا گیا کہ ان کے پیچھے کوئی علمی بنیادنہیں ہے۔مگرسائنس کی بعد کی دریافتوں نے حیرت انگیزطور پرثابت کیاہے کہ انسان کے لیے واحد قابل عمل موقف وہی ہے جوقرآن میں بتایا گیا تھا۔اس کے سواکوئی دوسراموقف،علمی طور پر،اس کے لیے ہوہی نہیں سکتا۔

یہود نے تین ہزار برس پہلے اپنے نبی سے کہا تھا کہ ارنا اللہ جھرۃ ٹھیک یہی بات موجودہ زمانہ میں علم کے نام پردہرائی گئی۔سائنسی ذرائع کے استعمال سے جب ایسے بے شمار مخفی حقائق انسان کے علم میں آئے جن کووہ اس سے پہلے نہیں جان سکتا تھا،تو کہا گیا کہ سائنس

نے انسانی حواس کی محدودیتوں کی تلافی کردی ہے اوراب ہر موجود چیز کوانسان کے براہ راست مشاہدہ میں آجانا چاہئے۔سائنسی ذرائع کے استعمال کے بعد بھی اگر کوئی چیز تمھارے مشاہدہ میں نہیں آتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ سائنسی آلات خوردبینی کیڑوں سے لے کر بعید ترین اجرام تک کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، مگر مذہبی حقائق ان کے مشاہدہ میں نہیں آئے، تو سمجھ لیا گیا کہ ان کی کوئی واقعی حقیقت نہیں۔

مگر بیسویں صدی کا آغاز اس ذہن کے خاتمہ کے ہم معنی بن گیا۔ روشنی کی تعبیر ذرات (Corpuscles) سے کرنے کے سلسلے میں ناکامی نے بتایا کہ کائنات میں ایسی حقیقتیں ہیں جن کو طبیعی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایٹم کے ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ اشیاء ابتدائی سائنسی اندازوں سے بہت زیادہ پیچیدہ ہیں، ہم جتنی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ تعداد ان چیزوں کی ہے جو ہمارے آلات کی گرفت میں نہیں آتیں۔ حتّٰی کہ بلیک ہول تھیری کے مطابق خود کثیف اجسام کا بھی صرف 3 فی صد حصہ ہمارے لیے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ 97 فی صد حصہ وہ ہے جس کو ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے۔

جب کائنات اس سے زیادہ اشیاء کا مجموعہ ہے جو ہمارے براہ راست مشاہدہ میں آتی ہیں تو بقیہ ناقابل مشاہدہ چیزوں کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے۔ یہاں سائنس دانوں کو ذرائع علم میں مشاہدہ (Observation) کے ساتھ استنباط (Inference) کا اضافہ کرنا پڑا۔ پہلے دور کی علامت اگر نیوٹن تھا تو دوسرے دور کی علامت آئن سٹائن ہے۔ اس سلسلہ میں آئن سٹائن کے نظریات کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

In dealing with the enternal verities,the area of experiment is readuced and that of contemplation enhanced.

اس طرح سائنس نے گویا اس واقعہ کا اعتراف کرلیا کہ انسان کے لیے ایمان بالغیب (ظواہرِ کون کو دیکھ کر حقائقِ کون کو ماننا) کا طریقہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ نظریۂ علم (Theory of Knowledge) میں یہ تبدیل کوئی معمولی تبدیل نہیں

ہے۔ اس نے سچائی کا وہ دروازہ کھول دیا ہے جو دو سو برس سے بند پڑا ہوا تھا۔ سائنس نے جو کائنات دریافت کی تھی، وہ حیرت انگیز طور پر ایک انتہائی بامعنیٰ کائنات تھی۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی ایک توجیہہ (Explanation) مانگ رہی تھی۔ مگر توجیہہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک استنباطی چیز ہے نہ کہ مشاہداتی۔ اس لیے سائنس انیسویں صدی کے آخر تک اس سے گریز کرتی رہی۔ اب ''استنباط'' کو سائنسی علم کے زمرہ میں داخل کرنے کے بعد سائنس نے استنباطی توجیہہ کی صداقت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ نیوٹن کے الفاظ کو دوبارہ دہرایا جاسکے کہ نظام عالم کے پیچھے ایک خدائی بازو (Divine Arm) کام کر رہا ہے۔ حرکت، زندگی، حسن، معنویت، حکمت، عظمت اور پراسرار خواص کا وہ مجموعہ جس کو کائنات کہا جاتا ہے، اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوانہیں بنتی کہ اس کو ایک زندہ اور باشعور خدا کی کارفرمائی تسلم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ استنباطی استدلال کو ایک جائز طریق استدلال ماننے کے بعد پوری کی پوری سائنس قرآن کا علم کا کلام بن گئی ہے۔ اور قرآنی عقائد کو علمی سطح پر ثابت کر رہی ہے۔ کمی جو ہے وہ صرف یہ کہ سائنس کی دریافتوں کو ابھی تک قرآنی کلامیات کے طور پر مرتب نہیں کیا گیا۔

یہاں مثال کے طور پر میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنا ایک جوڑا رکھتی ہے۔ مقناطیس کے ایک ٹکڑے کو کاٹیں تو وہ فوراً اپنا ایک ساؤتھ پول اور نارتھ پول پیدا کرلے گا۔ اسی طرح ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں اپنے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ پارٹیکل کا اینٹی پارٹیکل۔ ایٹم کا اینٹی ایٹم، حتّٰی کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ اینٹی ورلڈ کو مانے بغیر ہم موجودہ ورلڈ کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور متوازی دنیا موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) ہماری موجودہ دنیا کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خواص رکھتی ہے۔ مثلاً ہماری دنیا فانی ہے جب کہ دوسری دنیا (اینٹی ورلڈ) کے اندر بقا کی صلاحت ہے۔ وغیرہ۔

یہ حیرت انگز طور پر قرآن کی تصدیق ہے۔ قرآن میں کہا گیا تھا: **وَمِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ**

خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تذکرون۔ یعنی دنیا کی تمام چیزوں کو ہم نے اس طرح بنایا کہ جوڑے کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن نہیں۔ تا کہ تم غور کر کے اس حقیقت تک پہنچو کہ پورے عالم کا بھی ایک جوڑا ہونا ضروری ہے، اور وہ آخرت ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کی تمام سائنسی دریافتوں کا حال ہے۔ یہ دریافتیں حقیقۃً عالم کون کے اندر چھپے ہوئے ''آلاء اللہ'' کا ظہور ہیں۔ یہ اس پیشین گوئی کی تکمیل ہے جو قرآن میں تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔

جدید دریافتوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے آخری طور پر متحقق کر دیا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا قانون خود دریافت نہیں کر سکتا۔

یہ بات اب غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے ذرائع اس کو صرف جزوی علم تک پہنچاتے ہیں۔ اس واقعہ کا سب سے زیادہ معنی خیز پہلو یہ ہے کہ جو باتیں ہمارے علم میں نہیں آتیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بہت زیادہ اہم ہوتی ہیں، جو ہمارے علم میں آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ ریڈیم کے الکٹران ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ ریڈیم کا ٹکڑا ایک غیر تابکار عنصر (سیسہ) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ الکٹران کیوں ٹوٹتے ہیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو بے شمار الکٹران میں سے ایک الکٹران کے لیے ایک وقت خاص میں قضا کا حکم بن کر آتی ہے۔ اس اہم ترین سوال کے بارے میں سائنس دانوں کی تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ حتّٰی کہ ایک سائنس داں کو کہنا پڑا کہ ''یہ شاید خداؤں کے اختیار میں ہے، خواہ وہ جو بھی ہوں۔''

یہی تمام اشیاء کا حال ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں:

The Important is unknowable ,and the knowable is unimportant.

(جو اہم ہے وہ نا قابل دریافت ہے اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں)

یہ بات جو سائنسی دنیا کے بارے میں دریافت ہوئی ہے، یہ اُس مسئلہ کے بارے

میں انتہائی اہمیت رکھتی ہے جس کو ہم ''انسانی قانون کا مسئلہ'' کہتے ہیں۔ کیونکہ انسان، ریڈیم کے ایک ٹکڑے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پیچیدہ وجود ہے۔ پھر جب ہم دھات کے ایک ٹکڑے کے قانون کو صحیح طور پر دریافت نہیں کرسکتے تو انسانی زندگی کا قانون کس طرح معلوم کرسکتے ہیں۔

سائنس نے بتایا ہے کہ انسان کی ہستی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جیسا کہ قدیم زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کا تعلق ساری کائنات سے ہے۔ وہ بیک وقت علم الخلایا سے لے کر فلکیات تک اور نفسیات سے لے کر اقتصادیات تک بے شمار علوم کا موضوع ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کو صحیح طور پر جاننے کے لیے ساری کائنات کا علم ضروری ہے۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہماری تحقیق نے بتایا کہ انسان کچھ ایسی لازمی محدودیتوں کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ حقیقت کو اس کی وسیع اور کلی شکل میں دیکھ سکے۔ انیسویں صدی میں قانون انسانی کے مطالعہ کو ''سوشل انجینئرنگ'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ گویا جس طرح ایک انجینئر لوہے کی ایک مشین کے لیے پائدار اور غیر متبدل قوانین وضع کرتا ہے، اسی طرح ماہرین قانون انسانی زندگی کے لیے بھی ایک قانونی ڈھانچہ بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ مگر قانون انسانی کا کوئی متفقہ معیار دریافت کرنے میں مکمل ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم ایسی کتابیں پڑھتے ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا:

قانون اپنی تلاش میں (Law in Quest of Itself)

علم قانون (Jurisprudence) طویل تلاش کے بعد بالآخر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہورہا ہے کہ خالص علمی طریق پر زندگی کا قانون انسان کے لیے قابل دریافت (Dscoverable) نہیں ہے۔ ہماری حیاتیات اور ذہنی محدودیتیں (Limitation) ہماری راہ میں فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔ جارج وائٹ کراس پیٹن نے اعتراف کیا ہے کہ قانونی معیارات کا کوئی متفقہ مجموعہ پانے کی صورت عملاً اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ وحی آسمانی کو قانون کا ماخذ مان لیا جائے!

انیسویں صدی میں مغرب میں سماجی قانون کے جتنے فلسفے پیدا ہوئے، سب کسی نہ کسی طرح اس کے دعوے دار تھے کہ سماجی قانون، طبیعی قانون کی طرح، خلقی (Inherent) طور پر سماج کے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہمارا کام صرف اس کو ''دریافت'' کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی قانون بھی اسی طرح ابدی ہے جس طرح بھاپ اور بجلی کے قوانین۔ یہ تمام فلسفے سماجی قانون کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ تاہم میں کہوں گا کہ اصولی طور پر ان کا موقف صحیح تھا۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ ایک صحیح چیز کو غلط جگہ تلاش کر رہے تھے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قانون بھی، طبیعیات وحیاتیات کے قوانین کی طرح، ابدی طور پر مقرر ہے۔ مگر اس قانون کو معلوم کرنے کی جگہ وحی الٰہی ہے نہ کہ وہ انسانی علوم جن کے متعلق ہم خود دریافت کر چکے ہیں کہ جزوی معلومات کے سوا ہمیں کچھ نہیں دیتے۔

انسانی قانون کو الٰہی ذریعہ سے قابل اخذ ماننے کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، اس کو کائناتی قانون کی سطح پر رکھنا ہے۔ یعنی جس منبع سے ساری کائنات اپنا قانون لے رہی ہے وہیں سے انسان بھی اپنا قانون اخذ کرے۔ یہ چیز انسانی قانون کو ابدیت کے خانہ میں ڈال دیتی ہے۔ کائناتی قانون کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مسلمہ طور پر غیر متغیر ہے۔ پانی جس قانون تجاذب کے تحت دو گیسوں کے ملنے سے وجود میں آتا ہے اور جس قانون حرارت کے تحت اس کے مالیکیول جدا ہو کر بھاپ کی شکل میں اڑنے لگتے ہیں۔ وہ ہر مقام اور ہر زمانہ میں یکساں ہیں۔ پھر خدا کے قوانین جب طبیعیات اور حیاتیات کی دنیا میں ابدی ہیں تو انسانی معاشرہ کے لیے اس کے قوانین غیر ابدی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی ماخذ سے نکلے ہوئے دو قوانین دو الگ الگ نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون کو خدا سے ماخوذ ماننا ہی اس کو زمان ومکان کی حد بندیوں سے ماورا ثابت کر دیتا ہے۔

قانونِ کائنات کی ابدیت اس کے باوجود ہے کہ اس کے اندر بے شمار قسم کے تغیرات ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ستاروں کی بابت عقیدہ رکھتا تھا کہ دن کے وقت ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ رات کی قندیلیں ہیں جو آسمان پر دیوتاؤں کے لیے جلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح چاند کے گھٹنے بڑھنے کو وہ حقیقی سمجھتا تھا۔ سورج کے متعلق اس

کا خیال تھا کہ وہ صبح کو ''نکلتا'' اور شام کو ''ڈوب'' جاتا ہے۔ یہ تغیرات آج ''آنکھ کا دھوکا'' ثابت ہو چکے ہیں۔ تاہم جدید انسان نے دوسرے اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے تغیرات کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان ظاہری تغیرات سے قوانین کی ابدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حیاتیات کی دنیا، جدید دریافت کے مطابق، مسلسل تغیرات کا شکار رہتی ہے۔ علم الخلایا نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کے تمام اعضاء بال اور ناخن سے لے کر گوشت اور خون تک ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی سائنس داں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حیاتیات اور عضویات کے علم کو ہر سال بدلا جائے۔ اور ان کو بار بار ''نئے حالات'' کے مطابق مدون کیا جاتا رہے۔ کیوں کہ گہرا مطالعہ بتا رہا تھا کہ تغرات کے ماورا جو انسانی وجود ہے، وہ تبدیلیوں کے باوجود، ایک حالت پر باقی رہتا ہے اور ایک ہی مستقل قانون کے تحت عمل کرتا ہے۔

اب ہم اپنی گفتگو کے آخری حصہ پر آتے ہیں: ''کیا کوئی براہ راست قرینہ بھی موجود ہے جو اس دعوے کی صداقت ثابت کرتا ہو کہ انسان کو اپنا قانون خدا کے ابدی سرچشمہ سے اخذ کرنا چاہئے۔'' جواب یہ ہے کہ کم از کم دو ایسے قرینے یقینی طور پر موجود ہیں۔ ایک انسانی فطرت، دوسرے انسانی ساخت کے قوانین کا تجربہ۔

لارڈ ایکٹن نے بجا طور پر کہا تھا:

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely

(اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بگاڑ دیتا ہے)

انسان کے بارے میں ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی انسان کو مطلق اختیار حاصل ہوا ہے، اس نے ظلم وفساد پیدا کیا ہے۔ انسان کی ساخت بتاتی ہے کہ وہ کسی برتر اقتدار کے ماتحت رہ کر ہی صحیح کام کر سکتا ہے۔ لامحدود اختیارات لازماً اس کو بگاڑ کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ بات اس سے پہلے صرف اخلاقی اصطلاحوں میں کہی جاتی تھی۔ مگر اب علم الحیات سے اس کا ثبوت ملنا شروع ہو گیا ہے۔ امریکہ کے مشہور بیالوجسٹ پروفیسر بی۔ ایف اسکنر

اوران کے ساتھیوں نے اس مسئلہ کا مطالعہ خالص حیاتیاتی سائنس کی روشنی میں کیا ہے اوراپنے نتائج تحقیق کوتازہ مطبوعہ کتاب Beyond freedom and Dignity میں درج کیا ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہ آزادی کاتحمل کرسکے:

We can't Afford Freedom

وہ تحقیق کے بعداس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کومحدودآزادی نہیں، پابندنظام (Disciplined Culture) چاہئے ۔یہی اس کی حیاتیاتی فطرت کے زیادہ مطابق ہے ـــــــ حیاتیاتی سائنس کے یہ تجربات قرآن کے اس بیان کی بالواسطہ طور پر تصدیق کررہے ہیں: يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ۔

اس کے بعدجب ہم انسانی قانون سازی کے تجربات کا مطالعہ کرتے ہیں،تواس سے بھی یہی قرینہ حاصل ہوتاہے کہ انسان اپنا قانون دریافت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔یہاں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق چندتقابلی مثالیں دوں گا۔

1۔شرعی قانون میں سودکوحرام قرار دیا گیاہے۔جب کہ وضعی قانون میں اس کوتجارتی سودے پرقیاس کرتے ہوئے جائزسمجھا گیاہے۔اگربے لاگ طور پردیکھا جائے توتجربہ پوری طرح شرعی قانون کی برتری ثابت کرتاہے۔سودکی حرمت کی بنا پرمسلم ملکوں میں ایک ہزارسال تک اقتصادی نظام چلتارہا۔مگرکبھی یہ نوبت نہ آئی کہ ایک طرف دولت کا انبار ہواور دوسری طرف افلاس کاانبار۔جدیداقتصادی نظام جوسودکی بنیادپرقائم ہے اس نے انسانی سماج میں پہلی باریہ غیرمتوازن صورت حال پیدا کی ہے۔اورموجودہ نظام کے اندراس کاکوئی حل نہیں۔

لین دین کی تمام شکلوں مس سودواحدطریقہ ہے جودولت کی گردش کےعمل کویک طرفہ بنادیتاہے۔سودکی یہی یہ وہ خصوصیت ہے جس سے مل کرجدیدصنعتی نظام ایک استحصالی نظام میں تبدیل ہوگیا۔اورنتیجۃً موجودہ صدی کی وہ دوسب سے بڑی برائیاں وجودمیں آئیں جن میں سے ایک کانام اشتراکی جبراوردوسرے کانام دوسری عالمی جنگ ہے۔ مارکس اور

انیسویں صدی کے دوسرے معاشی مفکرین جنھوں نے انفرادی ملکیت کی تنسیخ میں اقتصادی عدل کا راز تلاش کیا وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ صنعتی نظام کو جس چیز نے استحصال کا نظام بنایا ہے، وہ اس کے ساتھ سودی سرمایہ کاری کا جوڑ ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کا جوڑ۔ اگر وہ اس راز کو پالیتے تو وہ سود کی منسوخی کی وکالت کرتے، اس کے بجائے انھوں نے ملکیت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کر کے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ البتہ انسانیت کے ایک بڑے حصہ کو تاریخ کے سب سے بڑے اجتماعی عذاب میں اس طرح قید کر دیا کہ وہ اس سے نکلنا چاہے بھی تو نہ نکل سکے۔

تاہم ہٹلر نے سود کی اس شناعت کو محسوس کر لیا تھا۔ یہودی سرمایہ دار، دوسری عالم جنگ سے پہلے، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کی معاشیات پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔ ہٹلر نے اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ یہودیوں کے اقتصادی غلبہ کی وجہ سود ہے۔ اگر سود کو قانونی طور پر ناجائز قرار دے دیا جائے تو یہودی سرمایہ داری اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی ذی حیات کے جسم سے اس کا خون نکال لیا جائے۔ مگر اس کا بڑھا ہوا انتقامی جنون بعد کو اسے اقتصادی حل کے بجائے فوجی حل کی طرف لے گیا اور اس نے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ سے یہودیوں کے استیصال کے لیے تاریخ کی ہولناک ترین جنگ چھیڑ دی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ کے بچے کھچے یہودی امریکہ پہنچ گئے۔ پچھلے تیس برس میں اس قوم نے امریکہ کے سودی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے کر امریکہ کی اقتصادیات پر دوبارہ اسی طرح قبضہ کر لیا ہے جس طرح انھوں نے اس سے پہلے یورپ کی اقتصادیات پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ نازی جرمن کی طرح امریکہ میں بھی ان کے خلاف نفرت کا آغاز ہو چکا ہے حتیٰ کہ مبصرین پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ عجب نہیں کہ مستقبل میں امریکہ میں بھی ان کے خلاف کوئی ''ہٹلر'' پیدا ہو جائے۔

یہی صورت حال ایک اور شکل میں ''زیر ترقی ممالک'' میں پیش آ رہی ہے۔ یہ ممالک اپنی ترقیاتی اسکیموں کے لیے ترقی یافتہ ممالک سے قرضہ لینے پر مجبور تھے۔ یہ قرضہ، موجودہ

اقتصادی نظام کے تحت، انھیں سودی شرائط پر ملا۔ سود کی اقتصادی کرامت کے نتیجہ میں قرضوں کی یہ رقم بڑھتے بڑھتے اب اتنی زیادہ ہوچکی ہے کہ کئی مدیون ملک اپنی سالانہ قسطوں کی ادائیگی کے لیے خود دائن ملکوں سے دوبارہ قرض لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اکثر ملکوں کا یہ حال ہے کہ اگر انھیں یہ سارے قرضے مع سود ادا کرنے پڑیں تو وہ مکمل طور پر دیوالیہ ہوجائیں۔

2۔ شریعت اسلامی کا تصور سزا اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان ایک بااختیار مخلوق ہے۔ وہ بالقصد اپنے ارادے کے تحت جرم کرتا ہے اس لیے مجرم کو ایسی سزا دینا چاہیے جو دوسروں کے لیے عبرت (نکال) بن سکے۔ لوگ اس انجام کو دیکھ کر ڈر جائیں اور آئندہ جرم کرنے سے باز رہیں۔ اس کے مطابق شریعت خداوندی میں قاتل کی سزا قتل مقرر کی گئی۔ مگر اٹھارویں صدی کے آخر میں یورپ میں جرمیات (Criminology) کا ایک نیا فلسفہ وضع ہوا۔ اس کے مطابق جرم کوئی ارادی واقعہ نہ تھا، بلکہ اضطراری واقعہ تھا۔ اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں بتائے گئے۔ کہا گیا کہ مجرم کو مجرم کے بجائے مریض سمجھنا چاہیے، اور سزا دینے کے بجائے اس کے ''علاج'' کا انتظام کرنا چاہیے۔

اس نظریہ نے جدید دنیا میں غیر معمول مقبولیت حاصل کی۔ اکثر ملکوں میں جیل خانوں کے بجائے اصلاح خانے بنائے گئے اور اخلاقی جرائم کی حد تک سنگین سزاؤں کو ختم کردیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ہر ملک میں دفاعی اہمیت کے جرائم کے لیے سنگین سزائیں بدستور جاری رہیں اور یہ واقعہ اس نظریہ کے علم برداروں کی بے یقینی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ تاہم انسانی فطرت کے بارے میں بعد کی تحقیقات اور عملی تجربوں نے مزید اس نظریہ کی غلطی واضح کردی ہے۔ خوش حال اور ''صحت مند'' معاشروں میں لوگوں کے اندر جرائم کا رجحان اس سے بھی زیادہ پایا گیا جو نسبتاً غریب اور غیر صحت مند معاشروں میں نظر آتا ہے۔ ''معالجاتی'' تدبیریں جرائم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ جن ملکوں میں سزاؤں میں تخفیف کے اصول کو جاری کیا گیا، وہاں اس کے بعد جرائم کی رفتار بہت بڑھ گئی۔ کئی ملکوں مثلاً سری لنکا اور ڈیلاویر (Delaware) میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اس کو بحال

کرنا پڑا۔ چنانچہ ماہرین قانون اب اپنے سابقہ نظریہ پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ ایک ماہر قانون نے کہا ہے: لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل ملزم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے، اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (DetterantValue) رکھتا ہے۔''

اس کے برعکس شرعی قانون کی افادیت کا زندہ ثبوت وہ ممالک ہیں جہاں آج بھی شرعی سزا نافذ ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ یہاں، مہذب ممالک کے مقابلہ میں جرائم کی تعداد انتہائی حد تک کم ہے۔

3۔ اسی طرح ایک مثال عورت مرد کے درمیان تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اسلامی شریعت کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا تکملہ (Complements) ہیں۔ **بعضکم من بعض** (آل عمران) اس کے برعکس جدید تہذیب کا دعویٰ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا مثنیٰ (Duplicates) ہیں شرعی نقطۂ نظر کا تقاضا ہے کہ دونوں صنفوں کا دائرہ کار الگ الگ ہو۔ چنانچہ شریعت اسلامی میں مقرر کیا گیا کہ، اصولی طور پر، عورت کا دائرہ کار گھر اور مرد کا دائرہ کار باہر ہوگا۔ جب کہ مغربی فکر کا تقاضا تھا کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی میدان عمل میں سرگرم ہوں۔ دونوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق و تقسیم نہ رکھی جائے۔

مغربی ملکوں میں انیسویں صدی میں مساوات مرد وزن کے اصول کو رائج کیا گیا۔ مگر سو برس تک عمل ہونے کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ عورت کسی بھی شعبہ میں مرد کی جگہ لے سکتی۔ اس تجرباتی ناکامی نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ مسئلہ کا از سر نو جائزہ لیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اس مسئلہ پر مغربی ممالک، خصوصاً امریکہ میں غیر معمولی تحقیقات ہوئی ہیں۔ یہ تحقیقات حیرت انگیز طور پر شرعی نقطۂ نظر کی تصدیق کر رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ نہ صرف دونوں کی نفسیات الگ الگ ہیں۔ بلکہ دونوں کے درمیان فیصلہ کن قسم کے حیاتیاتی فروق (Biological Differences) پائے جاتے ہیں۔ اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی کام کے لیے موزوں نہیں۔

پھر دونوں نظریات کی بنیاد پر جو خاندانی اور معاشرتی زندگی بنتی ہے، وہ بھی اب مکمل طور پر سامنے آچکی ہے۔ مرد وعورت کے بارے میں شرعی اصول پر زمین کے ایک بڑے

رقبہ میں تیرہ صدیوں تک عمل ہوتا رہا۔ مگر زندگی کے نظام میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔ جب کہ مغربی زندگی میں ''مساوات'' کے جدید اصول کے انطباق نے پورے معاشرہ کو بگاڑ دیا ہے اور خاندانی زندگی بالکل منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔

عورت کو گھر کے باہر کے امور سپرد کرنے کے نتیجہ میں مغرب میں جو بے شمار مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کی تفصیل پیش کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں میں اس کے صرف دو پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ایک، بچوں کا اپنے سرپرستوں کی تربیت سے محروم ہونے کا مسئلہ۔ مغربی سماج میں یہ صورت عام ہے کہ باپ اور ماں دونوں کے بیرونی کام پر چلے جانے کی وجہ سے بچوں کو اپنے فطری مربیوں کے درمیان رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کے نتیجہ میں بار بار نئی صنفی دلچسپیاں وجود میں آتی ہیں اور طلاقوں کی کثرت سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو اجڑے گھروں (Broken Homes) کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح جو بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں ان کی شخصیت کا فطری ارتقاء نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ بچوں میں کثرت سے ایک قسم کی نفسیاتی بیماری پیدا ہو رہی ہے جس کو امریکی ڈاکٹروں نے آٹزم (Autism) کا نام دیا ہے۔ جسمانی طور پر بظاہر تندرست بچے ذہنی اعتبار سے عجیب وغریب قسم کے امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ مثلاً وحشت زدگی، ساتھیوں سے لڑنا۔ اسکول کا کام نہ کرنا۔ تشدد پسندی وغیرہ۔ ان کے علاج کی ہر تدبیر اب تک ناکام ثابت ہوئی ہے۔

دوسرا مسئلہ بڑوں سے متعلق ہے۔ بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ بڑے اپنے عزیزوں اور مخلصوں سے۔ فرانس کی ایک رپورٹ کے مطابق فرانس میں انسانوں کی 52 ملین آبادی میں سات ملین کتے ہیں یہ کتے اپنے مالکوں کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے وہ ان کے قریبی عزیز ہوں۔ پیرس کے نہایت مہنگے ہوٹلوں میں یہ منظر اب عجیب نہیں رہا کہ ایک مرد یا عورت اپنے کتے کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔ ''فرانسیسی لوگ اپنے کتوں سے کیوں اپنوں جیسا معاملہ کرتے ہیں'' جمعیۃ رعاتہ الحیوان (پیرس) کے ایک مسئول سے جب یہ پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: ''وہ چاہتے ہیں کہ

محبت کریں۔ مگر وہ انسانوں میں ایسے لوگ نہیں پاتے جن سے وہ محبت کرسکیں۔'' عورت مرد کے درمیان فطری توازن توڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے انسان منتشر ہو گئے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، یہ سب انسان کی فطری ضرورتیں ہیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے لیے اس قسم کے افراد نہیں پا سکتے تو انھوں نے کتے سے محبت شروع کردی۔ کیونکہ کتے میں کم از کم اتنی خصوصیت یقینی ہے کہ وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا، کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازے تک پہنچا چکے ہیں۔ اب حاملین قرآن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ کو کھول دیں، تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا جواب دے کر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔

طرابلس کے ندوۃ الحوار الاسلامی۔ المسیحی (فروری 1976) میں مسیحی موقف یہ تھا کہ دین صرف روحانی اقدار کا مجموعہ ہے۔ مسلم موقف یہ تھا کہ دین ایک مکمل نظام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مسیحی نمائندہ (ڈاکٹر شویلیکل) نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جدید زندگی کے بہت سے مسائل ہیں جن کے بارے میں دینی کتابوں میں قوانین نہیں ملتے ___ مثال کے طور پر سٹی پلاننگ۔ ایسی حالت میں دین کو مکمل نظام کے طور پر کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے شبہات اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ قانون کے مختلف حصوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ چنانچہ خلط مبحث کی وجہ سے معاملہ کی پوری نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ اسلامی نقطہ نظر سے قانون حیات کے تین مختلف حصے ہیں:

1۔ شریعت

2۔ فقہ

3۔ تمدن ضوابط

دین میں اساسی قانون کا جو حصہ ہے، اس کو شریعت کہتے ہیں۔ قرآن اور سنت ثابتہ اس شریعت کا ماخذ ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے زندگی کے وہ بنیادی قوانین بتا دیئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام صحیح طور پر قائم ہو سکتا ہے۔ یہ قوانین اسی طرح غیر متبدل ہیں جس

طرح طبعیات اور حیاتیات کے قوانین غیر متبدل ہیں۔

فقہ، ایک معنی میں شریعت کے بنیادی قانون کی زمانی تعبیرات کا نام ہے۔ بنیادی انسانی قانون بلاشبہ ناقابل تغیر ہے۔ مگر زندگی کے نقشوں میں تبدیلی کی وجہ سے بار بار اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے نقشہ میں اسلام کے ابدی قانون کو منطبق کیا جائے۔ فقہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں جب اسلام کو وسعت حاصل ہوئی اور زندگی کے نقشے بدل گئے تو قاضی ابو یوسف (798-731) سامنے آئے اور انھوں نے وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تمام امور پر اسلامی قوانین کو منطبق کر کے دکھا دیا کہ اسلام کس طرح اپنے اندر گنجائش رکھتا ہے کہ ہر دور کی ضرورتیں پوری کر سکے۔

تاہم فقہ میں، اساسی شریعت کے برعکس، زمانی عنصر پایا جانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فتاویٰ قاضی خاں میں ایک جزئیہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھالے کہ میں ہوا میں اڑوں گا اور نہ اڑ سکے تو اس پر کفارہ واجب نہیں۔ کیونکہ ہوا میں اڑنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کا فقیہہ اس قسم کا فتویٰ نہیں دے گا۔ فقہ کو ہر زمانہ کے حالات سے موافق بنانے کے اسی عمل کا نام اجتہاد ہے۔ شریعت، اجتہاد کے ذریعہ ثابت کرتی ہے کہ وہ کس طرح دائمی طور پر قابل عمل ہے۔ فقہی اجتہاد اگر چہ اساسی طور پر شریعت کا پابند ہے۔ مگر وہ کسی سابق فقہ کا پابند نہیں۔ کیوں کہ فقہ صرف اجتہاد اسلام کا ریکارڈ ہے وہ بجائے خود شریعت نہیں۔

قانون کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے لیے میں نے ''تمدنی ضوابط'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں شریعت نے ہمیں کسی قانون کا پابند نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمدنی ضرورتوں کے مطابق انسانی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کی ضابطہ بندی کی آزادی دی ہے۔ سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا ذکر کیا ہے جن کو بڑی بڑی مادّی ترقیاں دی گئی تھیں۔ معدنیات کو تصرف میں لانے کا فن، ہوائی سفر کی قدرت، بعید مقامات تک خبر رسانی کی صلاحیت، فن تعمیر، انجینئرنگ، زراعت، شہری پلاننگ وغیرہ میں ان کو غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ مگر اس سلسلے میں کوئی ''صنعتی شریعت'' یا ''ٹکنیکل فقہ'' ان کو نہیں دی گئی۔ صرف یہ حکم دیا گیا کہ خدا کے شکر گزار رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمدّنی امور میں ضوابط مقرر کرنے کا معاملہ

شریعت سے متعلق نہیں ہے۔ یہ کام آدمی کوخود اپنے علوم (سائنس) کے ذریعہ انجام دینا ہے۔
البتہ اس کے اس عمل میں خدا کی شکرگزاری کی روح جاری وساری رہنا چاہئے جوخود اس بات
بھی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ اس کی قانون سازی ظلم اورفساد کے اجزاء سے پاک رہے
گی۔

اس مقالہ کا عربی ترجمہ (وجوب تطبیق الشریعۃ فی کل زمان ومکان) الریاض کی اسلامی
فقہ کانفرنس میں 26/اکتوبر 1976 کو ظفرالاسلام خاں نے نیابۃً پڑھا۔

اسلام: دورِ شمشیر کا خاتمہ، دورِ دعوت کا آغاز

بحر مردار (Dead Sea) اردن اور اسرائیل کے درمیان واقع ہے۔ اس کا دوسرا نام بحر لوط ہے۔ چار ہزار برس پہلے یہ علاقہ نہایت سرسبز وشاداب علاقہ تھا۔ چار بڑے بڑے شان دار شہر اس کے کنارے آباد تھے۔ جب یہاں کے لوگوں میں بگاڑ آ گیا تو لوط بن حاران بن آزر کو خدا نے پیغمبر بنا کر ان کے پاس بھیجا۔ مگر ان کی سرکشی بڑھتی رہی۔ بالآخر جب حجت تمام ہوگئی تو 2016 ق م میں ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ ان کی بستیاں الٹ گئیں۔ سمندر کا پانی ان کے اوپر چڑھ گیا۔ پورا علاقہ اس طرح برباد ہوگیا کہ اب وہاں چڑیاں اور مچھلیاں بھی نہیں پائی جاتیں۔

یہی معاملہ تمام نبیوں کے منکرن ومخالفین کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اتمام حجت کے بعد کوئی قوم موجودہ دنیا میں بودوباش کے حق سے محروم ہوجاتی ہے۔ اس لیے فرشتوں یا خود اہل ایمان کے ذریعہ اس دنیا سے اس کا خاتمہ کردیا جاتا ہے۔ پیغمبر آخرالزماں کے مخالفین بھی، آپ کا انکار کرنے اور آپ کو آپ کے وطن سے نکال دینے کے بعد، اسی خدائی سزا کے مستحق ہوگئے تھے۔ (اسراء 77) چنانچہ انھیں بھی یہ سزا دی گئی۔ البتہ اس کی صورت بدلی ہوئی تھی۔ دیگر انبیاء کے ساتھیوں کی تعداد چونکہ بہت کم تھی، اس لیے ان کے مخالفین کو ہلاک کرنے کے لیے زلزلہ اور طوفان آئے (عنکبوت ۔40) مگر نبی آخرالزماں کے ساتھ حمایت کرنے والوں کی بھی معقول تعداد ہوچکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کے ساتھیوں کی تلوار کو آپ کے مخالفین کی ہلاکت کے لیے استعمال کیا (قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ) بدر کی قتل گاہ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، ٹھیک ویسی ہی تھی جیسا عاد وثمود کے برباد شدہ مساکن۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تلوار، پیغمبر اسلام کے مشن کا اضافی جزء تھی نہ کہ حقیقی جزء۔ وہ شکلاً دفاع جنگ اور حقیقۃً خدائی سزا کے طور پر ظاہر ہوئی، جیسے پچھلی قوموں پر آنے والا عذاب شکلاً زلزلہ یا طوفان تھا اور حقیقۃً ایک منکر قوم پر خدا کی سزا ـــــ مگر بعد کے دور میں اسلام کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں عام رواج کے اثر سے تلوار کے واقعات بہت

زیادہ نمایاں ہوگئے، لوگوں کو اسلام کی تاریخ تلوار کی تاریخ نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ خود مسلمان بھی شمشیری کارنامے دکھانے کو سب سے بڑا جہاد سمجھنے لگے۔

بعد کے دور میں اسلام کے ساتھ جو المیے پیش آئے، ان میں یہ المیہ سرفہرست ہے کہ دینِ رحمت دین شمشیر بن گیا۔ اسلام جن مقاصد کے لیے آیا، ان میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انسانوں کے درمیان جنگ وجدل کو ختم کر کے سمجھنے اور سمجھانے کے طریقے کو رائج کرے (ص۔29) طاقت کی منطق کی جگہ عقل وفکر کی منطق کو اونچا مقام دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، دورِ تلوار کا خاتمہ اور دورِ دعوت کا آغاز تھا۔ قرآن میں یہ حکم کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کرو (فرقان) گویا اس بات کا اعلان تھا کہ پیغمبرِ اسلام کی بعثت سے تاریخ انسانی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب کہ نظریہ ''شمشیر وسنان'' کا بدل ہوگا۔ نظریاتی طاقت سے فتوحات حاصل ہوا کریں گی۔

اس اصول کا نہایت کامیاب مظاہرہ خود پیغمبر اسلام نے معاہدۂ حدیبیہ کی صورت میں کیا۔ آپؐ نے جنگ سے بچنے کے لیے بظاہر ایک مغلوبانہ صلح کر لی۔ آپؐ میدان جنگ کو چھوڑ کر میدانِ دعوت کی طرف واپس چلے گئے۔ یہ صلح جو ظاہر بینوں کے نزدیک ''ذلت آمیز شکست'' کے ہم معنی تھی، خدا نے اس کو فتح مبین (فتح۔1) قرار دیا۔ ان الفاظ کی صداقت صرف دو برس میں ثابت ہوگئی۔ صلح کے وقت مسلمانوں کی تعداد بمشکل ڈیڑھ ہزار تھی۔ جب کہ اس کے بعد، دعوت وتبلغ کے نتیجہ میں، ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اب اسلام اتنا طاقت ور ہو چکا تھا کہ مکہ کسی جنگ کے بغیر فتح ہوگیا۔

مسلمانوں کے اندر بعد کے زمانے میں، یہ جو ذہن پیدا ہوا کہ وہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانے اور شمشیری کمال دکھانے کو جہاد سمجھنے لگے، اس کی ایک وجہ اور تھی۔ اور وہ وہی فتنہ تھا جس میں اکثر پچھلی امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔

سلیمان بن داؤد (937-977ق م) یہودیوں کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کی حکومت شام وفلسطین کے علاوہ مشرق میں فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو بعض غیر معمولی

معجزے دیئے گئے تھے۔ ہوا ان کے لیے مسخر تھی، وہ جانوروں کی بولیاں سمجھ سکتے تھے (نمل) معدنیات پر انھیں خصوصی قدرت حاصل تھی۔ جنات ان کے تابع کردیئے گئے تھے۔(ص، سبا) اسی قسم کے ایک جن نے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں یمن سے لاکر فلسطین میں رکھ دیا تھا (نمل)

حضرت سلمان کی وفات کے بعد، آپ کی یہ خصوصیات، یہود کے لیے فتنہ بن گئیں۔ اپنے ''قومی بزرگ'' کی تقلید میں انھوں نے کوشش شروع کردی کہ وہ بھی اس قسم کے کمالات اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے بطور خود کچھ کراماتی فنون ایجاد کئے اوران کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کردیا (بقرہ۔102) سحر و کہانت اور مختلف قسم کے سفلی عملیات، سب مفروضہ ''سلیمانی انگشتری'' کے بدل کے طور پر بنے۔ طلسماتی اعمال میں انھوں نے اتنی شہرت حاصل کی کہ 38 ق م میں جب ایرانی بادشاہ بخت نصر نے ان کو اپنے وطن سے منتشر کیا تو فلسطین کے باہر بھی توہّم پرست لوگوں میں وہ اپنے معتقدین پاتے رہے۔ بابل (قدیم عراق) میں وہ محنت مزدوری کرانے کے لیے لے جائے گئے تھے۔ مگر جیوش انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ''بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا'' (جلد 6، صفحہ 413)___ سائنٹفک تعلیم کے اثر سے، موجودہ زمانہ میں، یہودیوں میں اس قسم کے عملیات کا رواج ختم ہوگیا۔ تاہم یہ فن اب بھی اپنے سرپرستوں سے محروم نہیں۔ نبی آخرالزماں کی امت نے اس کو ''اسلامی'' بنا کر زیادہ بہتر طور پر اپنی مقدس سرپرستی میں لے لیا ہے۔

یہی قصہ، مختلف شکلوں میں دوسرے انبیاء کی امتوں کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ ہر نبی کو، اس کے حالات اور زمانہ کے اعتبار سے، کوئی خصوصی چیز دی جاتی ہے۔ اس کی امت کی بعد کی نسلوں میں جب دین شعور کمزور پڑتا ہے تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے۔ یہ فتنہ ہمیشہ اس خصوصیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو کسی نبی کو دیا گیا تھا۔

پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو خارق عادت معجزے نہیں دیئے گئے۔ اس کے بجائے آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصی فیصلہ کیا جو، معلوم تاریخ کے مطابق، کسی اور نبی کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے انبیاء کے مخالفین کو زیر کرنے یا ان کو ہلاک کرنے کے لیے

خدائی آفتیں نازل ہوئیں۔ جیسا کہ نوح، لوط، اور ہود علیہم السلام کے مخالفین کے ساتھ ہوا۔ مگر پیغمبرؐ اسلام کے لیے اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ آپؐ کے پیروؤں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی جائے اور ان کی تلواروں سے ان کے مخالفین کو زیر کیا جائے (توبہ۔14) اور اس طرح ان کو غالب کر کے ایک طاقت ور اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نبی آخر الزماں کے ذریعہ دین خداوندی کو تاریخ کی حیثیت دینی تھی جو ہزاروں نبیوں کی آمد کے باوجود ابھی تک صرف ایک مذہبی افسانہ بنا ہوا تھا۔ نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ کتاب الٰہی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔ پیغمبر آخر الزماں کو اگر (اظہارِ دین کی) یہ خصوصیت نہ دی جاتی تو ان فائدوں کا حصول ناممکن تھا۔

پیروانِ اسلام کے پاس فتنہ میں پڑنے کے لیے حضرت سلیمان جیسے معجزات و کرامات نہ تھے۔ آپؐ کی امتیازی خصوصیت، ظاہری طور پر دیکھنے والوں کے لیے، فتوحات اور سیاسی انقلابات تھے۔ بعد کے زمانہ میں اسلام کے پیروؤں کے لیے یہی چیز فتنہ بن گئی۔ وہ آپ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو آپؐ کے مشن سے الگ کر کے دیکھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ پیغمبر عربی اقتدارِ وقت سے ٹکرانے اور سیاسی معجزات دکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس لیے انھیں بھی تلوار زنی اور سیاست رانی کے جوہر دکھانے چاہئیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے یہود نے سمجھ لیا کہ حضرت سلیمان کراماتی شعبدوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے آئے تھے، اس لیے انھیں بھی اسی قسم کی چیزوں میں مشغول ہونا چاہئے۔ حالانکہ پیغمبرؐ اسلام کا مشن بھی، قرآن کی تصریحات کے مطابق، وہی تھا جو دوسرے تمام انبیاء کا مشن تھا۔ آپؐ دعوت الی اللہ اور انذار آخرت کے لیے تشریف لائے تھے۔ نہ کہ تلوار چلانے اور سیاسی کارنامے دکھانے کے لیے جس طرح پچھلے انبیاء زلزلوں اور طوفانوں کے ذریعہ شہروں کو زیر زمین دفن کرنے یا زرخیز زمینوں کو بے آب و گیاہ بنانے نہیں آئے تھے، حالاں کہ یہ سب واقعات ان کے ذریعہ سے وجود میں آئے۔ اسی طرح نبی آخر الزماں تلوار چلانے اور قوموں کو زیر کرنے کے لیے مبعوث نہیں کئے گئے، اگرچہ مصلحت خداوندی کے تحت یہ واقعات بھی آپؐ کی زندگی میں پیش آئے۔

اس ذہن کے اثرات بہت عرصہ سے سیرت اورتاریخ کی ترتیب میں ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔قرآن اورحدیث میں پیغمبرؐاسلام کی جوتصویر ہے، وہ سیرت میں آکر بدل جاتی ہے۔سیرت کی کتابیں، دوسرے پیغمبروں کے حالاتِ زندگی کے برعکس،فتوحات اورمغازی کی داستانیں نظرآتی ہیں ۔اسلامی تاریخ تک پہنچ کر یہ ذہن اورترقی کرتاہے۔اسلامی تاریخ،عملا، اسلام کی تاریخ سے زیادہ سلاطین اور جنرلوں کے کارناموں کی فہرست بن گئی ہے۔

ایسا ہونا فطری تھا۔اسلام کی تاریخ، بعد کے زمانہ میں اس وقت مرتب کی گئی جب کہ مسلم تلواروں کی جھنکار سے تمام ممالک گونج رہے تھے۔فتوحات اورجنگوں کی خبریں سارے مسلم معاشرہ میں سب سے بڑاموضوع گفتگو بنی ہوئی تھیں۔اس ماحول میں لکھی جانے والی سیرت کی کتابیں اگر''مغازی'' کی داستان بن جائیں اوراسلامی تاریخ''فتوح البلدان'' کے روپ میں ڈھل جائے تواس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔سیرت اسلام کی تاریخ اگرمکی دورمیں لکھی گئی ہوتی تواس کاانداز اس سے بالکل مختلف ہوتا جوآج ہمیں اس موضوع کی کتابوں میں نظرآتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پہنچ کر یہ ذہن ایک نئی شدید تر صورت اختیار کرگیاہے۔موجودہ زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔مگرہم حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں جواسلامی تحریکیں اٹھیں،ان میں سے اکثر اقتدارِ وقت کے خلاف لڑائی بھڑائی کے راستہ پرمڑگئیں۔اس کی وجہ، جزوی طور پروقت کے سیاسی ماحول کے خلاف ردعمل اورجزوی طور پرمندرجہ بالا تاریخی نفسیات رہی ہے۔موجودہ زمانہ میں،مغربی تہذیب کے تصادم کی وجہ سے،اسلام اورمسلمانوں کے لیے جومسائل پیدا ہوئے ،وہ ایک دعوتی اورتعمیری جدوجہد کا تقاضا کررہے تھے۔مگرمسلمان ،ساری دنیامیں، شمشیری مقابلہ یاسیاسی ٹکراؤ کے طریقہ کی طرف چلے گئے اورنتیجۃً بربادی کےسوا کچھ بھی ان کے حصہ میں نہ آیا۔

اسلام ساری دنیاکے لیے خدا کی رحمت (انبیاء-107) تھا۔وہ اس لیےآیا تھا کہ خداکے بندوں کوخداکے سایہ کے نیچے جمع کردے۔مگرخدا کی یہ رحمت ابھی تک اس کے تمام بندوں تک وسیع نہ کی جاسکی۔اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خودحاملینِ اسلام پرعائد ہوتی ہے۔

حاملین اسلام، خدا کی رحمت کو تمام انسانوں تک پہنچانے میں ناکام رہے۔اس کی واحد وجہ وہ ہے جس کو قرآن میں تفرق فی الدین (شوریٰ۔13) کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے دین کے آفاقی اور دائم حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ بس یہ دین کی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے،اس پر چلتے رہو۔اس کے سوا اپنی طرف سے اس میں نئے نئے راستے مت نکالو (انعام۔153)۔مگر مسلمانوں نے خدا کے بتائے ہوئے دین کے سوا بہت سی اور چیزیں نکالیں اور ان کو "دین" قرار دینے پر اصرار کیا۔ان غیر قرآنی امور پر ساری امت مجتمع نہیں ہوسکتی تھی۔کچھ لوگوں نے ایک چیز پر اصرار کیا، کچھ لوگوں نے دوسری چیز پر۔اس طرح دین میں نئے نئے فرقے بنتے چلے گئے۔ان اختلافات نے لوگوں کو آپس کی لڑائیوں میں مصروف کر دیا، پھر وہ دوسروں تک خدا کا پیغام پہنچانے کا وقت کہاں پا سکتے تھے۔

اسلام ایک سادہ دین ہے (**بعثت بالحنيفة السمحة**) مگر کچھ لوگوں نے چاہا کہ اسلام کی سادہ تعلیمات میں فنی تفصیلات اور خارجی تعینات کا اضافہ کر کے بزعم خود اس کو "مکمل" کریں۔یہی کوشش تھی جس نے ان تمام فنون کو پیدا کیا جن کو فقہ اور تصوف اور علم کلام کہا جاتا ہے۔احکام اسلامی کی فنّی تفصیلات متعین کرنے کا نام فقہ ہے معرفت الٰہی کے خارجی ذرائع مقرر کرنے کا نام تصوف ہے۔اعتقادیاتِ اسلامی کو عقلی پیمانوں میں ڈھالنے کا نام علم کلام ہے۔ بظاہر یہ کوششیں مفید اور بے ضرر معلوم ہوتی ہیں۔مگر دینِ خداوندی کا معاملہ عام انسانی معاملات سے مختلف ہے۔ دین میں کوئی اضافہ،خواہ وہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بالآخر مقدس بن جاتا ہے۔جو لوگ ایک بار اس سے وابستہ ہو جائیں، وہ نہ صرف خود بلکہ ان کی نسلیں بھی اس کو چھوڑنے یا اس کو غیر اہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ایسی ہر کوشش دین میں صرف ایک نیا فرقہ وجود میں لانے کا باعث بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دین میں کسی طریقہ کا اضافہ کرنا مطلق ناجائز قرار دیا گیا ہے۔آپؐ نے فرمایا:

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد جو ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز نکالے جو اس میں نہ ہو تو وہ قابل رد ہے۔

اس قسم کی کھلی ہوئی ممانعتوں کے باوجود لوگ انتہائی معصومانہ طور پر دین میں اضافے کرتے رہے اور بالآخر ایک دین کو ''72'' دینوں میں تقسیم کر ڈالا۔

تاہم یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں اگر ''72'' فرقے'' پیدا ہوئے تو عیسائیت میں 372 فرقے بن گئے۔ ہندوازم اس سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ قومیں باہم جنگ سے بچ کر تعمیر واستحکام کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ عیسائیت کا یہ حال ہے کہ آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ منظم تبلیغی کام اسی مذہب کے لوگ کر رہے ہیں۔ حتیّٰ کہ اس نے مذہب تبلیغ کو نئی وسعت اور بلندی عطا کی ہے۔ ہندوازم جدید مغربی دنیا میں زبردست تبلیغی مذہب کی حیثیت سے اپنی جڑیں پھلا رہا ہے۔ سوامی وویکانند (1902۔1863) سے لے کر سوامی پربھوپادا (1977۔1896) تک ہندو مبلغین کا ایک سلسلہ ہے جس نے پوری پوری عمر اسی کام میں صرف کر ڈالی اور وقت کی زندہ زبانوں اور آج کی ترقی یافتہ قوموں میں اپنے دھرم کو بڑے پیمانہ پر پھیلانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر اسلام، عملی طور پر، صدیوں سے ایک جامد مذہب بنا ہوا ہے۔ اس دوران میں اسلام کے پھیلنے کے اگر کچھ واقعات ہیں تو وہ اسلام کی اپنی قوت کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ اسلام کے نام لیواؤں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ الا ماشاءاللہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب صرف مذہبی فرقہ بندی کی بدعت تک محدود رہے۔ جب کہ اسلام کے نام لیوا اس سے آگے بڑھ کر سیاسی فرقہ بندی کی شدید تر بُرائی میں گرفتار ہو گئے۔ عام طرز کی فرقہ بندی زیادہ سے زیادہ مذہبی اختلافات پیدا کرتی ہے۔ مگر سیاسی فرقہ بندی وہ بری بلا ہے جو دو فریقوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بناتی ہے۔ وہ مناظرانہ بحثوں کو تلواروں اور بندوق کی لڑائی بنا دیتی ہے۔ سیاسی فرقہ بندی میں صرف دو نہتے فریق ایک دوسرے سے نہیں الجھتے بلکہ یہ ایک نہتے گروہ کے ساتھ وقت کے اقتدار کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہترین طاقتیں اور صلاحیتیں سیاست کے مقتل میں ذبح کر دی جاتی ہیں۔ دعوت وتبلغ کا عمل مسلمانوں کی طاقت کو غیر اقوام کی طرف لگاتا ہے۔ جب کہ ''اسلامی سیاست'' کا نعرہ مسلمانوں کو خود مسلمانوں کے خلاف دست وگریباں کر دیتا

ہے۔ مسلمان دو طبقوں (بے اقتدار اور با اقتدار) میں بٹ کر ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تل جاتے ہیں۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہ متحد ہو کر خدا کے دین کی توسیع و اشاعت کا کوئی موثر کام کر سکیں۔

سیاسی فرقہ بندی کا پہلا واقعہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد شیعیت کا ظہور ہے۔ اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں سے یہ سیاسی رواج چلا آ رہا تھا کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔ حکومت ساری دنیا میں ایک وراثتی حق سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار اس طریقہ کو ختم کر کے شورائی حکمرانی (شوریٰ۔38) کے طریقہ کا اعلان کیا۔ مگر بہت سے لوگ جو اسلام میں داخل ہونے کے باوجود، زمانی افکار سے آزاد نہ ہو سکے تھے، اس تبدیلی کو قبول نہ کر سکے اور پیغمبر اسلام کے بعد آپؐ کے خاندان میں خلافت کو جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ چونکہ پیغمبر کا کوئی بیٹا نہ تھا، اس لیے ''اہل بیت رسول'' کی اصطلاح وضع ہوئی۔ تا کہ بیٹے کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے لیے اس کا استحقاق ثابت کیا جا سکے۔

اس تحریک کو جب کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے دوسری شدید تر غلطی کی۔ جو چیز ابتداءً محض ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو انھوں نے ایک باقاعدہ مذہبی عقیدہ بنا ڈالا۔ حتیٰ کہ اس کو نجات کا دارومدار قرار دے دیا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جس چیز کو مذہبی عقدہ کی حیثیت دے دی جائے، چاہے وہ بذات خود کتنی ہی بے اصل کیوں نہ ہو، بالآخر وہ مقدس بن جاتی ہے اور پھر اس کو ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی شیعہ عقیدہ کے ساتھ ہوا۔ یہ عقیدہ مقدس بن کر ہزاروں لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا اور اس کے لیے سب کچھ کرنا عین جائز قرار پایا۔

اسلام کی اب تک کی تاریخ میں جتنے بڑے بڑے حادثات گزرے ہیں، ان میں کسی نہ کسی طور پر اس عقیدہ کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔ اس عقیدہ نے مسلمانوں کو ایک دائمی قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ شیعہ گروہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشرہ کے اندر منفی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آغاز اسلام میں خلافت کے جھگڑوں سے لے کر اب تک بمشکل کوئی ایسا مسلم المیہ ملے گا جس میں بالواسطہ یا براہ راست طور پر اس کی

کارفرمائی شامل نہ ہو۔

ان باہمی اختلافات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کی وہ طاقت جو اسلام کی اشاعت وتوسیع میں لگتی، وہ آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوگئی۔ مثال کے طور پر صفین وجمل کی لڑائیوں (37-36ھ) اور حسین ویزید کی جنگ (61ھ) میں جو تقریباً ایک لاکھ مسلمان کٹ گئے، وہ اتنے طاقت ور تھے کی یورپ کی آخری سرحدوں تک اسلام کو پہنچانے کے لیے کافی تھے۔ مگر یہ انتہائی قیمتی گروہ خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوگیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

قدیم زمانہ میں سیاست کو عقیدہ بنانے کا رواج غیر اہل بیت کے اقتدار کے مقابلہ میں اہل بیت کے اقتدار کو ثابت کرنے کے لیے ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں یہی بدعت نئی شکل میں دہرائی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہمارے قائدین کے سیاسی جوش میں کوئی کمی نہ کر سکا کہ سیاست نے موجودہ زمانہ میں وہ معنویت کھودی ہے جو قدیم زمانہ میں اسے حاصل تھی۔ پچھلی صدیوں میں اجتماعی معاملات کی نوعیت بے حد بدل گئی ہے۔ قدیم زمانے میں سیاسی انقلاب بجائے خود ''انقلاب'' کے ہم معنی ہوتا تھا۔ آج سیاسی انقلاب صرف ایک ہڑبونگ ہے، اگر اس کے ساتھ دوسری غیر سیاسی قوتیں اس کی مدد کے لیے جمع نہ کی گئی ہوں۔

اولاً انیسویں صدی کے آغاز میں اس فکر کا ظہور ہوا جب کہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے مغربی استعمار کو ختم کرنے اور مسلم اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے اس کو بطور شرعی دلیل کے پیش کیا گیا۔ یہ استعمار مسلمانوں کو تعلیم وترقی اور تبلیغ ودعوت کے میدان میں ہر قسم کے مواقع دے رہا تھا۔ ایک انگریز ڈاکٹر سرٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ (1931) نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے اس زمانہ میں ایک انتہائی قیمتی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں یہ عظیم تاریخی رہنمائی تھی کہ سیاسی اقتدار کے بغیر اسلام اپنی دعوتی قوت سے ملکوں اور قوموں کو فتح کر سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ کیوں کہ جس سیاسی نظام کا وجود ہی سرے سے حرام ہو اس کے تحت ''آدھی پونی مذہبی زندگی'' کا سودا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہ رہا کہ ہمارا سیاسی پروگرام دنیوی اعتبار سے نتیجہ خیز

ہو۔ اب وہ مقدس جہاد تھا جو افضل العبادات ہے اور جس کی راہ میں اپنے کو مٹا دینا بجائے خود کامیابی ہے۔ کیوں کہ وہ سیدھے جنت تک پہنچاتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بے شمار لوگ ''استعمار'' سے لڑلڑ کر انتہائی بے فائدہ طور پر اپنی جان و مال کو برباد کرتے رہے۔

یہ سیاسی جہاد صرف اجنبی حکمرانوں تک محدود نہ تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی (1918-1842) اور شاہ فاروق (1965-1960) جیسے مسلم حکمراں بھی اسی سیاہ فہرست میں داخل تھے۔ کیوں کہ وہ مغربی مستعمرین کے ''ایجنٹ'' بنے ہوئے تھے۔ سید جمال الدن افغانی (1897-1838) کو ایران، مصر اور ترکی کے حکمراں زبردست مواقع دے رہے تھے کہ وہ دعوتی اور تعلیمی میدان میں اسلام کی تعمیر کا کام کریں۔ مگر ان کی مجاہدانہ سیاست کو اس قسم کے کام حقیر معلوم ہوئے۔ وہ ان مواقع کو چھوڑ کر خود ان حکمرانوں کو تخت سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ حکمراں طبقہ سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ ہر ملک سے نکالے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ترکی کے قید خانہ میں مر گئے ۔ یہی الم ناک کہانی، موجودہ زمانہ میں، مسلم ملکوں کے بادشاہوں اور مصلحین کے درمیان مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے۔

بیسویں صدی میں مسلم ممالک، کم از کم سیاسی معنوں میں، اجنبی اقتدار سے آزاد ہو چکے ہیں مگر مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اب بھی ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ اس نے نظریاتی صورت اختیار کر کے مزید شدت پکڑ لی ہے اب اس کا عنوان ہے: اسلامی قانون کا نفاذ یا حکومت الٰہیہ کا قیام۔ جس ملک میں بھی چیخ پکار کرنے یا احتجاجی سیاست چلانے کے مواقع ہیں، وہاں ہمارے مصلحین اور قائدین اسلامی قانون کا جھنڈا لیے ہوئے اپنی قومی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں اور پوری قوم کو ایک لامتناہی جنگ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ انڈونیشیا کے عبد القہار مذکر (1972-1902) کو سابق صدر سوئیکارنو ہر قسم کے اصلاحی کام کے مواقع دے رہے تھے۔ مگر وہ دستور اسلامی کے نفاذ کے نام پر لڑلڑ کر ختم ہو گئے۔ مصر کے سید قطب (1966-1906) کو سابق صدر جمال عبد الناصر نے اسلامی تعلیم و ترقی کے کاموں کے لیے حکومتی تعاون کی پیش کش کی۔ مگر وہ اور ان کی پوری جماعت صدر ناصر کی معزولی سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ان کو پیس ڈالا۔ پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ

مودودی (1903) کو پاکستان کے حکمرانوں نے دعوت اور تعمیری کاموں کے لیے ہر قسم کا تعاون دینا چاہا۔ مگران کے نزدیک سب سے بڑا کام "بے دین حکمرانوں" کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا تاکہ پاکستان میں اسلام کے دیوانی اور فوجداری قانون کو نافذ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے وہ اور ان کی پوری جماعت اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے ٹکراتے رہے۔ ان بے فائدہ قسم کی باہمی لڑائیوں کا یہ فائدہ تو نہیں ہوا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوجاتا۔ البتہ اس اکھیڑ پچھاڑ میں پاکستان کے بہترین امکانات برباد ہوگئے، حتیٰ کہ خود اسلامی تحریک کے سیاسی امکانات بھی۔ کیوں کہ اسلامی حکومت محض مطالبات اور ایجی ٹیشن سے قائم نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بے حد دور رس منصوبہ بندی درکار ہے اور محاذ آرائی کے فضا میں خاموش منصوبہ بندی کی سیاست سوچی بھی نہیں جاسکتی، اس کو چلانا تو درکنار۔

ہمارے مصلحین کے اس سیاسی ذوق کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اسلام، ہر مسلم ملک میں، برسر اقتدار طبقہ کا سیاسی حریف بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کو ٹھیک اسی نظر سے دیکھنے لگے ہیں جیسے امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی کو دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر جب بھی کوئی دعوت اٹھتی ہے، وہ فوراً متوحش ہوجاتے ہیں۔ اسلام کا لفظ، موجودہ حالات میں، ان کے لیے حکمرانوں کو بے اقتدار (Unseat) کرنے کی تحریک کے ہم معنی بن گیا ہے۔ غیر اسلامی لوگوں کے ساتھ کام کرنے والوں کو وہ آزادی دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر اسلام کے علم برداروں کو کام کے مواقع دینے پر راضی نہیں ہوتے۔ کیونکہ موجودہ فضا میں اس کا مطلب، ان کے نزدیک یہ ہے کہ اپنے قتل کے کاغذات پر خود ہی دستخط ثبت کر دیئے جائیں۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کو دوبارہ سر بلند کرنے کے سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ اس فضا کو ختم کیا جائے۔ اسلام کو حکمرانوں کا سیاسی حریف بننے سے بچایا جائے تاکہ مسلم ملکوں کے وسائل اسلامی منصوبوں کے لیے حاصل ہوسکیں۔ اور عالمی سطح پر اسلام کی دعوت و اشاعت کی مہم چلائی جاسکے جس کا زمین و آسمان کو سیکڑوں برس سے انتظار ہے۔

اسلام، اکیسویں صدی میں

''ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ اسلامی فوجیں عرب جزیرہ نما پر چھا گئیں تا کہ محمدؐ کے پیغام کو پھلائیں''نیوز ویک (18رفروری 1974) نے اپنے ایک خصوصی مضمون میں لکھا تھا''اس کے بعد عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار اس قسم کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی زمانہ میں اگر تمام سڑکیں روم کو جاتی تھیں تو آج تمام سڑکیں ریاض کو جارہی ہیں، جہاں ہر روز مغربی قوموں کے نمائندے اتر رہے ہیں تا کہ وہ جدید دنیا کے قارون (شاہ فصل 1975۔1906) سے ملاقات کر سکیں۔'' عرب پٹرول کی طاقت کے بارے میں تفصیلات پیش کرتے ہوئے امریکی میگزین نے اپنا جائزہ اس جملہ پر ختم کیا تھا:

The mountain ,at last is coming to Mahammad.

اس جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد یورپ کی مسیحی قوموں نے ''روحانی کروسیڈ'' شروع کی، تو اس کا ایک جزیہ تھا کہ پیغمبرؐ اسلام کو''بناوٹی پیغمبر'' ثابت کرنے کے لیے فرضی قصے گھڑے جائیں انھیں میں سے ایک جھوٹی کہانی وہ تھی جو اتنی پھیلی کہ مغربی لٹریچر میں ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوگئی۔فرانسس بیکن (1626۔1561) نے اپنے ایک مضمون جرأت (Boldness) میں لکھا ہے۔''ایک جری آدمی محمدؐ جیسے معجزے بار بار دکھا سکتا ہے۔محمدؐ نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنے پاس بلائیں گے اور وہ ان کے پاس آجائے گا۔لوگ اس معجزہ کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔محمد نے پہاڑ کو اپنے پاس آنے کے لیے کہا۔وہ بار بار پکارتے رہے۔جب پہاڑ بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا تو وہ ذرا بھی نہ شرمائے۔اب انھوں نے کہا: اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آیا تو محمد تو پہاڑ کے پاس جا سکتا ہے۔''

آج کی دنیا میں تیزی سے ایک تبدیلی آرہی ہے۔اور اگر ہم گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اس تبدیلی کا رخ اسی منزل کی طرف ہے جس کو امریکی میگزین نے لطیفہ کے طور پر ان لفظوں میں ظاہر کیا تھا۔''پہاڑ بالآخر محمدؐ کی طرف آرہا ہے۔''

جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے:

اسلامی انقلاب کا معاملہ دندانے دار پہیہ Cog Wheel کا سا معاملہ ہے۔ خدا موافق حالات پیدا کر کے اپنے پہیہ کو نکالتا ہے تا کہ اس کے بندے اٹھیں اور اپنے پہیہ کو اس کے ساتھ ملا دیں۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت اپنے آپ کو اس طرح خدائی اسکیم کے ساتھ شامل کر دے تو وہ چیز ظہور میں آتی ہے جس کو اسلامی انقلاب کہتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی کا اسلامی انقلاب اسی قسم کا ایک واقعہ تھا۔ عرب کے علاقہ میں اللہ تعالیٰ نے ملکی اور بین اقوامی سطح پر موافق حالات پیدا کئے۔ اس وقت مہاجرین وانصار نے رسول کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو پوری طرح خدائی اسکیم میں دے دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم الشان انقلاب تھا جس کے اثرات آج تک زمین پر باقی ہیں۔

یہ موافق حالات کیا تھے اور اصحاب رسول نے کس طرح اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا، اس کی تفصیل اس سے پہلے سامنے آ چکی ہے۔ یہاں ہم اس معاملہ کے صرف ایک پہلو کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو انتہائی اہم ہے۔ اور اکثر حالات میں فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی بے موقع جھگڑا (خاص طور پر سیاسی جھگڑا) کھڑا کر کے ایسی نزاکت پیدا نہ کی جائے جس سے سارا بنا ہوا کھیل بگڑ جائے۔

اسلامی تاریخ میں 11ھ اسی قسم کا ایک نازک لمحہ تھا۔ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کا سوال ہوا تو انصار (اہل مدینہ) نے مطالبہ کیا کہ ان کے سردار (سعد بن عبادہ) کو خلیفہ بنایا جائے۔ انصار نے سارے عرب کی دشمن مول لے کر اسلام کے لٹے ہوئے قافلہ کو پناہ دی تھی۔ اپنی اقتصادیات کو اسلام کی راہ میں برباد کیا تھا۔ اسلام کی خاطر ان کی عورتیں بیوہ اور ان کے بچے یتیم ہوئے تھے۔ فطری طور پر وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ خلافت ان کے سپرد کی جائے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا دوسرا گروہ (مہاجرن) اس معاملہ میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا ہے تو انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ خلافت کو دونوں گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک امیر مہاجرین میں سے ہو اور ایک امیر انصار میں سے۔ (منا امر و منکم امیر)

یہ ایک نہایت نازک صورت حال تھی ۔ یہ سیاسی اختلاف اگر باقی رہتا تو مہاجرین اورانصار کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف نکل پڑتیں اوراسلام ہجرت کے گیارہویں سال ہی عرب کے ایک قصبہ (یثرب) میں ختم ہوجاتی ۔ جب جھگڑا بڑھا تو ابوبکر صدیق کھڑے ہوئے۔ آپ نے ایک تقریر کی جس میں مسئلہ کے نازک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ عرب کے حالات میں قریش کی امارت کے سوا کوئی اورامارت قابل عمل نہیں ہے: ولن تعرف العرب هذاالامر الالهذاالحی من قريش (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، قاہرہ 1374، جزء ثانی صفحہ 159) قبیلہ قریش کے سوا کسی اور کی امارت کو عرب کے لوگ نہیں جانتے ۔

اس عملی نزاکت کو تسلیم کرتے ہوئے انصار نے اپنے مطالبہ کو واپس لے لیا۔ وہ سیاسی عہدہ کو مہاجرین کے حوالے کر کے ''محکومی'' پر راضی ہو گئے ۔اس کے بعد آخر تک خلافت کے معاملہ کے لیے ان کی طرف سے کوئی شورش نہیں ہوئی ۔ان کے پورے گروہ میں صرف ایک شخص (سعد بن عبادہ) اس احساس کو اپنے دل سے نکال نہ سکے ۔حتیٰ کہ انھوں نے خلیفہ اول کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ۔مگر انھوں نے بھی احتجاج اور مطالبہ کی کوئی مہم نہیں چلائی ۔وہ اپنے اس احساس کو لیے ہوئے مدینہ سے شام چلے گئے اور وہیں خاموش زندگی گزار کر مر گئے ۔

انصار کا یہ سیاسی ایثار واحد سب سے بڑا عامل ہے جس نے اسلام کو مقامی دائرہ سے نکال کر ایک عالمی واقعہ بنادیا۔خلافت کو اگر وہ ''جمہوری'' بنانے پر اصرار کرتے تو کبھی یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی ۔

بیسویں صدی اسلام کی صدی تھی ،جس طرح ساتویں صدی اسلام کی صدی بنی ۔اللہ نے دوبارہ انتہائی اعلیٰ درجہ کے موافق حالات پیدا کر دیے تھے ۔مگر پوری صدی مسلمانوں نے لاحاصل قسم کے سیاسی جھگڑوں میں گزاردی ۔کوئی گروہ حتیٰ کہ کوئی قابل ذکر فرد بھی نہ اٹھا جو اللہ کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرے ۔اب ہم صدی کے آخر میں ہیں اور خدا بدستور تمام مواقع کو لیے ہوئے اپنے بندوں کے انتظار میں ہے جو اس کے پہیہ کے ساتھ اپنا پہیہ جوڑ دیں ۔اسی واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے پر مستقبل کا انحصار ہے۔ اگر آج ایسا ہو گیا تو

اکیسویں صدی ان شاء اللہ اسلام کی صدی ہوگی۔ اور اگر انسانوں میں ایسے لوگ نہ نکلیں تو عجب نہیں کہ خدا اس کے بعد انسان کے سوا کسی دوسری مخلوق کو اٹھائے اور اس کو حکم دے کہ وہ بول کرامرالٰہی کا اعلان کرے۔ مگر اس میں ہمارے لیے خوشی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کا کام جب غیر انسان انجام دینے لگیں تو یہ خدا کی طرف سے انسان کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ جب خدا کی آواز بلند کرنے کے لیے انسانوں کی زبانیں بند ہوجاتی ہیں، اس وقت دابّہ (نمل۔82) زمین سے نکل کر امرحق کا اعلان کرتا ہے۔ مگر جب دابۃ ارضی کی زبان سے خدا اپنا اعلان کرانے لگے تو یہ خوشی کا نہیں غم کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد زمین وآسمان کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ انسان سے زمین کا سرسبز وشاداب کرہ چھین لیا جاتا ہے اور اس کو دھوئیں اور آگ کی دنیا کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے، جہاں وہ ابدی طور پر ''روتا اور دانت پیستا'' رہے۔

مغلوبیت کا خاتمہ

دوسو سالہ صلیبی لڑائیوں (1271۔1096) میں ناکامی کے بعد مغرب کی مسیحی قوموں نے اسلامی دنیا کے خلاف روحانی جنگ (Spiritual Crusades) کا جو طریقہ نکالا، اس نے انھیں نئی کامیابیوں سے ہم کنار کیا۔ مسلم اسپین میں علمی تحقیق کا جو کام ہو رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے یورپ منتقل ہوگیا۔ اور بالآخر سائنسی اور صنعتی انقلاب کا سبب بنا۔ مغربی قوموں نے جدید علمی اور عملی قوتوں سے مسلح ہوکر سارے عالم اسلام پر قبضہ کرلیا۔ 1799 میں ایک طرف ترکوں کے بیڑے غرق ہونا اور دوسری طرف ٹیپو سلطان کی شہادت، اس تبدیلی کا آخر نقطہ تھا جب کہ مغربی قوموں کا غلبہ اپنے کامل درجہ پر پہنچ گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے خود سائنسی انقلاب کے اندر ایسے عوامل پیدا کردیے جو مغربی قوموں کے خلاف کام کرنے لگے۔ اس کا سب سے پہلا مظاہرہ جدید استشراق کا وجود میں آنا ہے جو ٹامس کارلائل (1881۔1795) سے شروع ہوا۔ سائنسی طرز فکر نے اس مقدس فریب (Pious Fraud) کو بے معنی ثابت کردیا جس نے حقائق کو بگاڑنے اور جھوٹے

واقعات گھڑنے کو سند جواز عطا کر رکھا تھا۔اس طرح سائنس کے ظہور نے وہ ذہنی زمین ہی ختم کردی جس پر قدیم طرز کا استشراق وجود میں آتا تھا۔

پھر انھیں جدید علوم کے بطن سے نیشنلزم اور ڈیموکریسی جیسے نظریات برآمد ہوئے جنھوں نے نوآبادیاتی نظام کو فکری حیثیت سے بے بنیاد ثابت کر دیا۔قومی اقتدار اور عوامی حکومت کے تصورات خود مغرب سے درآمد ہو کر ان مشرقی مقبوضات میں پہنچے اور آزادی کی تحریکوں کے لیے نظریاتی ہتھیار بن گئے۔اس کے بعد صنعتی نظام کی پیدا کردہ دو عالمی جنگوں نے مغربی قوموں سے طاقت کی منطق بھی چھین لی۔اس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جن میں ایشیا اور افریقہ کے تمام محکوم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہوتے چلے گئے۔

اس سلسلے کا آخری واقعہ عرب پٹرول کا ظہور ہے۔اس نے مغربی قوموں سے اقتصادی برتری کی حیثیت بھی چھین لی جو آخری طور پر ان کے پاس باقی رہ گئی تھی۔پٹرول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں کی صنعتی پس ماندگی کی تلافی اتنی عالی شان سطح پر کی ہے کہ اب خود صنعتی ممالک ان کے مقابلہ میں دفاع کی پوزیشن میں چلے گئے ہیں۔

اسلام کی اعتباریت (Credibility)

دوسری اہم چیز جو موجودہ زمانہ میں وقوع میں آئی ہے، وہ ایسے علمی حالات ہیں جنھوں نے حیرت انگیز طور پر اسلام کی اعتباریت ثابت کردی ہے۔اس کا ایک پہلو تاریخی اعتباریت (Historical Credibility) ہے جدید دور میں مختلف مذاہب کا مطالعہ خالص مورخانہ انداز سے کیا گیا ہے۔اس سے ثابت ہوا ہے کہ تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تاریخی طور پر معتبر ثابت ہوتا ہے۔باقی تمام مذاہب، خالص تاریخی اعتبار سے، روایتی افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔مسیحیت، اسلام کے ماسوا، سب سے قریبی دور کا مذہب ہے۔مگر اس کا حال یہ ہے کہ اناجیل کے باہر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔حضرت مسیح، ہمارے ایمان کے مطابق، بلاشبہ اللہ کے رسول تھے۔مگر جہاں تک مدون تاریخ کا تعلق ہے، آپ کی زندگی کے بارے میں ایسے کافی شواہد موجود نہیں ہیں جو معروف تصور کے مطابق آپ کو ایک ''تاریخی شخصیت'' کا مقام دے سکیں۔اٹھارویں صدی

کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے شروع تک بہت سے محققین سرے سے مسیح کے وجود ہی کے منکر تھے۔ کیوں کہ انجیل کے علاوہ ،جس کا استناد خود مشتبہ ہے، حضرت مسیح کی معاصرانہ تاریخ میں آپ کا کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔تاہم موجودہ صدی کے نصف آخر میں چند ایسے قدیم ماخذ تلاش کر لیے ہیں جن میں مسیح کے نام کا حوالہ، اگر چہ مبہم اور مجمل شکل میں، موجود ہے۔ مگر وہ اتنا نا کافی ہے کہ انسائیکلو پیڈیا برنا ٹیکا(1977) کے مقالہ نگار کو کہنا پڑا:

It is difficult to write with certainty an authentc life of Jesus.
vol.10p,145.

مسیح کے مستند حالات تیقن کے ساتھ لکھنا ایک مشکل کام ہے۔

تاہم جہاں تک پیغمبر اسلام کا تعلق ہے، آپ کی زندگی کے بارے میں جب کوئی شخص لکھتا ہے تو اس کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے:

Mohammad was born within the full light of history
The Encyclopedia American (1961) Vol.19p, 292

محمد تاریخ کی مکمل روشنی میں پیدا ہوئے۔

دوسرا اہم پہلو وہ ہے جس کو علمی اعتباریت (Scientific Credibility) کہہ سکتے ہیں ۔موجودہ زمانہ میں جو علمی حقائق دریافت ہوئے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر جب مذاہب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو، اسلام کے سوا، ہر مذہب میں ان کے ساتھ اتنی عدم مطابقت پائی جاتی ہے کہ ان مذاہب کی علمی صداقت پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر میں صرف ایک حوالہ نقل کروں گا۔

ایک امریکی سائنس داں والٹر آسکر لنڈ برگ (Walter Oscar Lundberg) نے اس پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ایک سائنس داں، دوسروں کے مقابلہ میں، ایک خصوصی موقع (Special Advantage) اس بات کا رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچائی کو سمجھ سکے۔ وہ اساسی اصول جس پر اس کے کام کی بنیاد ہے، وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار (An Expression of God's Existence) ہے۔'' اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہو جاتے ہیں، امریکی پروفسر کے نزدیک، دو میں سے

ایک خاص سبب اس کا یہ ہے:

In organized Christianity, there is instilled deeply in young pepple a concept of God created in the image of man, rather than of man creted in the image of God .When such minds are later trained in science, this reversed and limited anthropomorphic concept gra-dually becomes more and more incompatible with the rational, inductive attitude of science ,ultimately , when all attempts at reconciliation fail, the concept of God may be abandoned entirely.

The Evidonce of God in an Expanding Universe, Edited by john Clover Monsma, pocket books Distributing co. Bombay, 1968, p.56

ترجمہ: عیسائیت کے نظام میں نوجوان لوگوں میں نہایت گہرائی سے ایک ایسے خدا کا تصور بٹھایا گیا ہے جو انسان کی صورت میں ظاہر ہوا، بمقابلہ اس کے کہ ایسے انسان کا تصور بٹھایا جائے۔ جو خدا کی صورت میں پیدا کیا گیا ہو۔ اس طرح کے ذہن بعد کو جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو یہ الٹا اور محدود انسانی تصور خدا تدریجی طور پر سائنس کے عقلی اور استقرائی نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ غیر مطابق نظر آنے لگتا ہے۔ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ جب روایتی عقیدہ اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں تو وہ خدا کا تصور بالکل ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

مگر اسلام کا معاملہ مکمل طور پر ایک مستثنیٰ معاملہ ہے۔ اس کی تعلیمات تمام ثابت شدہ حقائق ہیں اور علمی جانچ میں پوری اترتی ہیں۔ حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید علم پورا کا پورا اسلام کا علم کلام ہے۔ یہ واقعہ، علمی حیثیت سے، اسلام کا قابل اعتبار ہونا ثابت کرتا ہے۔ اگر اسلام کسی غیر معتبر ماخذ سے نکلا ہوتا۔ یا دوسرے قدیم مذہبوں کی طرح اس میں انسانی ملاوٹ شامل ہوگئی ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ جدید حقائق کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔

جدید اسلوب میں اسلام کا اعلان واظہار:

صحیحین کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن نبی من الانبیاء الاوقداوتی من الآیات ماآمن علیٰ مثله البشر ،وانما کان الذی اوتیته وحیا اوحاه الله الیّ فارجوان اکون اکثرهم تابعا یوم القیامة

ہر نبی کو ایسی نشانیاں دی گئیں جن کے مثل چیزوں پر ان کے زمانہ کے لوگ ایمان رکھتے تھے۔ اور مجھ کو جونشانی دی گئی وہ وحی ہے جو اللہ نے میری طرف بھیجی ۔ پس مجھے امید ہے کہ میرے متبعین قیامت کے دن سب سے زیادہ ہوں گے۔

حضرت داؤد کے زمانہ میں موسیقی کا زور تھا۔ اس لیے آپ کو ''لحن'' میں عام انسانوں سے برتر بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جادو کا زور تھا، اس لیے آپ کو ''عصا'' کا معجزہ دیا گیا جس نے تمام جادوگروں کے جادوؤں کو نگل لیا۔ حضرت مسیح کے زمانہ میں طب کا زور تھا، اس لیے آپ کو شفاء امراض کی برتر صلاحیت عطا کی گئی ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ادب کا زور تھا، اس لیے آپؐ کو ایک برتر کلام عطا کیا گیا۔ جو اپنی فصاحت وبلاغت میں وقت کے تمام ذخیرۂ ادب پر بھاری ثابت ہوا۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ اس قسم کی معاون قوت کو جمع کیا جائے ۔ یہ قوت کسی قسم کی طلسماتی کرامت نہیں۔ بلکہ جدید استدلال انداز ہے جس کو عام طور پر سائنٹفک استدلال کہا جاتا ہے ۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو وقت کے سائنٹفک اسلوب میں مرتب کیا جائے ۔ اسلام کی تعلیمات کے ساتھ سائینٹفک اسلوب کا اجتماع ،آج کے حالات میں، وہی معنی رکھتا ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تورات کے ساتھ عصا کے اجتماع کا تھا۔ اسی کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ اسلام مسلمانوں کے اندر روایتی عقیدہ کے بجائے فکری انقلاب بن کر داخل ہو اور ان میں حقیقی دینی زندگی پیدا کرے۔ پھر اسی کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ غیر مسلم اقوام میں اسلام کا وہ اعلان واظہار ہو سکے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

پیغمبر آخر الزماں کو جو معجزہ دیا گیا، وہ لسان مبین (شعراء 195) کا معجزہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپؐ کی دعوت کے ساتھ جو اعجازی تائید شامل کی گئی، وہ دعوت سے الگ کوئی

چیز نہ تھی جو آپؐ کی وفات کے بعد دنیا میں باقی نہ رہے۔ آپؐ کو دی جانے وال وحی باعتبار تعلیم آپ کی دعوت تھی اور باعتبار اسلوب آپؐ کا معجزہ۔ اس طرح اللہ نے اپنی رحمت خاص سے یہ انتظام کر دیا کہ اسلام کے پیغام کو ہر دور میں پیغمبرانہ قوت کے ساتھ پیش کیا جاسکے قرآن کی شکل میں جس طرح پیغمبر اسلام کی وحی محفوظ ہے، اسی طرح آپؐ کو دیا جانے والا معجزہ بھی محفوظ ہے۔ بعد کے دور میں اٹھنے والے داعیوں کے لیے پوری طرح ممکن ہے کہ وہ قرآن کو اسی طرح اعجازی سطح پر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں جس طرح صدر اول میں وہ عربوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

قرآن کی لسان مبین، ابتدائی صدی کے بعد، شعر و خطابت کی زبان اور فلسفیانہ اصطلاحات میں گم ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ خود اسلامی لٹریچر کا بڑا حصہ اسی غیر قرآنی زبان میں مرتب ہوگیا۔ اب حالات نے وہ دور ہی ختم کر دیا ہے جس میں لوگ شعر و خطابت یا فلسفہ و منطق کی زبان میں کلام کرنا پسند کرتے تھے۔ آج کا غالب اسلوب سائنٹفک اسلوب ہے اور وہ بنیادی طور پر وہی ہے جس میں پیغمبرؐ اسلام نے چودہ سو برس پہلے خدا کے دین کو پیش کیا تھا۔ اگر دین کو براہ راست قرآن و سنت سے اخذ کیا جائے اور اس کو آج کی زبان (لسان قوم) میں سائنٹفک اسلوب (لسان مبین) کے ساتھ مرتب کر دیا جائے تو اتنا جاندار کلام تیار ہوگا کہ، عصائے موسیٰ کی طرح، اس کا ظہور ہی دوسرے تمام خیالات و نظریات کو باطل قرار دینے کے لیے کافی ہو۔

سائنٹفک اسلوب کو لفظوں میں متعین کرنا مشکل ہے۔ تاہم سمجھنے کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنٹفک اسلوب کا مطلب انسانی مسائل کو کائناتی زبان میں بیان کرنا ہے۔ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے، وہ اتنے محکم اصولوں پر مبنی ہے کہ اس کو ریاضیاتی قطعیت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ قطعیت کی یہی زبان جب انسانی مسائل کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جائے تو اس کو سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ ''ایک شخص کا دولت مند بننا کسی دوسرے شخص کے افلاس کی قیمت پر ہوتا ہے۔'' اس بات کو سائنٹفک انداز میں بیان کرنے کی صورت یہ کہ متعلقہ اعداد شمار جمع کیے جائیں اور حقیقی واقعات کے حوالے سے اس کو واضح

کیا جائے۔مگر شاعر کو اس قسم کی زحمت میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ایک لفظی مشابہت کا ہاتھ آجانا اس کے نزدیک اس کا حق ادا کرنے کے لیے کافی ہے نظیری کہتا ہے:

زمانہ گلشن عیشِ کرا بہ یغما داد　　　　که گل به دامن ما دسته دسته می آید

قدیم زمانہ میں یہ شاعرانہ اسلوب تمام دنیا میں رائج تھا۔قرآن پہلی کتاب ہے جس نے معلوم تاریخ میں انسان کو سائنٹفک طرز کلام سے متعارف کرایا۔قرآن نے پہلی بار دور نثر کا آغاز کیا۔علمی طرز فکر کی بنیاد رکھی۔واقعاتی استدلال کو رائج کیا۔موجودہ دور کا علمی انقلاب،قرآن ہی کے پیدا کردہ انقلاب کا ایک سیکولر نتیجہ ہے۔مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے حاملین اس انقلاب کو سمجھنے میں سب سے پیچھے ہیں۔وہ ابھی تک شعر وشاعری کی فضا سے نکل نہ سکے حتیّٰ کہ ان کی نثر بھی خطابت اور شاعری کی ایک صورت ہوتی ہے۔سائنٹفک استدلال میں ان کے پیچھے ہونے کا حال یہ ہے کہ ان کے علماء اب بھی سائنٹفک استدلال اور مغرب زدگی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی پس ماندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دور جدید کے معیار فکر پر ابھی تک اسلام کا علمی اظہار نہ ہوسکا۔ ہر دور کا ایک اسلوب اور ایک علمی معیار ہوتا ہے،اور ہر دور کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دور کے معیار فکر پر خدا کے دین کا اعلان عام کریں۔مگر مسلمان جب خود ہی فکری پس ماندگی میں مبتلا ہوں تو وہ اس ذمہ داری کو کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔مسلمانوں کی ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کو کتاب تلاوت بنا رکھا ہے اگر وہ اس کو کتاب تدبر (مومنون۔68) اور کتاب تبلیغ (مائدہ۔67) سمجھتے تو قرآن ان کی اپنی زندگیوں میں بھی داخل ہوتا اور ان کو یہ بھی بتاتا کہ وہ اس کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے کس طرح پیش کریں۔

فکری ڈھانچہ

ہر دور کا ایک فکری ڈھانچہ ہوتا ہے۔آدمی اسی فکری ڈھانچہ میں سوچتا ہے اور اسی کے مطابق چیزوں کو اپنے لیے قابل فہم بناتا ہے۔روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس

(1956) میں خروشچیف نے اشترا کی دنیا کے جن ''جہنمی حالات'' کا انکشاف کیا تھا۔اس کے بعد سابق امریکی کمیونسٹ ہوورڈ فاسٹ (1914) نے کمیونزم سے علیٰحدگی اختیار کرلی ۔اس نے اپنے بیان میں کہا تھا۔''میں خود اپنے فکری ڈھانچہ میں کمیونسٹ بنا۔'' مارکس کی نظریاتی تشریح نے اس کو کمیونسٹ نہیں بنایا تھا۔وہ ایک انسانیت دوست آدمی تھا اور اس ذہن کے تحت کمیونسٹ بن گیا تھا کہ یہ ظلم اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے ۔مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ ''مزدور ڈکٹیٹر شپ میں پہلے سے بھی زیادہ، شدید شکل میں سماجی ظلم جاری ہے، تو اس نے کمیونزم کو چھوڑ دیا ____ ہوورڈ فاسٹ اپنے فکری ڈھانچہ ہی میں کمیونزم کو لے سکتا تھا۔جب کمیونزم اس کو اپنے فکری ڈھانچہ میں نہیں ملا تو وہ اس کے لیے قابل قبول نہ رہا۔

قدیم زمانہ میں عام طور پر دو قسم کے فکری ڈھانچے دنیا میں رائج تھے۔ایک مشرکانہ ،دوسرا فلسفیانہ۔مشرکانہ فکری ڈھانچہ اس مفروضہ پر عمل کرتا تھا کہ دنیا کی ہر نمایاں چیز اپنے اندر خدا کا ایک ''انش'' لیے ہوئے ہے، وہ خدائی ہستی کی ایک توسیع ہے۔اسی طرح فلسفیانہ فکر ذہنی قیاسات پر قائم تھا۔یونان میں اس فلسفہ نے ترقی پا کر قیاسی منطق (Syllogism) پیدا کی۔پچھلے زمانہ میں پیغمبروں کے لائے ہوئے دین میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، وہ انھیں فکری ڈھانچوں کے رواج عام کی وجہ سے تھیں ۔اس کی ایک مثال موجودہ مسیحیت ہے۔ حضرت مسیح وہی سادہ اور فطری دین لے کر آئے جو قرآن میں ہم کو نظر آتا ہے۔مگر آنجناب کے بعد آپ کے پیروؤں نے زمانی فکری ڈھانچہ سے متاثر ہو کر مسیحیت کو شرک اور فلسفہ کا ایک آمیزہ بنا دیا۔''ابن اللہ'' کا تصور مشرکانہ فکر سے متاثر ہونے کی وجہ سے مسیحت میں شامل ہوا۔ اسی طرح کفارہ کے عقیدہ کے لیے قدیم فلسفیانہ فکر نے زمین فراہم کی۔

ساتویں صدی میں اسلام کے عظیم انقلاب کے باوجود مشرکانہ فکری ڈھانچے دنیا سے ختم نہ ہو سکے ۔اس کی وجہ سے اسلام، مختصر ابتدائی وقفہ کے بعد، بار بار مضاہاۃ (توبہ۔30) کا شکار ہوتا رہا۔قرآن کی صورت میں اسلام کا الٰہی متن اگرچہ مکمل طور پر محفوظ تھا،مگر مسلمان قومیں عملی اسلام کو مروجہ افکار کے نقشہ میں ڈھالتی رہیں۔ زندہ اور مردہ بزرگوں کا مرکز عقیدت بننا جو مختلف صورتوں میں اسلام میں رائج ہوا، وہ مشرکانہ فکر سے متاثر ہونے کی مثال

ہے۔اسی طرح علم فقہ اورعلم کلام، قیاسی منطق سے متاثر ہونے کی مثال۔موجودہ زمانہ میں اسلام اس قسم کی تیسری اثر پذیری سے دوچار ہوا ہے۔یہ ’’نظامی طرزفکر‘‘ ہے۔انیسویں صدی میں، صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں، سیاسی اور معاشی اصطلاحوں میں سوچنے کا رواج ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کو بھی سیاسی نظام اور معاشی نظام کی صورت میں پیش کرنا شروع کردیا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام جو حقیقۃً تعمیر آخرت کا موضوع تھا، تعمیر دنیا کا موضوع بن کر رہ گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا کا مروجہ ڈھانچہ اور قرآن کا فکری ڈھانچہ دونوں ایک ہوگئے ہیں۔قرآن کا فکری ڈھانچہ برہانیات پر قائم ہے۔ وہ حقائق اور واقعات کی بنیاد پر بنتا ہے۔موجودہ زمانہ میں سائنسی طرزفکر اسی کی علمی صورت ہے۔اس کے رواج نے تاریخ میں پہلی بار انسانی فکر اور قرآنی فکر کی دوئی کو ختم کردیا ہے۔ انسان کی فکری زمین آج وہی برہانیاتی زمین ہے جو قرآن کی زمین ہے۔آج یہ ضرورت نہیں کہ اسلام کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کی خاطر کسی دوسرے فکری ڈھانچہ کا سہارا لیا جائے۔آج ہم کو صرف یہ کرنا ہے کہ قرآن کو اس کی اپنی برہانیاتی زبان (نساء174) میں پیش کردیں۔یہی اس کو لوگوں کے نزدیک قابل قبول بنانے کے لیے کافی ہوگا۔

ایک پروفیسر سے راقم الحروف کی اسلام کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی۔میری زبان سے نکلا:

(Islam means Realism)

اسلام کا مطلب ہے، حقیقت پسندی، وہ اسلام کی اس تشریح سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا: ’’اسلام اگر حقیقت واقعہ سے مطابقت کا دوسرا نام ہو، تو کون ہوگا جو اس کا انکار کرے گا۔‘‘ اسلام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی صورت واقعہ کو تسلیم کرلے۔سوچ کا معاملہ ہو یا عمل کا، آدمی وہی کرے جو عالم خارجی کے تقاضوں کے مطابق ہو:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (آل عمران۔83)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور طریقہ کو چاہتے ہیں حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے اور ناخوشی سے۔

سائنس اس قسم کے ایک ''دین'' کے لیے بہترین ذہنی زمین فراہم کرتی ہے۔ سائنس، یعنی علوم قطعیہ (Exact Sciences) اپنی عین فطرت کے مطابق قطعیت فکر (Exact Thinking) یا صحت فکر (پرسائز ڈ تھنکنگ) پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک ذہن کے لیے اسلام کی بات اسی طرح قابل فہم بن جاتی ہے جس طرح ایک قانون پسند آدمی کے لیے ایک قانونی نکتہ۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی مجلس میں خدا کے وجود پر بحث ہو رہی تھی۔ مسئلہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ بستی میں ایک بزرگ تھے۔ جب بحث لمبی ہوگئی تو کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ ہماری مجلس میں چلیں اور ہماری مدد فرمائیں۔ وہ اپنے حجرے سے نکل کر آئے۔ مگر مجلس کے سامنے انھوں نے کوئی لمبی تقریر نہیں کی۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے یہ آیت پڑھی:

افی اللہ شك فاطر السموات والارض

اور اٹھ کر چلے آئے۔ بحث ختم ہوگئی۔ لوگ خدا کے وجود کے قائل ہو گئے۔

سیکڑوں برس پہلے جس چیز نے لوگوں کو مطمئن کیا تھا، وہ آیت کا ادبی زور یا قیاسی استدلال تھا۔ یعنی یہ کہ جب ایک کائنات ہے تو اس کا پیدا کرنے والا بھی ہونا چاہئے۔ تاہم آج کے انسان کے لیے اس کے اندر ایک زبردست واقعاتی استدلال موجود ہے۔ ''فاطر'' کے معنی عرب زبان میں ہیں، پھاڑنے والا۔۔۔ آج کا انسان جس زمین و آسمان سے واقف ہے، وہ ایک پھیلتی ہوئی کائنات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات ابتداءً سکڑی ہوئی تھی۔ پھر پھاڑی گئی۔ اُس وقت اس کے تمام اجزاء (ایٹم) اندر کی طرف بے پناہ طاقت کے ساتھ کھنچے ہوئے تھے اس واحد مجموعۂ مادہ (سپر اٹم) کے سمٹاؤ کا پھٹ کر بیرونی خلا میں منتشر ہونا کسی خارجی قوت کی مداخلت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پندرہ بلین سال پہلے اس سپر ایٹم میں اخراج طاقت (Energy Release) کا ایک واقعہ ہوا اور اس

کے بعد کائنات اپنے چاروں طرف سے پھیلنے لگی۔۔۔۔کل کا انسان جس خدا کی ہستی کو قیاس کے تحت سمجھتا تھا، آج کے انسان کے لیے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس کو واقعات وحقائق کی روشنی میں سمجھ لے۔

عرب میں اسلام کو سربلند کرنے کے لیے جو طریق عمل اختیار کیا گیا، اس کو قرآن میں اطراف ارض کو گھٹانے کے عمل (رعد۔41) سے تعبیر کیا گیا ہے۔یعنی حریف سے یکبارگی لڑ پڑنے کے بجائے دھیرے دھیرے اس کی دنیا میں داخل ہونا۔ یہ بات قدیم زمانہ میں زیادہ تر اخلاقی طور پر ہی سمجھی جاسکتی تھی۔آج وہ ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر قابل فہم بن گئی ہے۔ کیونکہ آج کا انسان جن بڑے بڑے منصوبوں کا تجربہ کر رہا ہے، وہ اس کے سوا کسی اور طریقے سے مکمل ہی نہیں کئے جاسکتے۔

والٹر شیرا(Walter M.Schirra)ایک امریک خلاباز ہے۔ وہ انسان سوار تین خلائی کشتیوں پر بالائی خلا کا سفر کر چکے ہیں۔ستمبر ۱۹۷۲میں وہ ایک عالمی دورہ کے تحت ہندستان آئے تھے۔ایک تقریر میں انھوں نے امریکہ کی خلائی مہم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

The technology that essentially permitted us to get into space was a nibbling project. We did one thing at a time.....We took small steps instead of giant steps. The giant step was finally taken, of course
Link Weekly (Delhi) October 22,1972

وہ ٹکنالوجی جس نے بنیادی طور پر ہم کو خلا میں داخل ہونے کا موقع دیا، وہ تھوڑا تھوڑا آگے بڑھنے کا منصوبہ تھا۔ہم نے ایک وقت میں صرف ایک کام کیا۔ہم نے چھوٹے چھوٹے اقدامات کئے۔ ایسا نہیں کیا کہ یکبارگی بڑا قدم اٹھادیں۔ بلاشبہ بڑا قدم اٹھایا گیا۔ مگر سب سے آخر میں۔

اسلام نے تدریجی عمل کی تلقین کی تھی۔ مگر شاعری اور تلوار کے زمانہ کا انسان اس کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔سائنس کے دور میں اس قسم کا عمل ایک ایسی ٹکنکل ضرورت بن چکا ہے جس کے بغیر کوئی نتیجہ خیز کام کیا ہی نہیں جاسکتا۔آج کے سائنسی انسان کے لیے

اسلام کا طریق عمل، پچھلے دور کے انسان کے مقابلہ میں، زیادہ بہتر طور پر قابل فہم بن چکا ہے۔

1965 کی بات ہے۔ لکھنؤ میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ اور برٹرینڈ رسل پر ریسرچ کی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پورے طور پر ملحد ہو چکے تھے۔ ایک روز گفتگو کے دوران انھوں نے کہا:

خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائیٹیر ن (معیار استدلال) کیا ہے۔

میری زبان سے نکلا: ''وہی کرائیٹیر ین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔'' ایک جملہ انھوں نے کہا۔ ایک جملہ میں نے۔ اور اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔ اس کی وجہ مخاطب کا سائنٹفک ذہن تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے، وہ اتنی پیچیدہ ہے کہ کسی چیز پر بھی براہ راست دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیے بالواسطہ استدلال، بالفاظ دیگر استنباطی استدلال، کے سوا چارہ نہیں اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں عقلی مشکلات صرف اس وقت تک ہیں جب تک براہ راست استدلال پر اصرار کیا جائے۔ استنباطی استدلال کو جائز استدلال تسلیم کرنے کے بعد خدا کے وجود کو ثابت کرنا اتنا ہی یقینی بن جاتا ہے جتنا کسی دوسری معلوم چیز کے وجود کو ثابت کرنا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا ذہنی ڈھانچہ، ابتدائی زمین کی حد تک، کتنا زیادہ اسلام کے موافق ہو چکا ہے۔ اسلام کا پیغام، آج کے انسان کے لیے، تاریخ کے تمام معلوم زمانوں سے زیادہ قابل قبول ہو چکا ہے۔ آج ساری ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلام کو، تمام انسانی اضافوں سے الگ کرکے، اس کی بے آمیز شکل میں لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد اس واقعہ کو ظہور میں آنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی کہ ''کوئی خیمہ یا مکان نہ بچے جہاں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو'' اور کوئی سینہ نہ ہو جس کے اندر اسلام کی فطری آواز نے اپنی جگہ نہ بنالی ہو۔

سادہ تعارفی لٹریچر

''اگر مسلمان صرف اتنا کریں''ایک غیر مسلم نے کہا''کہ وہ کلمہ شہادت اوراذان اورنماز کے ترجمے تمام زبانوں میں چھاپ کر پھیلا دیں تو دنیا کی آدھی آبادی اسلام کی گرویدہ ہوجائے۔'' یہ کہہ کر مذکورہ غیر مسلم دراصل موجودہ زمانہ کی روح کی ترجمانی کررہا تھا۔موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی مسلم تحریکوں نے اگرچہ حالات کوصرف بگاڑنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ تاہم اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے حیرت انگیز طور پر مخالف حالات کے اندر سے موافق حالات پیدا کردئے۔مختلف عالمی اسباب نے آج کے انسان کومجبور کیا ہے کہ وہ مذہب کی طرف لوٹے اوراز سرنو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔اس نئے رجحان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آج کا انسان سادہ طور پر صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ مذہب کی اصل تعلیم کیا ہے وہ استدلال یا توجیہہ وغیرہ سے زیادہ غرض نہیں رکھتا۔

موجودہ زمانہ میں ان گنت اسلامی کتابیں لکھی اور چھاپی گئی ہیں۔مگرایسی کتابیں تقریباً صفر کے درجہ میں ہیں جن میں تعبیری اورکلامی بحثوں کے بغیر اسلام کوویسا ہی بیان کیا گیا ہوجیسا کہ وہ اپنے متن میں ہے۔آج مسلمانوں کا سب سے بڑادعوتی فرض یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے ترجمے (بغیر کسی تشریح کے) تمام قوموں کی زبانوں میں چھاپ کر پھلائیں۔اسی طرح رسولؐ اوراصحاب رسول کی زندگیوں پر بالکل سادہ انداز کی واقعاتی کتابیں (کسی بھی قسم کے تعبیری یا کلامی اضافہ کے بغیر) تیار کی جائیں اور ہرزبان میں شائع کرکے ان کوتمام قوموں تک پہنچایا جائے۔یہ کام اگراعلیٰ معیار کے ساتھ منظم طریقے پر ہونے لگے تو ساری دنیا میں ایک نئی فضا پیدا ہوجائے گی اوردونسل بھی نہیں گزرے گی کہ خدا کا دین دوبارہ خدا کی زمین پر اپنا مقام حاصل کرلے گا۔

جدید مواقع

موجودہ زمانہ میں دوچیزیں بیک وقت وجود میں آئی ہیں۔ایک، اظہار رائے کی آزادی۔دوسرے، ذرائع ابلاغ کی ترقی۔موجودہ زمانہ میں ایک طرف، کم ازکم غیر کمیونسٹ

دنیامیں، اظہار رائے کے حق کو انسان کا بنیادی حق تسلم کرلیا گیا ہے جس کو کسی طرح چھینا نہیں جاسکتا۔ ہندستان میں ایمرجنسی کے زمانہ (جون 1975 تا مارچ 1977) میں اظہار رائے کے حق کو سلب کرلیا گیا تھا۔ مگراس کے خلاف اتنا زبردست طوفان اٹھا کہ پابندیاں عائد کرنے والی حکومت پہلے ہی الیکشن میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جو وجود میں آئی، وہ پریس ہے۔ پریس کی ترقی نے موجودہ زمانہ میں اس کو ممکن بنادیا ہے کہ کسی خیال کو نہایت تیزی سے انسانی آبادی میں پھیلایا جاسکے۔ حضرت مسیح دو ہزار برس پہلے فلسطین کی ایک بستی (ناصرہ) میں آئے۔ وہ ایک عظیم انسان اور عظیم پیغمبر تھے۔ مگران کی آواز مقامی آبادی سے باہر بمشکل کسی شخص تک پہنچ سکی۔ آج کوئی بھی شخص جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے بیک وقت اپنی آواز ساری دنیا میں پہنچا سکتا ہے۔

ان امکانات نے ہمارے لیے مواقع کار کا نیا میدان کھول دیا ہے۔ اگر حکمرانوں سے سیاسی رقابت پیدا کرنے کی غلطی نہ کی جائے تو آج بلا روک ٹوک اسلام کی دعوت واشاعت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف جدید ذرائع نے اس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ تمام دنیا کو بیک وقت اسلام کا مخاطب بنایا جاسکے اور خدا کی آواز خدا کی زمین کے گوشے گوشے میں اس طرح پہنچادی جائے کہ کوئی کان نہ رہے جس نے اس کو سنا نہ ہو۔ کوئی آنکھ نہ ہو جس نے اس کو دیکھا نہ ہو۔

فکری زمین

موجودہ زمانہ میں لوگ اسلام کے سیاسی انقلاب کا نعرہ لے کر اٹھے، نیت کے اعتبار سے خواہ وہ کتنے ہی مخلص ہوں، عملاً ان کی تحریک نے اصل معاملہ کو صرف بگاڑنے کا کام انجام دیا ہے۔ سیاسی انقلاب ہمیشہ فکری زمین پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کے حق میں یہ فکری زمین، کم از کم امکانی طور پر، پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ اب ان کا کام یہ تھا کہ اپنے عمل کے ذریعہ ان فکری امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دیتے۔ مگرانھوں نے غیر ضروری

قسم کے سیاسی جھگڑے چھیڑ کر اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیں۔ یہ کہنا بمشکل مبالغہ ہوگا کہ بیسویں صدی کی اسلامی سیاسی تحریکیں اگر وجود میں نہ آئی ہوتیں تو اسلام کے سیاسی امکانات آج کہیں زیادہ روشن ہوتے۔

اس معاملہ کو ہندستان کی آزادی کی تحریک کی مثال سے سمجھئے۔

قدیم دنیا میں سیاست وحکومت ''شاہی محل'' کا معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص بھی طاقت کے زور پر شاہی محل پر قابض ہوجائے، وہ ملک کا جائز حکمراں بن جاتا تھا۔ یہ حالات تھے جس میں انگریز اس ملک میں داخل ہوئے۔ صنعتی انقلاب نے ان کی مدد کی۔ جس طرح 1546 میں بابر نے اپنے توپ خانہ کے ذریعہ کامیابی حاصل کی تھی، انگریز نے 1857 میں مشینی طاقت سے مسلح ہوکر ہندستان کے اقتدار پر اپنے قبضہ کو مکمل کرلیا۔

مگر جس سائنس نے انگریزوں کو مادی طاقت دی تھی، اسی سائنس کے بطن سے وہ سماجی اور سیاسی علوم پیدا ہوئے جنھوں نے قدیم فکری زمین کو بدلنا شروع کیا۔ ان علوم نے جمہوریت کا تصور پیدا کیا جس کے بعد شاہی حکمرانی ایک بے دلیل چیز بن کر رہ گئی۔ انھوں نے نیشنلزم کو ترقی دی جس نے کسی ملک کے لیے اس حق کا خاتمہ کردیا کہ وہ دوسرے ملک کے اوپر حکومت کرے، اس طرح ہندستان کے مغربی حکمراں خود اپنے ہی پیدا کردہ افکار کے نتیجہ میں، بیسویں صدی میں اس فضا سے محروم ہوگئے جس نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان کو اپنے نوآبادیاتی نظام کے لیے موافق فکری زمین فراہم کی تھی۔

تاہم موجودہ صدی کے نصف اول میں ہندستان میں جو لوگ سیاسی آزادی کا نعرہ لے کر اٹھے، وہ اس فکری زمین کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ اک طرف سبھاش چندر بوس (1945-1895) اور دوسری طرف محمود حسن دیوبندی (1920-1851) جیسے ہزاروں لوگوں نے اپنی زندگیاں قربان کردیں۔ مگر ہندستان کو آزاد بنانے کے لیے ان کی کوششیں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریز کو اسلحہ کے میدان میں چیلنج کررہے تھے۔ اور اسلحہ کا میدان وہ تھا جہاں ان کا حریف اب بھی ان کے اوپر فیصلہ کن حد تک فوقیت رکھتا تھا۔

مہاتما گاندھی (1948-1869) پہلے شخص ہیں جنھوں نے حالات کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا اور اس راز کو سمجھا کہ حصول آزادی کے لیے ہمارا طریق عمل بالکل الٹا نتیجہ پیدا کررہا ہے۔ ان کے مغربیات کے مطالعہ نے انھیں بتایا کہ دنیا کی سیاسی تاریخ اک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ انگریز اس فکری زمین سے محروم ہو چکا ہے جواب تک اس کو ہندستان میں حکمرانی کا حق دیئے ہوئے تھا۔ تاہم ہمارا متشددانہ طریق کار اس کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ مسلح تصادم کے ذریعہ پیدا شدہ غیر ضروری مسائل کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد خود بخود جمہوریت اور نیشنلزم کے فکری عوامل ابھر آئیں گے اور انگریز کو سیاسی طور پر بے جگہ بنا دیں گے۔

مہاتما گاندھی ۱۹۱۵ میں افریقہ سے ہندستان آئے اور 1920 کے ناگ پور اجلاس کے بعد کانگریس کے غیر متنازعہ لیڈر بن گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ ہندستان کی آزادی کی تحریک ہنسا (تشدد) کے بجائے اہنسا (عدم تشدد) کی بنیاد پر چلائی جائے گی۔ یہ اعلان انگریز کے لیے پچھلی دہشت پسند تحریکوں سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ تشدد کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا ان کے پاس کافی وجہ جواز تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عدم تشدد کے اصول پر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں۔ کہا جاتا ہے کہ جب صورت حال سامنے آئی تو ایک انگریز کلکٹر نے سکریٹریٹ کو تار دیا:

Kindly wire instruction how to kill a tiger non-violently.

برائے مہربانی بذریعہ تار ہدایات دیجئے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے۔ تشدد اور مار دھاڑ کا ماحول ختم ہوتے ہی فکری عوامل اپنا کام کرنے لگے۔ نیشلزم اور جمہوریت کے عصری نظریات نے انگریز کو اس کی سیاسی زمین سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ انگریز کو اس ملک سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ تشدد کے محاذ پر ہاری ہوئی جنگ، عدم تشدد کے محاذ پر جیت لی گئی۔

ایسی ہی کچھ صورت حال آج اسلام کے ساتھ پیش آرہی ہے۔ اسلام کے احیاء کے لیے ہر ملک میں سیاسی جنگ لڑی جارہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر ملک میں اسلام سیاسی

حکمرانوں کا حریف بنا ہوا ہے۔ اسلام اور حکمرانوں کے تصادم کی وجہ سے وہ موافق امکانات بروئے کار نہیں آرہے ہیں جو زمانہ کی گردش سے اسلام کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام کو اگر سیاسی حریف کے مقام سے ہٹا دیا جائے تو اچانک تمام مصنوعی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ مسلمانوں کی قوتیں مثبت پہلوؤں سے اسلام کی خدمت کرنے میں لگ جائیں گی۔ عصری امکانات اسلام کے حق میں موافق فضا بنانا شروع کر دیں گے اور پھر بہت جلد لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میدان مقابلہ سے واپسی ہی میں پہلے بھی ''فتح مبین'' تھی اور آج بھی اسی میں فتح مبین کا راز چھپا ہوا ہے۔

احیائے اسلام کی طرف

انسانی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ـــــــ دور سائنس سے پہلے ،اوردورسائنس کے بعد۔وہ چیز جس کو ’’دورجدید‘‘ کہتے ہیں، وہ حقیقۃً دورِ سائنس کا دوسرا نام ہے۔ یہ دور ممتاز طور پر سترھویں صدی میں شروع ہوااوردوسری جنگِ عظیم (45-1939) تک اپنے آخری عروج پر پہنچ گیا۔

انسان خارجی طور پر جو عمل کرتا ہے ،اس کے لیے اس کے پاس دوقدرتی ذریعے ہیں: حواس اورطاقت ۔حواس کے ذریعے وہ اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے، اورطاقت کے ذریعے اپنے ارادہ کوان کے اوپر نافذ کر کے ان کو اپنے لیے کارآمد بناتا ہے۔ یہ دونوں عمل قدم ترین زمانے سے جاری ہیں۔پچھلے زمانہ میں اشیاء کو جاننے کے لیے اس کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں تھے یا حیوانی طاقت ،مثلاً اونٹ ،گھوڑے، ہاتھی ،بیل وغیرہ۔تاہم ان ابتدائی قدرتی عطیات کے علاوہ زمین میں بے شمار ایسی چیزیں تھیں جو اس بات کو ممکن بناتی تھیں کہ ان کو حاصل کر کے آدمی اپنے حواس اورطاقت دونوں کی مقدار کو بڑھا سکے۔

اضافہ کا یہ عمل نامعلوم زمانہ سے جاری تھا۔مردہ تہذیبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دوروں میں بھی انسان اس میدان مس بڑی بڑی ترقیات حاصل کرتا رہا ہے۔تاہم ماضی کی تمام ترقیاں ابتدائی فطری حدود کے اندر ہوتی تھیں ۔مثلاً پتھر کی جگہ لوہے کو کام میں لانا یا پہیہ دار گاڑی بنا کر جانوروں کو سواری کے لیے استعمال کرنا۔موجودہ دور کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار طاقت کو ’’مشین‘‘ کی حیثیت دے دی اورفطری حواس کے لیے ایسے میکانکی اورآلاتی معاون دریافت کر لیے جو ہمارے دیکھنے اور تجربہ کرنے کی صلاحیت کو لاکھوں کروروں گنا زیادہ بڑھا سکتے تھے۔

اس دریافت کا براہ راست فائدہ تو صرف یہ تھا کہ انسانی تمدن کے لیے مادی ترقی کا ایک نیا وسیع تر دروازہ کھل گیا۔انسان کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے سفر کی رفتار کو بے اندازہ مقدار بڑھا سکے ۔زمین کے جن وسائل تک روایتی ذرائع سے اس کی دسترس نہیں

ہوسکتی تھی، ان کو حاصل کر کے اپنی بستیوں کو نا قابل قیاس حد تک مزین کر لے۔ تخریب وتعمیر کے لیے، مقدار اور نوعیت دونوں اعتبار سے، اتنے زیادہ سامان فراہم کر لے جس کا خواب بھی پچھلے انسانوں نے نہیں دیکھا تھا۔

تاہم انسانی تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ بالواسطہ اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے انسانی افکار پر بھی اپنے اثرات ڈالنے شروع کئے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک یہ عالم ہو گیا کہ سارے علوم انسانی اس سے متاثر ہو کر رہ گئے ۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، قانون، معاشیات، سیاسیات غرض کوئی ذہنی موضوع ایسا نہ تھا جس نے گہرے طور پر اس سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ فطری طور پر یہ اثر ایک طرفہ تھا۔ فکری علوم سائنس کے اوپر اپنی چھاپ نہ ڈال سکے، وہ صرف سائنس کے عمومی غلبہ کا شکار ہو کر رہ گئے۔

سائنس اپنی ابتدائی شکل میں فکری علوم کی موافق تھی نہ مخالف۔ انسان اگر نظام شمسی کی حرکت کا نقشہ معلوم کر لے، یا آٹو میٹک مشین کے ذریعے کام لینے لگے تو اس میں اخلاق یا انسانی اقدار سے ٹکراؤ کا پہلو کیا ہے۔ تاہم سائنس کے ظہور کے ساتھ چند باتیں ایسی پیش آئیں جنھوں نے سائنس کو فکری علوم، خاص طور پر مذہب واخلاق سے، متصادم کر دیا۔

1۔ مذہب کے ماننے والوں نے سائنس کے ظہور سے پہلے روایتی معلومات کے تحت اپنا ایک فکری نظام بنا رکھا تھا۔ سائنس کی دریافتیں سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو سائنس کی معلوم کردہ دنیا سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اب چونکہ سائنس زیادہ ترقی یافتہ ذرائع معلومات کے حوالے سے کلام کر رہی تھی، قدرتی طور پر سمجھا گیا کہ وہی بات صحیح ہے جو سائنس کی طرف سے آئی ہے۔ اس واقعہ نے مذہب کو لوگوں کی نظر میں بے اعتبار بنا دیا۔ اس میں مزید شدت اس واقعہ سے پیدا ہوئی کہ اہلِ مذہب خصوصًا عیسائی حضرات نے، اپنے روایتی عقائد کے تحفظ کے لیے سائنس کے خلاف نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کے اس ردعمل نے لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ حقیقی ہے، اور جب دلائل کی منطق صریح طور پر سائنس کی طرف ہے تو یقیناً مذہب ایک بے اصل چیز ہے۔ اس کی حقیقت توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

2۔ دوسری غلطی سائنس دانوں یا کم از کم سائنس کے حوالے سے بولنے والوں نے کی۔ عالم طبیعیات میں اپنی فتوحات سے وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ وہ اس حیثیت میں ہیں کہ وسیع تر فلسفیانہ مسائل کے بارے میں رائے زنی کرسکیں۔ حالاں کہ، جیسا کہ بعد کو خود سائنس کی مزید دریافتوں سے معلوم ہوا، عالم طبیعی کے بارے میں ان کے مشاہدات، فلسفہ یا عالمِ افکار کے نازک مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لیے انتہائی ناکافی تھے۔

یہاں ہم اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے دونوں قسموں کی ایک ایک مثال بیاں کریں گے۔

زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹارکس (Aristarchus) کا نظریہ جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

عیسائیوں کے درمیان ارسطو کا نظریہ بہت مقبول ہوا۔ کیونکہ مرکزیت زمین کے نظریہ (Geocentric Theory) میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی اور چونکہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہو گیا کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز بن سکتا ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مرکزیت زمین کے نظریہ کو انھوں نے اپنے علم کلام مس داخل کرلیا۔ کوپرنیکس (1543۔1473) نے جب مرکزیت آفتاب کا نظریہ (Helliocentric Theory) پیش کیا تو یورپ میں عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے لیے کوپرنیکس کے خلاف عدالتی سزا کا حکم جاری کر دیا۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (Satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ مسئلہ روایتی عیسائیت کا تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں متلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھنے لگیں۔ انھوں نے مرکزیتِ

آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پاکر اسے قبول کرلیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے:

''ارسطو کے احترام کے باوجود عرب کائنات کے بارے میں ارسطو کے نظریہ پر تنقید کرنے میں نہیں ہچکچائے، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین آسمانی اجرام کا مرکز ہے اور تمام اجرام اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے برعکس عربوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔''

Edward McNall Burns Western Civilizations, p. 246

سائنس دانوں کی غلطی کی ایک مثال اصول تعلیل (Causation) میں ملتی ہے۔ اشیاء کے مشاہدہ سے جب حقیقت ان کے سامنے آئی کہ واقعات کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہوتا ہے، مثال کے طور پر اجرام سماوی کی گردش کے پیچھے جذب و کشش کا قانون یا قوس قزح کے پیچھے بارش کے قطرات سے سورج کی شعاعوں کا گزرنا، تو انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کو اس سوال کا جواب مل گیا ہے جس کے لیے فلسفہ ہزاروں سال سے ''علت کائنات'' کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حالاں کہ علت کائنات کا مسئلہ نہایت گہرے سوالات سے جڑا ہوا تھا اور سائنس دانوں کا طبعی مشاہدہ کسی بھی درجہ میں اس قابل نہ تھا کہ اُس کو اِس نازک اور گہرے سوال کے جواب کے لیے استعمال کیا جائے۔ تاہم انھوں نے استعمال کیا۔ حتّٰی کہ اس کو خالق کے انکار کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ لیا۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں خود سائنس نے ایسے حقائق دریافت کئے جس کے بعد الحاد کی یہ بنیاد ہمیشہ کے لیے منہدم ہوگئی۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ فکری پس منظر جس میں جدید تاریخ کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو مذہب اور سائنس کا تصادم کہا جاتا ہے۔

سائنس نے جدید دور کے ہر پہلو پر اتنی شدت اور وسعت کے ساتھ اثر ڈالا کہ علم کے تمام شعبوں اور فکر کے تمام گوشوں پر اس کی چھاپ پڑگئی۔ جس قدیم روایتی ڈھانچہ میں لوگوں نے اسلام کو پایا تھا، وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور نیا فکری ڈھانچہ جو سائنس کے زیر اثر بنا، اس کے تحت اسلامی افکار کی تشکیل نو نہ کی جاسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسل کی نسل تذبذب

اور انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں ایسے لوگ معدوم ہو گئے جو اسلام کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ ایسے لوگ تھے اور کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ مگر انھوں نے اسلام کو روایتی سطح پر پایا تھا، شعور کی سطح پر نہیں پایا تھا۔ اس کمی کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ لوگ ایمان کی اس اعلیٰ فکری سطح کو نہ پہنچ سکے جہاں آدمی گردوپیش کے تمام واقعات کو اس طرح اپنے شعورِ حق کا جزو بنالیتا ہے کہ ہر طرف اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا اجتماعی نقصان یہ ہوا کہ اس دور میں مسلمانوں کے جو مذہبی رہنما اٹھے، وہ خود بھی چونکہ ایسے تھے جنھوں نے فکر حاضر میں اپنے دین کو نہیں پایا تھا، بلکہ ماضی کے روایتی ڈھانچہ میں پایا تھا، اس لیے وہ دور جدید کے مطابق اسلامی مہم کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ انتہائی اخلاص مگر انتہائی نادانی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو ایسی راہوں میں دوڑاتے رہے جن کی ساری قیمت ماضی کے نقشہ میں تھی، عہد حاضر کے نقشہ میں وہ اپنی قیمت کھو چکے تھے۔ وہ تاریخ ماضی میں حال کا ڈراما کھیلتے رہے۔ اس کا نتیجہ صرف ایک دردناک شکست تھا۔ چنانچہ ہر محاذ پر شکست ہوئی اور شکست نے بالآخر مایوسی اور جھنجلاہٹ اور بے حوصلگی کا شدید تحفہ دے کر پوری قوم کی قوم کو موت کے کنارے پہنچا دیا۔

شعوری سطح پر دین کو پانے کا مطلب وقت کے افکار کے مقابلے میں دین کو پانا ہے۔ معرکہ بدر (624ء) کے مجاہدین نے اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّة (انفال۔ 60) کی تفسیر ''تلوار'' میں پائی تھی۔ مگر شاملی (1857) کے مسلمان بھی اگر آیت کی تفسیر یہی پائیں تو کہا جائے گا کہ انھوں نے قرآن کو عہد حاضر کی نسبت سے نہیں پایا۔ آج اس آیت کی تفسیر تلوار کی شکل میں پانا، قرآن کو گزرے ہوئے ماضی کے نقشہ میں پانا ہے۔ جب کہ تجدید کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو وقت کے نقشہ میں پایا جائے۔ خیالات کے اظہار کے لیے شعر و خطابت کی زبان استعمال کرنا' احیائے اسلام کی تحریکوں کا سیاسی رخ اختیار کرنا، وعظ خوانی اور فتوے کو اصلاح امت کے لیے کافی سمجھنا' سب اسی کے مظاہر ہیں۔ دور جدید میں ہمارے جو مصلحین اٹھے انھوں نے اگر فکر حاضر میں اپنے اسلامی شعور کو پایا ہوتا تو وہ جانتے کہ آج کے وہ کون سے افکار و عوامل ہیں جو اجتماعیات میں فیصلہ کن بن گئے ہیں اور ان کے

مقابلہ میں احیائے اسلام کی منصوبہ بندی کس طرح ہونی چاہئے۔ان کے پاس صرف روایتی عقیدہ کا سرمایہ تھا۔بس اسی کو لیے ہوئے وہ وقت کے سمندر میں کود پڑے۔بدلے ہوئے زمانے میں اس قسم کا جوش ایمان انھیں کہیں نہیں پہنچا سکتا تھا اور نہ اس نے کہیں پہنچایا۔

انیسویں صدی میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ اس جدید ڈھانچہ میں اپنی جگہ نہیں پا رہا ہے جو سائنس کے زیر اثر بنا ہے،اس وقت ضرورت تھی کہ گہرائی کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لے کر نیا فکری ڈھانچہ تیار کیا جائے جس میں اسلام دوبارہ اپنی جگہ پا سکے۔اگر بروقت یہ کام ہو جاتا تو سائنس یا دور جدید نہ صرف یہ کہ مذہب کے حریف نہ بنتے بلکہ اس کو تقویت دے کر اس کو نئی زندگی عطا کرنے والے بن جاتے۔مگر ایسا نہ ہو سکا۔عیسائیت نے سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد ماڈرنزم کی شکل میں سائنس سے سمجھوتہ کر لیا۔مسلمان دین حق کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھے کہ تاریخ جدید کے اس اہم کردار کو ادا کر سکیں،جس طرح انھوں نے نویں صدی عیسوی میں بغداد اور قرطبہ میں وقت کی سائنس اور فلسفہ کے مقابلہ میں اسی قسم کے کردار کو ادا کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ وقت تھا جب کہ مسلمان قومیں زوال کا شکار ہو چکی تھیں۔ان کے اندر نہ حوصلہ تھا نہ فکری بلندی۔مزید یہ کہ جدید اقتصادیات میں اپنی محرومی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اس قسم کے کسی مؤثر کام کی قیمت ادا کر سکیں۔اپنی پسماندگی کی وجہ سے مسلمان اس کا ثبوت بھی نہ دے سکے کہ وہ وقت کے اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے اور زندگی کے جدید نقشہ میں مذہب کو اس کا مقام عطا کرتے۔

موجودہ حالات نے ہمارے لیے جو مسائل پیدا کئے ہیں،وہ دو قسم کے ہیں: نظری اور عملی۔

پہلے جزو کے سلسلہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلال انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو ''آج کی چیز'' معلوم ہونے لگیں۔نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا۔

جدید انداز سے مراد یہ ہے کہ اسلوب تحریر اور مواد استدلال دونوں اعتبار سے وہ جدید علمی معیار کے مطابق ہو۔ موجودہ زمانے میں اسلوب تحریر مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ قدیم روایتی اسلوب میں خطیبانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ اب سائنسی اور تجزیاتی انداز کو پسند کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبارت کے درمیان اشعار نقل کر دینا۔ زور الفاظ کا مظاہرہ کرنا یا مسجع فقرے لکھنا، نفس مضمون کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں معیوب قرار پا چکی ہیں۔ قدیم تصور ادب میں تیر و نشتر قسم کے جملے، مخاطب کے اوپر تیز تیز ریمارک، جذباتی قسم کی عبارتیں انتہائی پسندیدہ ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام چیزیں علمی وقار کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم ذوق کے مطابق مبالغہ آمیز الفاظ، رنگین ترکیبیں اور استعارے اور تشبیہات ادب کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ مگر اب کوئی تعلیم یافتہ آدمی اس قسم کے مضمون کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

یہی حال مواد کا ہے۔ پہلے زمانے میں یہ بات بھی کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ آدمی اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ایک مثال پیش کر دے یا ایک حکایت بیان کر دے۔ مگر اب اس کو غیر معتبر سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی چیزوں سے اپنی بات ثابت کرنے لگے۔ پہلے زمانے میں کسی حوالے کے لیے اعدادی قطعیت یا واقعاتی تعیّن ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر جدید ذوق کے لیے وہ کلام بے معنی ہے جس میں تعیناتی زبان استعمال نہ کی گئی ہو۔ قدیم طریقے میں استدلال کی بنیاد تمام تر قیاسی منطق ہوا کرتی تھی۔ مگر اب قیاسی منطق بے قیمت ہوگئی ہے۔ اب تاریخی، مشاہداتی اور تجزیاتی انداز میں بات کو ثابت کرنے کا نام ثابت کرنا ہے۔ قدیم انداز میں آدمی مناظر اور مبلغ بن کر ایک وکیل کی طرح بالکل برہنہ انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی طرف سے بولتا تھا۔ اب غیر شخصی جائزے کو معیاری انداز سمجھا جاتا ہے۔

پچھلے سو برس میں ہمارے یہاں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں بجائے خود قیمتی ہیں۔ مگر دور جدید کے اعتبار سے ان کی افادیت محض جزوی ہے۔ کیونکہ وہ بیشتر خطیبانہ نثر کا نمونہ ہیں۔ سائنسی طرز استدلال پر تحریری کام ابھی تک ہمارے یہاں تقریباً صفر کے درجے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو سمجھنے

کے لیے بھی مستشرقین کی کتابیں پڑھتے ہیں جو،خواہ ہمارے نزدیک غلط ہوں تاہم وہ اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے جدید معیار کی حامل ہوتی ہیں۔مسلم مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں ان کو اپیل نہیں کرتیں۔

عملی مسائل کی فہرست ،جن کے حل کے لیے وقت کے نظام اجتماعی میں تغیر ضروری ہے، بہت طویل ہے۔وقت کا اجتماعی نظام ،قومی اور بین الاقوامی دونوں اعتبار سے،سراسر غیر خدائی بنیاد پر قائم ہے۔اس کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے دین کے اجتماعی قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔مگر یہاں اسلام نے جو راہِ عمل تجویز کی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ایک انقلاب پسند لیڈر عام طور پر اختیار کرتا ہے۔

اس کا حل موجودہ زمانے کی اسلامی جماعتوں نے یہ نکالا ہے کہ نظام حاضر سے ٹکرا جائیں۔ان کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی ایمان اگر ہمیں حاصل نہیں تو اس کے حصول کی خاطر موت تو ہمارے بس میں ہے۔پھر کیوں نہ ہم ''بے ایمان'' زندگی کے مقابلہ میں ''ایمان دار'' موت کو ترجیح دیں۔

یہ خطرناک غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ اس دور میں اٹھنے والے مصلحین امت اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے کہ اجتماعی اسلامی کے لیے جدوجہد کا مقامِ آغاز اجتماعی اسلام نہیں،دعوت ہے۔ہمارے کام کا آغاز اسلامی نظام کے قیام کے لیے براہ راست اقدام سے نہیں ہوگا بلکہ اساسات اسلام کی طرف دعوت سے ہوگا۔مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی جدوجہد کا حکم دیا گیا تو یہ نہیں کہا گیا کہ مکّہ کی پارلیمنٹ (دار الندوہ) میں نمائندگی حاصل کرنے کا مطالبہ کرو یا کعبہ کی تولیت پر قبضہ کرنے کوشش کرو۔بلکہ توحید اور مواساۃ بنی آدم سے متعلق سادہ تعلیمات بھیجی گئیں اور حکم ہوا کہ لوگوں میں ان کی تبلیغ کرو۔اس سے آگے کی چیزیں جن کے حصول کے لیے اجتماعی انقلاب ضروری ہے، ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ انھیں چھیڑنے کے بجائے ان کو برداشت کرو اور اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ حالات میں ایسا تغیر فرمائے جب کہ بقیہ مسائل کے حل کی راہ نکل سکے۔(یونس۔آخر) اس معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ ممکن دائرہ میں دین پر عمل کرتے ہوئے دعوتی جدوجہد شروع کردو،اور بقیہ

تمام امور کو متوقع نصرت الٰہی کے خانہ میں ڈال دو۔ یہ مطلب ہے کہ حکم دعوت کے بعد یہ کہنے کا کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (مدثر) اساسات دین کی طرف پرامن دعوت اور غیر اسلامی تسلط کی وجہ سے جو مشکلات و مسائل پیش آئیں، ان پر صبر، یہی تمام انبیاء کا طریقہ رہا ہے اور آج بھی ان لوگوں کا طریقہ ہونا چاہئے جو مخالف ماحول میں اسلام کے احیاء کے لیے اٹھیں۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کا جو مسئلہ ہے وہ کوئی سادہ سا مسئلہ نہیں، یہ وقت کے غالب نظام فکر میں تبدیلی کا مسئلہ ہے۔ نظام فکر میں تبدیلی سے پہلے جو کوشش بھی کی جائے گی وہ غیر موثر ثابت ہوگی، جیسا کہ اب تک ہوتی رہی ہے۔

نظام فکر میں تبدیلی کے لیے جہاں تک موافق حالات کا تعلق ہے، ہماری کوشش کے بغیر اللہ نے اس کو بلند تر سطح پر انجام دے دیا ہے۔ تاہم وہ ابھی تک غیر استعمال شدہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مہم کے لیے ابھی تک قابل کار افراد نہ مل سکے۔ اسلام کے نام پر سرگرمیاں دکھانے والوں کی موجودہ زمانہ میں کمی نہیں۔ مگر بدقسمتی سے اسلام کے محاذ پر موجودہ زمانہ میں صرف ایسے لوگوں کا غول جمع ہوا ہے جو لایعنی ہنگاموں کو کام سمجھتا ہے۔ اللہ نے آج یہ امکان کھول دیا ہے کہ ریگستانوں کو لہلہاتے ہوئے باغوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ مگر اس کا فائدہ صرف انھیں لوگوں کے حصہ میں آ سکتا ہے جو اس کے لیے حقیقی جدوجہد کریں۔ نعروں اور تقریروں کا کمال دکھانے والے لوگ کبھی اس امکان کو اپنے حق میں واقعہ نہیں بنا سکتے۔

طبرانی نے عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه و سلم اللّٰهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بابی جهل بن هشام فجعل الله دعوة رسوله صلى الله عليه وسلم لعمر بن الخطاب ۔ فبنى عليه الاسلام وهدم به الاوثان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: خدایا اسلام کو قوت دے عمر بن خطاب سے یا ابوجہل بن ہشام سے۔ اللہ نے عمر بن خطاب کے حق میں اپنے رسول کی دعا قبول کی۔ وہ اسلام لائے۔ ان کے ذریعہ سے اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں اور بت پرستی کی دیواریں

منہدم ہوگئیں۔

پیغمبرؐ کی اس دعا سے تحریک کے لیے افراد کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ عمر فاروقؓ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نہات اعلیٰ درجہ کے انسان تھے، اسی لیے وہ اسلام کے اعلیٰ درجہ کے سپاہ بن سکے (خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذافقھوا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بابت فرمایا تھا:

لم ار عبقریا یفری فریہ (العبقر یات 3640) میں نے عمر جیسا کوئی عبقری نہیں دیکھا جو اتنا حیرت ناک کام کر سکے۔

اونچی استعداد کے لوگوں سے ہی اونچے کام کی امید کی جاسکتی ہے۔ پست فطرت لوگ نہ اسلام کے کسی کام کے ہیں اور نہ غیر اسلام کے۔

انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہمیشہ تین درجے پر ہوتے ہیں ـــــ مقام معرفت، مقام اعتراف، مقام جدال۔ مقام معرفت پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس حد تک خالص بنائے کہ اس کا شعور ربانی شعور سے مل جائے۔ وہ حقائق کو اس ابدی سطح سے دیکھنے لگے جہاں سے خدا ان کو دیکھ رہا ہے۔ مقام اعتراف یہ ہے کہ آدمی اپنے حقیقی ارادہ اور عمل کے اعتبار سے تو مقام اول ہی کا مسافر ہو۔ تاہم اس کا شعور کبھی حقیقت کی گرفت میں غلطی کر جائے۔ ایسا آدمی چونکہ ارادۃً مقام معرفت ہی پر ہوتا ہے، اس لیے ناطق یا غیر ناطق شکل میں جب اس کے سامنے حق کی جھلک آتی ہے تو وہ فی الفور اس کو پالیتا ہے۔ کسی تاخیر کے بغیر وہ اس کے ذہن کا جزء بن جاتی ہے۔ مقام جدال یہ ہے کہ آدمی اندھا اور بہرا بنا ہوا ہو۔ اس کو نہ تو خود حقائق کا شعور ہو اور نہ کوئی روشنی اس کو راہ دکھانے والی ثابت ہو۔ ایسے لوگ لایعنی بحث مباحثوں میں مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

یہاں ہم ایک واقعہ نقل کریں گے جو مندرجہ بالا تینوں مقامات کو بہت خوبی سے واضح کر رہا ہے۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عمر بن

الخطابؓ اٹھے۔انھوں نے کہا منافقین میں سے کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی۔خدا کی قسم رسول اللہ کی موت نہیں ہوئی۔ بلکہ آپؐ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جس طرح موسیٰ بن عمرانؑ گئے تھے۔وہ چالیس دن قوم سے دور رہے۔ پھر واپس آئے۔ جب کہ قوم کہنے لگی تھی کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔خدا کی قسم رسول اللہ اسی طرح واپس آئیں گے جس طرح موسیٰؑ واپس آئے۔اور پھر ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے جو گمان کررہے ہیں کہ آپؐ کی موت ہوگئی ہے (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ 155)

عمر فاروقؓ مدینہ کی مسجد میں یہ تقریر کررہے تھے کہ ابوبکر صدیقؓ آگئے۔انھوں نے عمر فاروقؓ کو روکنا چاہا مگر وہ اس وقت اتنے جوش میں تھے کہ نہ رکے۔ابوبکر صدیقؓ مسجد کے صحن میں دوسری طرف کھڑے ہوگئے۔انھوں نے تقریر کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران آیت 144)

اور محمدؐ تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوجائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔اور جو کوئی الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ابوبکر صدیقؓ نے یہ آت پڑھی تو ایسا لگا جیسے لوگوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ قرآن میں یہ آیت بھی ہے۔عمر فاروقؓ کا اس کے بعد جو حال ہوا وہ خود ان کے الفاظ میں یہ تھا:

فو اللہ ماھو الاان سمعت ابابکر تلاھا فعُقِرتُ حتّیٰ وقعتُ الی الارض وما تحملنی رجلای وعرفت ان رسول اللہ قدمات (صفحہ 156)

خدا کی قسم جب میں نے ابوبکر کو آیت پڑھتے ہوئے سنا تو میں دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔میرے دونوں پیروں نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار

کر دیا۔ میں نے جان لیا کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی۔

ابوبکر صدیق ؓ مندرجہ بالا تقسیم کے اعتبار سے مقام اول پر تھے۔ اس لیے ان کو حقیقت کے عرفان میں ایک لمحہ کی دیر نہیں لگی۔ انھوں نے معاملہ کو اس نظر سے دیکھ لیا جو زمان ومکان سے ماورا ہوتی ہے اور واقعات کو ان کی بے آمیزش شکل میں دیکھتی ہے۔ عمر فاروق ؓ دوسرے مقام پر تھے۔ وقتی طور پر اگرچہ ان کو ذہول ہوا۔ مگر ایک آیت قرآنی کے سامنے آتے ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہی شخص جو چند لمحہ پہلے تک کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا، اچانک اس طرح ڈھ گیا جیسے خود خدا اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ گیا ہو۔ اس کے بعد تیسرے گروہ کو بھی اسی آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسی ''حیات رسول'' کے مسئلہ پر آج تک لایعنی بحثیں چھیڑے ہوئے ہیں۔ قرآن وحدیث کا کوئی بھی حوالہ ان کے ذخیرۂ الفاظ کو ختم کرنے والا ثابت نہ ہو سکا۔

اسلام کے بھرے ہوئے پنڈال میں آج تیسری قسم کے لوگوں کی کمی نہیں۔ مگر اسلامی خدمت کا کیمپ ابھی تک پہلی اور دوسری قسم کے لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔ اسلام کے لیے کسی نئے مستقبل کا انحصار تمام تر اس پر ہے کہ ایسے لوگ اس کو حاصل ہوتے ہیں یا نہیں۔ جب تک موجودہ صورت حال باقی ہے، صرف قائدین کے شان دار مقبرے تعمیر ہوتے رہیں گے، اسلام کا شاندار محل، اپنے تمام امکانات کے باوجود، کبھی کھڑا نہیں ہوسکتا۔ قریبی ماضی کی تاریخ اس کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

حرفِ آخر

پوٹاشیم سائنائڈ (Potassium Cyanide) ایک سفید چمک دار کیمیکل ہے۔ وہ مختلف صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر چہ سوڈیم سائنائڈ کی دریافت نے اس کی صنعتی استعمال کم کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ پوٹاشیم سائنائڈ ایک انتہائی طاقت ور زہر ہے۔ اس کا کھانا فی الفور موت کا باعث ہو جاتا ہے۔

سائنس دانوں کو خیال ہوا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا مزا کیا ہے۔ مزہ معلوم ہونے کے لیے اس کو کھانا ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر کوئی شخص اپنے کو ہلاک کر کے ہی دوسروں کو خبر دے سکتا تھا کہ اس کا مزہ کیا ہے۔

ایک شخص نے طے کیا کہ وہ اس خدمت کو انجام دے گا۔ اس نے ایک ہاتھ میں پوٹاشیم سائنائڈ لیا اور دوسرے ہاتھ میں قلم، زہر کو کھانے کے بعد اس کا مزا لکھنا چاہا۔ اس نے صرف ایک لفظ ایک (S) لکھا تھا کہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی میں ایس کے حرف سے دو لفظ بنتے ہیں۔ ایک سویٹ (میٹھا) دوسرا سالٹ (نمکین)۔ دوبارہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے والے کی مراد میٹھے سے تھی یا نمکین سے۔

اب ایک اور شخص اٹھا۔ اس نے کہا کہ میں زہر کو کھاؤں گا اور ''ایس'' کو چھوڑ کر اگلا حرف لکھوں گا۔ اگر ڈبلیو (W) لکھوں تو سویٹ سمجھنا اور اگر اے (A) لکھوں تو سالٹ۔ اس نے دوسری بار زہر کو چکھ کر قلم کو حرکت دی۔ حرف ''اے'' لکھ کر اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح دنیا نے جانا کہ پوٹاشیم سائنائڈ کا مزہ نمکین ہے۔

اس قصہ کو یہاں نقل کرنے کا مقصد ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ میرا لڑکا ظفر الاسلام خاں (پیدائش 1948) جو اس وقت لیبیا میں ہے، اس نے مجھے خط لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ لیبیا کا کام چھوڑ کر ہندستان واپس آجاؤں اور ماہنامہ الرسالہ اور الدار العلمیہ کے تحت آپ احیائے اسلام کی جو کوشش کر رہے ہیں، اس میں آپ کی مدد کروں۔ میں نے جواب میں مذکورہ بالا قصہ کا حوالہ دیتے ہوئے ظفر الاسلام کو لکھا:

تمھارے باپ نے ایک بار ''پوٹاشیم سائنائڈ'' کھا کر ''ایس'' لکھا ہے۔ اگر تم دوسری بار اس کو کھا کر اگلا حرف ''اے'' لکھنے والے بننا چاہتے ہو تو آ جاؤ____''

اسلام کا احیاء موجودہ زمانہ میں کچھ زندگیوں کی قیمت مانگتا ہے۔ جانوں کی نہیں، حوصلوں اور تمناؤں کی۔ ''ظہور اسلام'' اس امید میں شائع کی جا رہی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو اس قربانی کے لیے آمادہ کرے گی۔ اگرچہ اس قسم کی امید قائم کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ حوصلوں اور تمناؤں کی قربانی جانوں کی قربانی کے برعکس، ہمیشہ کمیاب تھی اور اب تو شاید وہ نایاب کے درجہ میں پہنچ چکی ہے۔

وحید الدین

19 جنوری 1978